قرآنی دعوت انقلاب

مؤلفہ

مولانا محمد علی - ایم - اے (کینٹ)

جملہ حقوق بحق مولف محفوظ

قرآنی دعوتِ انقلاب

(حصہ اول)

یعنی

قرآنِ حکیم کی بعض ایسی اہم سورتوں کی جدید انداز میں
تشریح جن میں مسلمانوں کا ماضی اور مستقبل پنہاں ہے

مؤلفہ

(مولانا) محمد علی - ایم - اے (کینٹب)

ملنے کا پتہ :- بیگم زاہدہ محمد عمر
نمبر ۲۱۶ سی - پی اینڈ برار سوسائٹی، بلاک ۷/۸
کراچی نمبر ۵ - فون نمبر: ۴۲۱۸۹۰

زیرِ اہتمام
مکتبۂ الثوبیہ ناشران کتبِ اسلامی کراچی ۷۴۲۰۰
طبع ہوئی

عنوان

۲۹۷۸۰۸۰ ۵۳۲۵ ۷۱۰۳۴

۱ -	اقسامِ قرآن	۱۲
۲ -	خُسر کی تعریف	۱۸
۳ -	خسر کی ہمہ گیری	۲۵
۴ -	فکری خُسر	۳۰
۵ -	مختلف مذاہب نے جو علاج تجویز کیے وہ ناکام رہے۔	۳۲
۶ -	فلاسفہ کی ناکامی	۳۵
۷ -	قرآن کا نسخۂ کیمیا	۴۲
۸ -	دنیا کی سیادت صرف مُسلمانوں کا حق ہے۔	۵۰
۹ -	ایمان کی تشریح	۵۴
۱۰ -	موجودہ مسلمانوں کے ایمان کی حقیقت	۶۴
۱۱ -	دنیا کے مصائب کا واحد عِلاج	۶۶
۱۲ -	عملِ صالح کی حقیقت	۶۹
۱۳ -	ہم مجسّم رحم و انصاف کیونکر بن سکتے ہیں؟	۷۷
۱۴ -	امر بالمعروف و نہی عن المنکر	۸۳
۱۵ -	روحِ جہاد میں قوموں کی بقا کا راز مضمر ہے	۸۹
۱۶ -	امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بغیر تمام نیکیاں اکارت جاتی ہیں	۹۶
۱۷ -	تواصی بالصبر کی حقیقت	۱۰۳
۱۸ -	موجودہ مسلمانوں کی صبر سے دُوری	۱۰۹
۱۹ -	خلاصۂ مطالب	۱۱۲

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قرآن مجید زندگی کا مکمل دستور العمل ہے۔ جب تک مسلمانوں کی زندگی اس کے زرین اصولوں کے سانچے میں ڈھلی رہی وہ دنیا بھر کے لیے جلال و جمال کے مجسم نمونے بنے رہے۔ اور جہاں گئے فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی رہی۔ اس کی تعلیم نے مٹھی بھر انسانوں میں وہ روح پیدا کی کہ وہ ہزاروں پر بھاری ثابت ہوئے اور آج بھی دنیا کے سامنے جب یہ حقیقت آتی ہے کہ کس طرح بے سروسامانی نے اسباب و ذرائع کی فراوانی پر غلبہ حاصل کیا، تو وہ حیران رہ جاتی ہے اور اس میں فوق البشریت کی کارفرمائی کو ڈھونڈنے لگتی ہے۔ پھر ان لوگوں کی زندگی کا وہ نقشہ جسے دیکھ کر دشمن بھی ان کی صداقت و عظمت کے اعتراف پر مجبور ہو جاتے، اعجاز و کمال کا وہ نمونہ ہے جس کی تاریخ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

مگر افسوس کہ مسلمانوں نے آہستہ آہستہ قرآن کی تعلیم کو بھلا دیا اور مغرب کے جدید نظریات اور ترقی و ترفہ کی ظاہری چمک دمک سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قرآنی تعلیم کے محیر العقول انقلاب آفرینی اور حیات بخشی کا اعتراف و اقرار ان کے لیے ایک غلط بات ماننے کے مترادف ہو گیا۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلامی تعلیم کا مقتضائے حالات سے عدم تطابق ثابت کرنے میں دشمنان اسلام کی دانستہ یا نادانستہ ہم نوائی شروع کر دی۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے قرآن کی سادہ اور جامع تعلیم کا مطالعہ ہی نہیں کیا اور ان کا مبلغ علم یا تو سنی سنائی باتیں ہیں یا ان کی معلومات کا ماخذ ان مصنفین کا لٹریچر ہے جن کی تعصبانہ ذہنیت نے اسلام کے روشن چہرے پر ایسا پردہ ڈالنے کی کوشش کی کہ اس کے خد و خال سامنے آ ہی نہ سکیں۔ لیکن زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرآنی تعلیم کے ساتھ

حسنِ عقیدت ہے اور جو اس کے رموز و غوامض سے واقفیت کے مدعی ہیں۔ انھوں نے بھی اس کے حقائق کے معارف تک پہنچنے کا وہ طریق کم اختیار کیا جو اس سے صحیح طور پر استفادہ کے لیے ضروری تھا اور وہ اس مخزنِ حکمت سے وہ چیز تلاش کر کے مہیا نہ کر سکے جس کی دنیا کو ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم چشمۂ حیات کے مالک ہوتے ہوئے پانی کے دو گھونٹ نہ دے سکے، کہ دنیا کی تشنہ لبی کو وجہ ہلاکت بننے سے روک سکتے۔

من جواں ساقی و تو پیرِ کہن مے کدہٗ
بزمِ ما تشنہ و صہبا نہ تو داری و نہ من

قرآن مجید سفرِ حیات میں انسان کی پوری پوری رہنمائی کرتا ہے۔ اس بات کے سمجھنے میں دو طرح کی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ پرانے مفسرین اس کے احکام کی افادی حیثیت کو اُجاگر کرنے کی بجائے زیادہ فلسفیانہ موشگافیوں کی راہ اختیار کر کے دور از کار گوشوں میں نکل گئے۔ یا بعضوں نے شانِ نزول، قصص و حکایات اور روایات کی چھان بین میں اس طرح زورِ قلم صرف کیا کہ نزولِ قرآن کا اصل مقصد یعنی زندگی کے صحیح لائحۂ عمل کی شرح بہت حد تک نظر انداز ہوگئی اور زندگی کے مختلف شعبوں کی ضروریات و مقتضیات پر اس کے احکام کو منطبق کرنے کی بہت کم کوشش کی یہی چیز مسلمانوں کے زوالِ نعمت و جاہ کا سبب بنی۔

نکتۂ عشق فروشست ز دلِ پیرِ حرم
در جہاں خوار بہ اندازۂ تقصیر ستدم

مجھے یاد ہے کچھ عرصہ ہوا، ایک مقامی انجمن نے پیغامِ حق کو ان لوگوں تک پہنچانے کا انتظام کیا جنھیں علماء کی زبانی اسے سننے کے بہت کم مواقع حاصل ہوتے ہیں یعنی ان کی کوٹھیوں میں جا کر بعض اہم اسلامی موضوعات پر جید علما کی تقاریر کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک دفعہ غالباً حقوقِ نسواں کے متعلق تقریر تھی۔ اسے سننے کے بعد

بعض انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلامی تعلیم کی جامعیت کے بعض پہلوؤں پر اظہار تعجب کرتے ہوئے دیکھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے سامنے بالکل نئی چیز پیش کردی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کا صحیح رنگ میں مطالعہ کا موقع ہی نہیں ملا اور اکثر لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ قرآن میں صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جنت، دوزخ کے ثواب وعذاب کا ذکر ہے۔ اس لیے وہ اس وسعت کا اندازہ ہی نہیں کرسکتے جو قرآن کے نپے تُلے الفاظ اور اس کے احکام کی جامعیت میں سمٹی ہوئی ہے۔

دوسری طرف تفسیریں لکھنے والے وہ لوگ پیدا ہوئے جو دینی تعلیم سے زیادہ مغربی علوم وفنون اور یورپ کے جدید نظریات ورجحانات سے متاثر ہوچکے ہیں۔ انھوں نے تفسیر کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ آزادہ روی اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تعلیم کی اصل روح سے عام بے خبری پیدا ہوگئی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کی تعلیم ... دنیا تک تمام ضروریات وحالات پر حاوی ہے اور آخری پیغمبر کی آخری تعلیم کی یہی خصوصیت ہونی چاہیے۔ لیکن آزاد خیال لوگوں کی نظر صرف اسی حقیقت پر رہی کہ وہ یہ نہ سوچ سکے کہ وقتی ضروریات و جدید رجحانات کہاں تک شرف واقبال انسانیت کے لیے مفید ہیں۔ اس لیے اپنی زندگی کو قرآنی شمع ہدایت کی روشنی میں گزارنے کے بجائے قرآنی احکام کو کھینچ گھسیٹ کر اپنے ہر قسم کے احوال وظروف کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔

یہ دونوں راہیں صحیح نہیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مشکلات زندگی کا صحیح حل قرآن مجید سے پیش کیا جائے۔ موجودہ پرآشوب زمانے میں راحت اور اطمینان کے سرچشمے کا پتہ دیا جائے۔ دنیا جن مصائب سے دوچار ہے ان کا صحیح علاج بتایا جائے۔ اور بھولے بھٹکوں کو وہ راہ عمل دکھائی جائے جس پر چل کر منزل نجات تک رسائی میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ فاضل مصنف مولانا محمد علی نے یہ کتاب اسی حقیقت کے پیش نظر لکھی ہے اور اس میں اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو قرآن مجید کا ہر حصہ دعوت عمل ہے لیکن مؤلف نے تنبیہ کیلئے

ان سورتوں کا انتخاب کیا ہے، جو خصوصیت کے ساتھ اس دعوت کی حامل ہیں۔ اور ان میں وہ پیغام ہے جس کی، عروج و اقبال کے حصول کے لیے ہر زمانے میں ضرورت ہے اور موجودہ دور کی بے اطمینانی اور اضطراب میں بالکل صحیح راہِ عمل کی طرف دعوت دینے والا ہے۔ جن سورتوں کا مؤلف نے انتخاب کیا ہے وہ قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔ لیکن ان چھوٹی سورتوں میں زندگی کے وہ حقائق موجود ہیں جو بڑی سے بڑی تقریروں اور تحریروں میں نہیں سما سکتے۔ ان قلیل الفاظ میں معانی کی وہ وسعتیں سمٹی ہوتی ہیں جن کا نمونہ اس تالیف میں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور قرآن مجید کی تعلیم و پیغام کی جامعیت کا بے ساختہ احساس ہونے لگتا ہے۔ پھر اس تالیف کا طرزِ بیان اس قدر سلجھا اور مربوط ہے کہ اسے قرآنی الفاظ کی بے تکلف شرح اور اس کے مطالب کی صحیح تفسیر قرار دینے کا قاری کے دل میں قدرتی میلان پیدا ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مولف کے اشہبِ قلم کی باگ معانی و مطالب کی جس وادی کی طرف مڑ گئی ہے۔ وہی وہ مقصود و منشا ہے جس کا قاری متمنی و متلاشی ہے۔ اور ہر وادی میں قدم رکھتے ہوئے یہ کیفیت ہوتی ہے ع۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

اِس تفسیر کی یہ نمایاں خصوصیت تو ہے ہی کہ مطالب و معانی اپنی اپنی جگہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور تقاضائے وقت کی کیفیتِ اضطراب کے لیے سکون و اطمینان کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی آپ نے ان سورتوں کا جو باہمی ربط بیان کیا ہے اور جس سے تسلسل بیان کا قدرتی لطف حاصل ہوتا ہے۔ تفسیر کی افادی حیثیت میں ایک ضروری اور قابلِ قدر اضافے کا موجب ہے۔ اس کے علاوہ لغوی مباحث اور شانِ نزول کے لحاظ سے بھی تفسیر کو تشنۂ تکمیل نہیں رہنے دیا۔

بہر حال یہ چند اہم سورتوں کی تفسیر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مطالعہ سے معلوم ہے کہ اس کی ایک ایک سطر دعوتِ تدبّر ہے اور اس کے اندازِ بیان میں وہ ساری خوبیاں

Marfat.com

جلوہ گر ہیں جو قرآنی مطالب کو مسلمانوں کے حال اور مستقبل کا صحیح جواب ثابت کرسکتی ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ مسلمان قرآنی تعلیم کو اس رنگ میں سمجھیں جس سے ان کی نجات دارین وابستہ ہے۔ اور جس سے وہ اقوامِ عالم میں سرفراز و عالی مقام بن کر ایک قابلِ رشک نمونے کے طور پر پیش ہو سکتے ہیں۔

قرآن میں سب کچھ موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ آج اس کے "سب کچھ" کو صحیح رنگ میں پیش کرنے والا کوئی نہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو اس کی صدا جدید تہذیب و تمدن کے نقار خانے میں طوطی کی سی ہو کر رہ جاتی ہے اور اسے اس لیے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا کہ مدت سے اس طبقے کے متعلق جسے دینیات کے ساتھ لگاؤ ہے ایک بدظنی پیدا ہو چکی ہے۔

امید ہے اس تالیف کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے بالخصوص مفید ثابت ہوگا جو قرآنی تعلیمات کو تیرہ ۱۳ سو سال پہلے کے احوال و ظروف تک محدود سمجھتے ہیں اور جو قرآن کی دوامی افادیت اور ہر زمانے کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالات میں اس کی رہنمائی کی اکملیت کے یا تو قائل ہی نہیں، یا مصلحتاً صرف دبی زبان سے قائل ہیں، قلبی اطمینان کے ساتھ نہیں۔

فضل الٰہی عارف

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

تمہید

سورۃ والعصر

والعصر ان الانسان لفی خسرہ الا الذین اٰمنوا و عملوا الصلحت و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبرہ	زمانہ اس امر کا شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ ناکام رہا ہے، لیکن اس ناکامی اور خسران سے ہمیشہ ایک جماعت مستثنیٰ رہی ہے۔ اور وہ جماعت ان لوگوں کی

ہے) جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل بھی کئے۔ اور ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کی اور (جب اس راہ میں انھیں مصائب اور شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا تو انھوں نے ایک دوسرے کو ان مصائب و شدائد کو صبر و استقامت سے برداشت کرنے کی تلقین کی۔"

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ صحتِ عمل کے لیے صحتِ فکر لازمی ہے، اور عملی قوت، جس کی بنیاد صحت فکر پر نہ ہو، بے کار بلکہ بے نتیجہ ہے۔ اسی طرح فکر، جس کا نتیجہ صحتِ عمل نہ ہو محض گمراہی ہے، یا زیادہ سے زیادہ دماغی تفریح اور بے کاروں کا مشغلہ۔ آج دنیا کی مصیبت یہ نہیں کہ اس کی عملی قوتیں بے کار

Marfat.com

ہو چکی ہیں بلکہ اس کی اصل گمراہی صحتِ فکر کا فقدان ہے۔ ہماری ذہنی عمارت ہی غلط مبادی پر استوار ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ:

قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالاً الذين ضل سعيهم في الحيوٰة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعاً

"کہہ دو اے پیغمبر، ہم تمہیں سب سے زیادہ گھاٹے والے عمل کی اطلاع دیں۔ وہ ان لوگوں کا عمل ہے جن کی دنیا ہی مساعی بے راہ ہوگئیں اور وہ اس زعم میں ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔"

ایسی ہی فکری اور عملی بے راہ روی اور جاہلیت کا دور اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے آقا، ہادی محمد رسول صلعم مبعوث ہوئے۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے امام اور پیشوا حضرت سید المرسلین صلعم تشریف لائے تو دنیا صحتِ عمل اور صحتِ فکر سے یکسر محروم ہو چکی تھی اور مہذب قومیں اوجِ ترقی پر پہنچ کر قعرِ مذلت میں گر رہی تھیں۔ ان میں فسادِ فکر کے علاوہ فسادِ عمل اس درجہ سرایت کر چکا تھا کہ ان کی عملی قوت یا تو بالکل فنا ہو چکی تھی یا اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ ان قوموں میں فکر و عمل کی اصلاح یا تعمیر کی کوئی صلاحیت باقی ہی نہ رہی تھی۔ لیکن قومِ عرب گو وحشت و بربریت، شرک و بت پرستی میں کسی دوسری قوم سے پیچھے نہ تھی مگر ان کی قوتِ عمل کو ابھی گھن نہ لگا تھا۔

وہی اپنی فطرت پہ طبعِ بشر تھی
خدا کی زمیں بن جتی سربسر تھی

چنانچہ خدا کی مشیت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ اس جنگلی اور بدو قوم میں اپنا آخری پیغمبر مبعوث فرما دے جو اپنے فطری جوہروں سے تہی دامن نہ تھی۔ اس قوم میں مشہور شجاعت، مہمان نوازی اور فیاضی، قبیلے کے ناموس پر کٹ مرنے کا والہانہ جوش اور دوسرے خفتہ (latent) جوہر جو ایک قوم کو حکومت و سیادت کا

Marfat.com

اہل ثابت کرتے ہیں بشرطیکہ اس قوم کو صحتِ فکر کے زیور سے آراستہ کر کے اسکی عملی قوتوں کو ان کے صحیح مصرف کی طرف مبذول کر دیا جائے۔ چنانچہ پیغمبر آخر الزماں صلعم نے اس قوم کو صحتِ فکر اور صحتِ عمل کے زیور سے آراستہ کر کے تمام دنیا کی ہدایت اور سرداری کے لیے مامور فرمایا۔ پہلا حکم بھی آپ کو یہی ملا کہ:

وانذر عشیرتک الاقربین — تمہاری تبلیغ کا پہلا قدم یہ ہوگا کہ اپنے قریبیوں کو ڈراؤ۔"

چنانچہ اسی لیے قرآن مجید نجماً نجماً نازل ہوا اور قرآنی تعلیمات کے تدریجی ارتقاء اور تکمیل پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصود یہی تھا کہ سب سے پہلے عرب قوم کی فکری اور عملی تعمیر کی جائے اور پھر اسے پیغامِ الٰہی کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لیے مامور کیا جائے۔ اسی لیے پہلے مکی سورتیں نازل ہوئیں جن میں نہایت مختصر اور بلیغ انداز میں عربی قوم اور جملہ بنی نوعِ انسان کے عقیدہ کی خرابی اور اس کی صحت کی ضرورت اور قوائے عملیہ کے صحیح استعمال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور جماعتی نظام کے قیام کی تلقین کی گئی ہے۔ گویا مکی سورتیں بمنزلہ اساس و بنیاد کے ہیں اور مدنی سورتیں نظامِ حکومت کے تفصیلی قواعد و ضوابط پیش کرتی ہیں۔

آج جب کہ مسلمان صحتِ فکر و عمل دونوں سے یکسر عاری ہو چکے ہیں اور بقولِ علامہ اقبال ؒ ؎

مومن است و پیشہ او آذری ست
دین و عرفانش سراپا کافری ست

اس امر کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے کہ ان سورتوں کے مطالب کو ان کے سامنے پیش کر کے انھیں دعوتِ فکر دی جائے کہ وہ اپنی تعمیرِ نو میں اس اصولوں کو پسِ پشت نہ ڈال دیں۔ اسی طرح ان کے قوائے فکریہ بیدار ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

اور صدیوں کا جمود و تعطل جس نے اس کے قوائے عملیہ کو شل کر دیا ہے، دور ہو کر نئی زندگی کی لہر ان میں دوڑ سکتی ہے اور مسلمانوں پر ہی کیا موقوف ہے تمام دنیا ایک شدید ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ خونریز ترین جنگ کے بعد بھی بنی نوع انسان امن و راحت، اخوت و مساوات سے ہمکنار نہیں ہو سکیں گی۔ قرآن تو ابھی سے بہت ہی تشویش انگیز ہیں۔ اور بعض مغربی قوموں کی رقابت ابھی سے ایک تیسری عالمگیر جنگ کی تمہید معلوم دے رہی ہے اور تمام مدبرین و سیاست دان نے دائمی امن کے جتنے نسخے تجویز کیے ہیں یا کر رہے ہیں وہ ان کی اپنی رقابتوں اور بد نیتی کی وجہ سے امن کو کبریت احمر یا سیمرغ سے بھی زیادہ عسیر الحصول بنا رہے اور مصیبت زدہ انسان حیرت سے پکار رہا ہے۔

دردِ ما را نیست درمان الغیاث

ان حالات کی موجودگی میں اس وقت قرآن مجید ہی دنیا کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ اور بنی نوع انسان کو موجودہ جہنم سے نکال کر اخوت و مساوات اور امن و سلامتی کی جنت میں لے جا سکتا ہے۔

قرآن حکیم کی یہ چھوٹی سورتیں گو نہایت مختصر ہیں۔ لیکن مضامین کے اعتبار سے انہیں کوزہ میں دریا بند کر کے عظیم الشان حقائق ابدی کو بے نقاب کیا گیا ہے چنانچہ سورۃ والعصر اور اس کے بعد کی سورتوں کا مطالعہ آپ کی بصیرت کے لیے کافی ہے۔

Marfat.com

اقسام قرآن

اس سورۂ مبارکہ کی ابتدا قسم سے ہوئی ہے۔ یعنی قسم ہے زمانہ کی۔ اس کے معنی میں اور قسم اور جواب قسم کے متعلق مفسرین کرام رحمہم اللہ نے بہت سی موشگافیاں کی ہیں۔ لیکن یہ موقعہ اس پر بحث کرنے کا نہیں ہے۔ ہم اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ جو زیادہ تر امام ابن قیم الجوزی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "اقسام القرآن" سے ماخوذ ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مختلف قسمیں کھائی ہیں۔ بعض جگہ تو وہ صرف تاکید کے لیے ہیں مثلاً۔ فو ربك لنسئلنهم اجمعين "پس تیرے پروردگار کی قسم ان سب سے ان کے اعمال کے بارے میں پرسش کریں گے۔

فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم۔ پس تیرے مالک کی قسم، یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تمام تنازعات میں تجھے حاکم یا منصف نہ بنائیں۔

لعمرك انهم لفی سكرتهم یعمهون :۔ تیری عمر کی قسم یہ لوگ اپنی مدہوشی میں ٹامک ٹوئیے مارتے ہیں۔

ان قسموں سے مقصود تاکید ہوتی ہے اور ایک واقعہ کو متحقق الوقوع ثابت کرنا ہوتا ہے۔ یہ فصحائے عرب کا معمول تھا کہ جز کی تاکید کے لیے قسم کا استعمال کرتے تھے۔ اور یہ مفہوم قریباً ہر زبان میں مستعمل ہے۔

لیکن قرآن حکیم میں قسموں کی ایک اور قسم بھی کثیر الاستعمال ہے۔ ان قسموں میں جواب قسم عموماً جملہ خبریہ ہوتا ہے اور مقسم علیہ یا مقسم بہ (جس کی قسم کھائی جائے) اللہ تعالیٰ کی خاص نشانیوں پر دلالت کرتے ہوئے جوابِ قسم پر نہایت لطیف دلیل پیش کرتا ہے۔ یعنی

Marfat.com

جوابِ قسم عموماً ایک دعوا ہوتا ہے اور مقسم بہ اس کی دلیل۔ گویا یہ قسمیں قرآن حکیم کے ایک معجزانہ طرزِ استدلال پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اور سنت اللہ یہی رہی ہے کہ ان قسموں میں بعض نہایت اہم معتقداتِ مذہب پر ایسی دلیل قائم کی جائے جن سے ان کفار کے رائج الوقت اعتقادات کا بطلان ثابت ہو کر اسلامی معتقدات کی صحت قائم ہو جائے یا کسی عمومی دعوے کے ثبوت میں فطری دلائل پیش کئے جائیں۔ مثلاً:-

والشمس وضحاها والقمر اذا تلاها الآیۃ — قسم ہے

قد افلح من زکّٰها وقد خاب من دسّٰها — جوابِ قسم

والتین والزیتون وطور سینین وھذا

البلد الامین۔ اور لقد خلقنا الانسان — قسم ہے

فی احسن تقویم الی آخر سورت — جوابِ قسم

والذاریات ذروا فالحاملات وقرا

فالجاریات یسرا فالمقسمات امرا — قسم ہے

قسم ہے ان ہواؤں کی جو بخارات کو اڑا کے لے پھرتی ہیں۔ پھر بادلوں کے بوجھ کو اٹھاتی ہیں۔ پھر انھیں لے کر آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ پھر اللہ کی رحمت کو تقسیم کرتی ہیں:

اور

انما توعدون لصادق ٥ وان الدین لواقع — جوابِ قسم

"جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ یقیناً سچا ہے اور جزا و سزا یا سر واقع ہونے والی ہے"

اب اگر ان قسموں اور ان کے جوابوں پر غور کیا جائے تو یہ بات بالبداہت ثابت ہو جاتی ہے کہ قسم اور جوابِ قسم میں ہر جگہ دلیل اور دعوے کا تعلق ہے اور یہ دعاوی وہ بنیادی عقائد ہیں جن سے کفار انکار کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں اور

Marfat.com

اب بھی کرتے ہیں اور ان قسموں میں ان دعاوی یا معتقدات کا نہایت لطیف ثبوت پیش کیا گیا ہے جو خود قرآن حکیم نے قسم کو شہادت کے معنوں میں استعمال کرکے اس طریق استدلال کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اذا جاءك المنٰفقون قالوا نشهد انك لرسول الله — "جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ تحقیق کہ تو اللہ کا رسول ہے۔"

پھر ان کی اس شہادت کو آگے چل کر قسم سے تعبیر فرمایا ہے۔

اتخذوا ایمانهم جنة "انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔"

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہاں قسم سے مراد شہادت ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ آخر الذکر قسمیں ہمیشہ ایک زبردست عمومی دعوے سے پہلے استعمال کی گئی ہیں۔ اس لیے مقسوم بہ اور جوابِ قسم میں صرف ایک ہی تعلق ہو سکتا ہے کہ مقسم بہ جواب قسم کے لیے شہادت یعنی دلیل وحجت ہو اور حجت کو ذکر کرتے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ سامع کا ذہن خود بخود اس دعوے کی شہادت کی طرف منتقل ہو جائے اور یہ تعلق ایسا بدیہی ہے کہ اس سے انکار بداہت سے انکار کا مترادف ہے۔

ان شہادتوں یا دلائل کی اہمیت سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کی طرزِ استدلال کے متعلق چند حقائق پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآنِ حکیم سے پہلے دو طرح کی الہامی کتب موجود تھیں یہ پہلی قسم کی الہامی کتب تو فلسفیانہ تھیں اور یہ عموماً آرین یا منگولین اقوام کی الہامی کتب ہیں، مثلاً:

ژند یا گیتا یا کنفیوشس کی (Analects) یا ژند و پاژند۔

دوسری قسم کی الہامی کتب وہ ہیں جن کا وجود عام طور پر امی اقوام میں پایا جاتا ہے، وہ توریت و زبور اور عہدنامہ جدید کی طرح تاریخی کتب ہیں۔ قرآن حکیم نہ تو اول الذکر کتب کی طرح خشک فلسفیانہ کتاب ہے کہ مذہب اور الہیات کے دقیق فلسفہ میں گم ہوکر عوام کی دسترس سے باہر ہو جاتا اور نہ موخر الذکر کتب کی طرح سنین و اعوام و واقعات کی تاریخی ڈائری ہے کہ اس میں حکایت اصل کتاب ہو جائے اور اخلاق کی حیثیت ثانوی ہو جائے۔ بلکہ قرآن حکیم ایک مرقع فطرت ہے جس میں انسان کے فطری داعیوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے اس میں نہ تو دلائل کے مواقع پر قضایا او صغریٰ و کبریٰ مرتب کرکے نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور نہ خالص تحکم بلا دلیل یعنی (dogmatism) پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بلکہ کہیں انسانی فطرت سے استشہاد کیا گیا ہے۔ کہیں آسمان و زمین شمس و قمر و نجوم، شجر و حجر سے استدلال کیا گیا ہے، کہیں تاریخی واقعات سے اخلاقی اصول اخذ کیے گئے ہیں۔ کہیں انہیں قصص میں سیاست اقوام کے مہمات اصول پیش کیے ہیں۔ کہیں صرف مخاطب کے دعاوی کی سخافت کو نمایاں کر دیا گیا ہے تاکہ مخاطب کا ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہو جائے کہ جو دعویٰ اس قدر رکیک اور پوچ ہو اس کے تسلیم کرنے والے کیا کہلانے کے قابل ہیں:۔

قرآن حکیم کا استدلال اس درجہ فطری ہے کہ عامی و نادان سے عالم و فلسفی تک، بچے سے لے کر بوڑھے تک اس سے یکساں متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہیں اقسام استدلال بھی قرآن حکیم کا بالکل اچھوتا اور دل نشین پیرایہ استدلال ہے۔ اب تو اب قسم پر غور کرو جو تمام مذاہب کے اساسی عقائد ہیں، مثلاً جزا و سزا، قرآن حکیم کا الہامی ہونا، خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے عقائد دینی کے ثبوت میں فلسفیانہ موشگافی سے کام لیا جاتا تو جہاں ایک طرف عقل انسانی

Marfat.com

لاٹونئم کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ جاتی اور قضایا اور نتائج کا ایک ایسا طومار بن جاتا کہ نہ اس کے سمجھنے کے لیے ایک ماہر فلسفی دماغ کی ضرورت ہوتی تو دوسری طرف۔ اس کا مفاد اس قدر محدود ہو جاتا کہ سوائے معدودے چند منفرد ہستیوں کے اس سے عامۃ الناس کسی قسم کا فائدہ نہ اٹھا سکتے، اور قرآن شریف تمام بنی نوع کے لیے چشمۂ رحمت اور رہنمائی ثابت ہونے کے بجائے ایک طویل چیستان بن جاتا جس طرح کہ وید اور اپنشد ہیں کہ آج تک ہزاروں شارحین کی طبع آزمائیوں کے باوجود بھی ان کے اکثر حصے عقدہ لاینحل ہیں۔ اس لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ ایسے عمومی حقائق کو جن کا ایمان در اصل انسان کی فطرت کا ضمیر ہے، ثابت کرنے کے لیے اللہ کی ایسی نشانیاں پیش کی جائیں جو دن رات ہمارے سامنے وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ اور اپنے اندر اربابِ بصیرت کے لیے عبرت و موعظت کا ایک دفترِ بے پایاں پنہاں رکھتی ہے تاکہ ان پر غور کرنے سے عقلِ انسانی کا خفتہ ایمان بیدار ہو جائے اور وہ خود بخود ان پر ایمان لے آئے۔

فی الحقیقت مقسوم بہ اور جواب قسم کے اس تعلق پر غور کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ ان میں تعلق شہادت اور دعویٰ کا ہے۔

عربی زبان میں بھی قسم کا استعمال بطور شہادت ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ اردو اور فارسی میں بھی قسم شہادت کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ظہوری کہتا ہے ؎

زاہلِ مہر و محبت نشاں نہ دادم کس | بہ مہر خویش و بہ بے مہری تو سوگند است

غالب کہتا ہے ؎

وجودِ او ہمہ حسن است و ہستی ام ہمہ عشق | بہ بخت دشمن و اقبال دوست سوگند است

لیکن اس طرح جواب قسم پر مقسم بہ سے استشہاد قرآن کی جدت ہے۔ اور انشاء اللہ اس موضوع پر ہم مختلف اقسام کی تشریح کے مواقع پر تفصیلاً گفتگو کریں گے

والعصر میں عصر کی تقسیم بھی اسی قبیل سے ہے۔ یعنی اس سورت میں ایک عظیم الشان حقیقت کی طرف ایک دعوے کی شکل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ   تحقیق انسان گھاٹے میں رہا ہے۔

اور اس عمومی دعوے سے مستثنیٰ صرف ایک جماعت رہی ہے جس کا مذکور آخر سورۃ میں ہے اور وَالْعَصْرِ یعنی زمانے کی قسم سے اس کی شہادت پیش کی گئی یعنی زمانہ خود اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ انسان من حیث القوم ہمیشہ مرض خسران میں مبتلا رہا ہے۔ یا بہ الفاظِ دیگر تاریخ اس امر کی شہادت دے رہی ہے، اور اگر تم تاریخ کی ورق گردانی کرو گے تو تمھیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ بنی نوع انسان ہمیشہ مرض خسران کا شکار رہے ہیں۔ جواب قسم اور مقسم بہ کے تعلق پر غور کیجئے تو گنجینۂ معنی کا ایک طلسم آپ کے سامنے بے نقاب ہو جاتا

خُسر کی تعریف

ان الانسان لفی خسر کہنے کو تو ایک چھوٹا سا بول ہے۔ ایک نہایت مختصر جملہ مگر اس کی بلاغت پر غور کیجئے۔ ان اور لام تاکید کو جمع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آج تک ان مستثنیات کو چھوڑ کر جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ اِنسان کی مساعی کا کوئی اور انجام ہی نہیں ہوا۔ انسان پر اَل تعریف کا ہے۔ اس لیے اس کے یہ معنی ہوئے کہ یا تو جنس انسان یا انسان اول سے آخر تک بدو شعور سے تا قیام قیامت ہمیشہ مرض خسران میں مبتلا رہا ہے اور رہے گا۔ الا ما رحم ربی۔

اس دعوے کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے خسر کی حقیقت کو سمجھنا چاہیئے۔ انسان جب تجارت میں سرمایہ لگاتا ہے اور باوجود انتہائی محنت اور کوشش کے نہ صرف اسے کوئی منافع ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا اپنا سرمایہ بھی تمام کا تمام ضائع ہو جاتا ہے۔ عرب اسے خسر یا خسران سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے خسر کی ضد عربی میں ربح آئی ہے: قرآن حکیم میں آیا ہے۔

فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ (البقرہ) پس ان کی تجارت نے انھیں کچھ نفع نہیں پہنچایا۔

تو قرآن حکیم میں خُسر سے مُراد انسان کی ایسی حالت ہے جب کہ انسان باوجود اپنی انتہائی کوشش کے اپنی محنت کے ثمرات سے محروم ہو جائے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالاً ۰ الذين ضل سعيهم فی الحیوٰة الدنیا وهم یحسبون انهم يحسنون صنعا ۰ (الکہف)

اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ کیا ہم تمھیں سب سے زیادہ گھاٹے والے اعمال بتلا دیں وہ ان لوگوں کے اعمال ہیں جن کی کوششیں دنیوی زندگی میں سب کی سب بے راہ ہوگئیں اور وہ اسی خیال میں مگن رہے کہ وہ بڑی نیکی کما رہے ہیں۔

آگے چل کر فرمایا:۔

فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيامة وزنا ۰ (الکہف)

پس ان کے تمام اعمال اکارت ہوگئے پس قیامت کے دن ان اعمال کا ہمارے یہاں کوئی وزن نہیں ہوگا۔

پھر فرمایا:۔

لئن اشركت ليحبطن عملك ولتكونن من الخسرين ۰

اور اگر تم شرک کروگے تو تمھارے تمام اعمال اکارت جائینگے اور تم ضرور آخرت میں خاسرین سے ہوگے۔

یہاں بھی تمام اعمال کے اکارت جانے کو خسران سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر کسی ایک فرد پر ایسی حالت طاری ہوگئی تو ہم کہیں گے کہ فلاں شخص خسران میں مبتلا ہے اور اگر ایک جماعت یا قوم پر ایسی حالت طاری ہوگئی تو ہم کہیں گے کہ فلاں قوم محض خسران کا شکار ہے۔ گویا اس دعوے کا مطلب یہ ہے کہ ازل سے تا امروز نوعِ انسان ہمیشہ اپنی بھلائی اور بہتری کے لیے سعیِ پیہم میں مصروف ہے اور دن رات نفع کمانے کی امید پر اعمالِ شاقہ بجا لاتا رہتا ہے اور اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ وہ سب اعمال اس کے لیے مفید اور نتیجہ خیز ہیں لیکن ان تمام مساعی اور ان تمام اعمالِ اجتماعی کا انجام سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں نکلتا

Marfat.com

اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ خسران خواہ کم ہو خواہ زیادہ خسران ہی ہے اور انسان کا خسران خواہ کامل ہو یا غیر مکمل خسران ہی کہلائے گا۔ مثلاً ایک شخص بیک وقت بہت سے کام کرتا ہے اور ان میں سے ایک کے سوا باقی تمام کاموں میں اسے منافع ہوتا ہے، مگر اس ایک کام میں اسے اتنا زیادہ نقصان ہو جاتا ہے کہ وہ سب منافع بھی خورد بُرد ہو جاتا ہے بلکہ وہ سرمایہ بھی ضائع ہو جاتا ہے تو اس کی حالت کو بھی ہم خسران کی حالت ہی کہیں گے۔ اسی طرح اگر ایک قوم کی قوم مرض خسران میں مبتلا ہو تو گو اس کے بعض افراد کو نفع بھی پہنچ رہا ہو، تو بھی اس قوم کے تمام افراد مرض خسران کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں

فخر۔ سب بے جا ہیں ان کے قوم ہے جن کی ذلیل

فخر و عزت کے، مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

گویا مثلاً ہندوستانی قوم کے کسی فرد کو انگریزی حکومت سے کچھ عارضی فائدہ پہنچ بھی جاتا ہو تو بھی وہ محکوم ہی رہے گا اور محکومی کی جو ذلّت اس قوم کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے اس سے وہ کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ وہ بھی ایک محکوم اور ذلیل قوم کا ہی فرد کہلائے گا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے اس نکتے کو فراموش کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے آخری حصّے کی تاریخ کے اوراق خود غرض، ملّت فروش خائنوں کی کثرت سے سیاہ ہیں اور آج بھی جس قدر خائن مسلمانوں میں ہیں شاید ہی کسی قوم میں ہوں گے۔ ان کے بعض افراد نے خیال کر لیا کہ اگر ہم رشوت لے کر دشمن سے مل جائیں گے۔ یا ذاتی بغض و عناد کی بناء پر اپنی قوم کو نقصان پہنچائیں گے۔ تو ہمیں عزت و دولت میسّر آجائے گی لیکن تاریخ یہ ثابت کر رہی ہے کہ ان کا خیال کس قدر خام تھا۔ اور ان کی غدّاری کا الزام نہ صرف ان کی قوم کی تباہی بلکہ ان کی اپنی رُو سیاہی ہوا فصل من مد کر صادق و میر جعفر کا انجام اور اس سے پہلے بغداد میں علقمی کا

انجام غداروں کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں۔

ہمارے اس بیان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خسران کا اثر انسان کے جسم یا دیگر مادّی اسباب کے فقدان تک ہی محدود ہے۔ نہیں بلکہ خسر کا سب سے پہلا اثر انسانی قلب پر مرتب ہوتا ہے اور مادّی اور جسمانی اثرات درحقیقت قلبی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ فقدانِ راحت اور طمانیتِ قلب کا فنا ہو جانا خسران کے لوازم میں سے ہے۔ اس لیے جب آپ کسی قوم یا فرد کو طمانیتِ قلب یا راحت وسکون سے محروم پائیں تو سمجھ لیجئے کہ عمل خسران شروع ہو چکا ہے اور اگر اسے بروقت روک نہ لیا گیا تو وہ جلد یا بدیر کامل خسران تک منتہی ہوگا۔

بالجملہ اس سورۂ مبارکہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسان من حیث الانسان خسران میں مبتلا ہے۔ سوائے اس جماعت کے جس کا ذکر آخر سورت میں ہے۔ یعنی انسانی جماعتیں دو قسم کی ہیں:

رابحین ۔ نفع کمانے والے اور اپنی محنت کا پھل کھانے والے۔

خاسرین ۔ گھاٹا کھانے۔ یعنی اپنی تمام عمر کی کمائی کو کھونے والے۔

پہلی جماعت مستثنیات میں سے ہے جس کا ذکر بعد میں ہے۔ اور دوسری جماعت عمومی ہے۔ یعنی رابحین کے سوا تمام انسانی جماعتیں خسران میں مبتلا رہی ہیں اور رہیں گی۔ اس دعوے کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ نے عصر کی قسم کھائی ہے۔

عصر کے معنی دہر یا زمانہ کے ہیں۔ چنانچہ عربی کا شعر ہے ؎

ولن یلبث العصران یومٌ ولیلۃٌ

اذا طالبا ان یدرکا ما یتیمما

اور جب رات اور دن یعنی دو زمانے کسی بات کے حاصل کرنے کا قصد کر لیتے ہیں تو اسے حاصل کیے بغیر چین نہیں لیتے۔

Marfat.com

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں عصر کی قسم کیوں کھائی گئی اور دہر کو بطور شہادت کے کیوں پیش کیا گیا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ زمانہ کی گردش چونکہ اللہ کی عظیم الشان نشانیوں میں سے ہے اسی لیے اسے بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ تمام برائیاں دہر کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ فرمائی کہ بھلائی اور برائی سب انسان کا کسب ہے۔ اس میں زمانہ کی شکایت بے جا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے

لا تسبو الدھر فان الدھر ھو اللہ

"دہر کو گالی نہ دو" کیونکہ زمانہ خود خدا ہے۔ یعنی زمانہ کی نیرنگیاں خود خدا کی قدرت سے ہیں۔ اور جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے۔ وہ اللہ ہی کی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہے" یعنی فاعل مختار تو صرف اللہ ہے۔

لہ وفی الصحیحین عن ابی ہریرۃ قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ یوذینی ابن آدم یسب الدہر وانا الدہر بیدی الامر۔ اقلب اللیل والنہار، وفی روایت وانا الدہر یقلب لیلہ و نہارہ قال العلماء کالشافعی وابی عبید القاسم بن سلام وغیرھما یسب الدہر ای یقول فعل بنا الدہر کذا یا خیبۃ الدہر ایتم الاولاد۔ ارمل النساء۔ قال اللہ تعالیٰ (وانا الدہر) ای انا الدہر الذی یعنیہ فانہ فاعل ذالک الذی اسندہ الی الدہر۔ والدہر مخلوق۔ وان فاعل ذالک ہو اللہ فہو یسب فاعل ذالک ویعتقدہ الدہر۔

امام شافعی اور دوسرے علماء نے اس کی تشریح میں کہا ہے۔ یسب الدہر۔ یعنی زمانہ کو گالی دیتا ہے۔ یعنی کہتا ہے کہ ہو زمانے نے ہم پر ستم کیا، زمانے کا برا ہو۔ اس نے اولاد کو یتیم کر دیا اور عورتوں کو بیوہ۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں زمانہ ہوں، یعنی وہ میں ہی ہوں جسے وہ کہہ رہا ہے کہ زمانے نے کیا کیا۔ کیونکہ زمانہ مخلوق ہے اور جو کچھ ہوتا ہے

Marfat.com

وہ اللہ ہی کے حکم سے صادر ہوتا ہے۔ گویا اللہ ہی اس کا فاعل ہے۔ پس وہ زمانے کو گالی دینے میں فاعل کو گالی دیتا ہے۔ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر۔ جلد اول صفحہ ۳۳

لیکن ہمارے خیال میں یہاں زمانہ کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے۔ کہ انسان کی توجہ ان انقلابات کی طرف مبذول کی جائے جو دنیا میں وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ اور اب بھی روزمرہ ہو رہے ہیں، گویا ارشاد ہوتا ہے کہ زمانہ کے انقلاب سے سبق حاصل کرو اور چشم حقیقت بیں سے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہی قومیں زندگی کی دوڑ میں کامیاب رہی ہیں جن میں خصائص چہارگانہ موجود ہوں۔ اسی کا ذکر سورت کے آخر میں ہے۔ باقی سب قومیں خاسر و ناکام ہی رہی ہیں

عبرتے گیر از زمانہ اے جواں
تا نباشی در شمار ابلہاں

یعنی انسان کی جماعتی مساعی (بہ استثنائے جماعت متذکرہ بالا) کا انجام ہمیشہ بربادی و خسران کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اور اگر تمھیں اس کا ثبوت درکار ہو تو انسانی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ چنانچہ جابجا قرآن حکیم میں اقوام گذشتہ کے حالات و واقعات کا چشم عبرت بین سے مطالعہ کرنے کی جابجا پر زور تاکید کی ہے۔

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین ۔ (اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم زمین کی سیر کرو، اور دیکھو کہ تم سے پہلے تعلیم حق کو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔)

افلم یسیروا فی الارض فینظروا (کیا یہ لوگ زمین میں سیر نہیں کرتے اور دیکھتے!)

کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم۔ ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزر چکے۔ کیا انجام ہوا۔

الغرض انسانی تاریخ کا مطالعہ سوئے ہوئے انسان کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہے اس لیے وَالْعَصْرِ کے استدلال کو سمجھنے کے لیے اَلْاِنْسَانَ کے معنی پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔

الانسان میں ال تعریف استغراق یا جنس کے لیے ہو سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کے معنی انسان من حیث الانسان ہی کے ہیں یعنی تمام بنی نوع انسان، خواہ وہ اکٹھے ہوں یا منفرد ہوں۔ اور اس دعوے کا مطلب یہ ہے کہ سوائے ایمان، عملِ صالح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اقوامِ عالم کی مساعی بھی ویسی ہی خاسر و ناکام رہتی ہیں، جس طرح افراد کی۔ ان چاروں اوصاف کے بغیر اقوامِ عالم کی کوششیں۔ فما ربحت تجارتھم "پس انھیں ان کی تجارت نے کچھ فائدہ نہ دیا" کے تحت میں ہی آئیں گے۔

خُسر کی ہمہ گیری

اب اِس استدلال کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے انسانی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے۔ کہ جہاں ہمیں ایک طرف انسان کی ان تھک کوششوں اور مسلسل مساعی کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آتا ہے وہاں ہمیں اس کی محنتوں کے ثمرات کا ایک ہوش رُبا مدفن بھی نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ مختلف انسانی تہذیبوں اور تمدنوں کا گورستان ہے جو زبانِ حال سے پکار پکار کر انسان کی مسلسل ناکامیوں کی ایک الم ناک داستان سنا رہا ہے۔ قرآن حکیم نے ایک بلیغ تمثیل کے پیرائے میں اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا (النحل آیت ۹۲)

اور اس عورت کی طرح نہ ہوجاؤ جو اپنے محنت سے کاتے ہوئے سوت کو خود ہی تار تار کردیتی ہے۔

دنیا میں تخریب کے عمل کی اس قدر گرم بازاری ہے کہ ہر تہذیب کے بعد تخریب نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان تخریب کے لیے ہی تعمیر کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ رُوح فرسا منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ ہر قوم پہلے دن رات کی مسلسل کوششوں سے ایک عالیشان قصرِ تہذیب تعمیر کرتی ہے پھر خود ہی اسے بڑھیا کی طرح اس کی تخریب کے درپے ہوجاتی ہے۔

Marfat.com

اور اسکی اینٹ سے اینٹ بجادیتی ہے۔ دنیا کا کونسا ملک ہے جو کسی نہ کسی تہذیب کا مدفن اور کسی نہ کسی تمدن کا گورستان نہ ہو۔ اور انسان حیرت سے پکار اٹھتا ہے کہ کیا ہر تعمیر کا انجام تخریب اور ہر تمدن کا نتیجہ تباہی ہے۔ مرزا غالب نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

آج دنیا میں بابل و نینوا کی تباہی پر کون ماتم کرنے والا ہے؟ ہندوستان اور مصر کی تباہی پر کون آنسو بہانے والا ہے۔ یونان و روما کی بساطِ تمدن کے الٹ جانے پر کس کی آنکھیں اشک بار ہیں۔ عربوں اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی بربادی پر کون رونے والا ہے۔ لیکن کون ہے جو اس پیہم خرابی اور مسلسل بربادی سے متاثر نہ ہوا ہو اور جس کے دل میں بہادر شاہ ظفرؔ مرحوم کی طرح یہ خیال نہ پیدا ہوتا ہو گا کہ ؎

روز معمورۂ عالم میں خرابی ہے ظفرؔ ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

اور کون ہے جس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال نہ اٹھتا ہو گا کہ، کیا اس عمل تخریب کا کبھی خاتمہ بھی ہو گا۔ اور کیا بنی نوعِ انسان کو لازوال ترقی کا ایسا گر ہاتھ آجائیگا جس سے خود عمل تخریب ہی فنا ہو جائے۔

ان تمام اقوامِ عالم کے حالات پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ سب قومیں باری باری میدان عمل میں گامزن رہیں اور جب تک ان میں بعض خصائص رہے وہ ترقی کرتی رہیں۔ پھر ان میں انحطاط و تنزل کے زہریلے جراثیم پیدا ہونے شروع ہوئے اور پہلے ان کے امتیازی خصائص فنا ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ وہ ایسی مٹیں کہ چند ٹوٹی ہوئی

عمارتوں یا دوسرے آثار کے سوا آج ان کی حیرت انگیز عظمتِ رفتہ اور تجرۂ افراشوکت گزشتہ کی یاد دلانے والی کوئی چیز باقی نہیں۔

ہستی ہماری آپ فنا کی دلیل ہے
ایسے مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

اس وقت بھی ہم ایک انقلاب انگیز دور میں سے گزر رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ تہذیب مغرب جس کے متعلق اہل مغرب کا خیال تھا کہ وہ انسان کے تخیل کی انتہائی پرواز اور انسانی علم وعمل کی آخری معراج ہے اور جس کی تباہی نوعِ انسان کی تباہی کے مترادف ہوگی اور جس نے انسانی ترقی کے لازوال چشموں کا سراغ پالیا تھا۔ اب موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ بولشوزم اور سوشلزم نے اس کے اقتصادی نظام کی بنیادیں متزلزل کردی ہیں اور اس کے سوشل نظام کو درہم برہم کردیا ہے اور موجودہ جنگ جو۔ گو جرمنی نازی ازم اور روس اور ڈیموکریسی میں لڑی جارہی تھی۔ اور جس کا نتیجہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ نازی ازم فنا ہوچکا ہے۔ درحقیقت سرمایہ دارانہ تہذیب کا آخری مقابلہ تھا۔ اور گو اس جنگ میں دو سرمایہ دار قومیں روس کی حمایت پر تھیں، لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ یہ جنگ درحقیقت سرمایہ دارانہ تہذیب کی آخری شکست اور سوشلسٹ تہذیب کی جیت ہے۔ بلکہ روس کے موجودہ اقتدار کے بعد یا تو امریکہ اور انگلستان کو خود اشتراکی نظام قبول کرنا ہوگا یا ایک تیسری جنگ کے لیے تیار ہونا پڑے گا جو مغربی تہذیب کے خاتمہ کا پیش خیمہ ہوگی اور قرائن و آثار دلالت کر رہے ہیں کہ موجودہ تہذیب اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ چکی ہے۔ اور اپنی پیش رو تہذیبوں کی طرح اس کی بساط تمدن بھی الٹنے کو ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ یہ تہذیب بھی ایسی فنا ہوگی کہ اس پر آنسو بہانے والا نہ ہوگا۔

Marfat.com

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ ان پر آسمان و زمین (میں سے کوئی) نہ روئے۔

چنانچہ خود مغربی مفکرین بھی موجودہ تہذیب کے انجام کے متعلق تشویش میں مبتلا ہیں۔ جارج برنارڈ شاہ (Bernard Shaw) اپنی ایک کتاب (The madHouse of america) میں لکھتا ہے کہ:-

"ہماری تہذیب بھی اب تباہی کے کنارے پر کھڑی ہے اور کوئی دم میں مٹا چاہتی ہے، کیونکہ اس میں ادبار کی وہی علامتیں اور آثار پیدا ہو چکے ہیں جو اس سے پہلے تباہ ہونے والی تہذیبوں میں پیدا ہوئے تھے۔"

پھر دوسری جگہ لکھتا ہے:- کہ

"دنیا کو صرف محمد (صلعم) کی آمریت ہی تباہی سے بچا سکتی ہے۔"

موسیولی جان "روح الاجتماع" میں لکھتا ہے کہ:

"ہم کو اپنے تمدن کے متعلق بھی یہی خوف لگا ہوا ہے کہ کہیں اس کا بھی وہی حشر نہ ہو جو اس سے پہلے تمدنوں کا ہوا ہے۔"

اقبال نے کیا خوب کہا ہے،

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

قرآن حکیم نے اس عمل تخریب کو خسر سے تعبیر فرمایا ہے اور تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہی بتلاتا ہے کہ انسان ہمیشہ مرضِ خسران میں مبتلا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر بڑے بڑے

Marfat.com

حکمانے خود تہذیب کو مرض خسران کا محرک قرار دیا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے ایک بہت بڑے مفکر ایڈورڈ کارپنٹر (Edward Carpenter) نے اپنی ایک مشہور کتاب (Civilization its cause & cure) میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تہذیب ایک خوفناک مرض ہے جو ہر قوم کو ترقی اور نشوونما کے دوران لاحق ہوتا ہے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار کے چھوڑتا ہے۔ گویا قرآنی دعویٰ کہ

اِنَّ الانسان لفی خسر۔ تحقیق انسان ہمیشہ گھاٹے میں رہا ہے۔

انسانی تاریخ کے ایک ایک ورق پر ثبت ہے اور اگر بہ نظر امعان دیکھا جائے تو موجودہ زمانے سے زیادہ بھیانک تصویر خسران کی شاید ہی دیکھنے میں آئی ہو۔ اور ایسا زبردست ثبوت اس دعوے کا شاید ہی کبھی پیش ہوا ہو۔ فھل من مدکر

Marfat.com

فکری خُسر

انسان کے ذہنی افکار کا بھی یہی حال ہے۔ ہم جس عمل کو ترقی اور ارتقائ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ بھی دراصل عملِ تخریب ہی ہے۔ ایک زمانے کے حکماء دماغ سوزی کر کے علم و حکمت کے میدان میں مختلف نظریے پیش کرتے ہیں۔ لیکن ابھی ان نظریوں کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوتے پاتی کہ ان کی تردید شروع ہو جاتی ہے اور انسان اپنے ذہنی قصروں کو ڈھا کر ایک نیا ذہنی اور فکری عمل تعمیر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ گو وہ پہلے سے زیادہ شاندار اور بظاہر زیادہ پائیدار نظر آتا ہے۔ مگر اس کا بھی رہی حشر ہوتا ہے۔ گویا ہر ترقی کے لیے عملِ تخریب اور پہلی محنتوں کی بربادی ضروری ہوتی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہر بنائے کہنہ کاں باداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

اس عملِ تخریب سے انسانی بےبسی اور قرآنی دعوے کی عمومیت ثابت ہوتی ہے۔ کہ۔ ان الانسان لفی خسر۔

اب ذرا اور غائر نظر سے انسانی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب سے انسان نے خداداد عقل و بینش سے کام لینا شروع کیا ہے۔ اس کی تمام مساعی، اس کی تمام علمی اور فکری قوتوں کا مدعا و منتہا یہی رہا ہے کہ اپنے تئیں مرضِ خسران سے بچائے۔ یہی داعیہ اس کی علمی ترقیوں، اس کی معاشی تبدیلیوں اور اخلاقی ضابطوں کی تخلیق و ایجاد کا باعث رہا ہے۔

Marfat.com

بڑے بڑے حکماء، بڑے بڑے فلاسفر اور بڑے بڑے مفکرین نے اپنی عمریں اس نسخۂ کیمیاء کی تلاش میں صرف کر دیں جس سے انسان خسر سے بچ کر ابدی فلاح سے ہمکنار ہو سکے۔ ان کے مساعی کا محور دو امور کی دریافت رہا ہے۔

اوّل: اسبابِ خسران کی تلاش تاکہ ان کا سدِ باب ہو سکے۔

دوم: فلاحِ ابدی کے اسباب کی جستجو تاکہ ان کے حصول سے ابدی فلاح کا دروازہ کھل جائے اور انسان غیر محدود ترقی کر سکے۔ لیکن افسوس کہ ان سب کی متفقہ کوششیں بھی انسان کو خسران سے نہ بچا سکیں۔ اور انسان من حیث الانسان خسر کا ہی شکار رہا۔

مختلف مذاہب نے خسر کے جو علاج تجویز کیے وہ ناکام رہے

فلاسفہ اور مقننین کے علاوہ اسلام سے پہلے مختلف مذاہب نے بھی مرض خسران سے محفوظ رہنے کے لیے مختلف نظریے پیش کیے۔ لیکن ان کی توجہ کا مرکز افراد کی اصلاحِ احوال رہی۔ انھوں نے کوئی ویسا نسخہ تجویز نہ کیا جو انسان کو من حیث الانسان خسران سے بچا سکتا، کیونکہ انسان کی ہمہ گیر فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نسخہ بھی جب تک ویسا ہی ہمہ گیر نہ ہو، موثر ثابت نہیں ہو سکتا اور بنی نوعِ انسان کو خسران کی دلدل سے نہیں نکال سکتا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام سے پہلے دو قسم کے مذاہب تھے۔ ایک تو وہ جو خسران سے نجات کا واحد ذریعہ ترکِ دنیا کو بتلاتے تھے۔ اور اُسے مختلف ناموں سے موسوم کرتے تھے۔ یوگ، سنیاس، رہبانیت سب ایک ہی خواب کی مختلف تعبیریں ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا مایا ہے۔ یعنی دھوکے کی ٹٹی۔ اس سے بھاگ جانا اور اس سے نفرت کرنا ہی انسان کو خسران کے دلدل سے نکال کر ابدی راحت کی جنت میں لے جا سکتا ہے۔

چنانچہ ہندو مذہب، بدھ مت، جین مت اور عیسائیت سب کے سب ترکِ دنیا کے راستے انسان کو مرضِ خسران سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمیں معاف

رکھا جائے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ان کا علاج اصل مرض سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور بلحاظِ نتائج انسانیت کے لیے زیادہ مہلک اور ناقابلِ عمل ہے۔ ان کی مثال تو اس ڈاکٹر کی ہے جو ہر درد کی دوا، اس عضو کو کاٹ دینے سے کرتا ہے۔ یا اس طبیب کی ہے جو کسی مریض کو مبتلائے مرض دیکھ کر اسے زہر ہلاہل پلا کر اس کی زندگی کا ہی خاتمہ کر دیتا ہے۔ اور کہے کہ اگرچہ زندگی جاتی رہی، مگر درد بھی تو جاتا رہا۔ کیونکہ جب دنیا ہی نہ رہی تو پھر علاج کیسا؟ انسان کا اصل مقصود تو یہ تھا کہ دنیا بھی نہ چھوٹے اور خسران سے نجات بھی حاصل ہو۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

قرآن حکیم نے ترکِ دنیا کی اس لیے مذمت فرمائی کہ یہ ناقابلِ عمل ہے اور بے انتہا مفاسد کا دروازہ کھولتا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

وَرهبانية ابتدعوها ما كتبناها	اور ترکِ دنیا جو انھوں نے اپنی طرف سے ایجاد
عليهم الا ابتغاء رضوان اللهِ	کر لی تھی۔ حالانکہ ہم نے ان پر اسے فرض نہیں
فما رعوها حق رعايتها (الحديد)	کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے خود ہی اسے اللہ کی خوشنودی

کے حصول کے لیے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ مگر اسے بھی نباہ نہ سکے۔ جیسا کہ اسے نباہنا چاہیے تھا۔

اسی لیے آگے چل کر فرمایا:۔

وکثیرٌ مِنهُمْ فاسقون۔ (اور رہبانیت اختیار کر کے) اکثر ان میں سے فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے)

ہندو مندروں، دیو داسیوں، بدھ کے بھکشوؤں اور عیسائیوں کی خانقاہوں کی اس بات [illegible] صحیح تصویر کھینچنی ناممکن ہے [illegible] ناممکن العمل [illegible] فسق و فجور کی کثرت [illegible]

[illegible] توہم پرستی [illegible] اور رسم پرستی نے انسان کے لیے دائرہ عافیت تنگ کر دیا اور [illegible] خسران [illegible] اور [illegible] یہودی اور [illegible] صحیح عمل و ایمان

کی جگہ بے روح رسم و رواج نے لے لی اور مذہب کی پابندی ایسی مشکل ہوگئی کہ انسان نے اس سے بغاوت شروع کر دی۔ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ مذاہب بھی انسان کو خسران سے نجات دلانے میں ناکام رہے۔

اب ذرا فلاسفہ اور مقننین کو لیجیے۔ حکماء، فلاسفہ اور مقننین کا بھی یہی دعویٰ رہا ہے کہ وہ انسان کو مرض خسران سے بچا کر ابدی ترقی کی شاہراہ پر چلانا چاہتے ہیں۔ مگر ہم صرف چند حکماء کی مساعی کا ذکر کریں گے۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے افلاطون کی غیر فانی کتاب "ریاست" (The Republic) آتی ہے، جس میں اس نے مکالمے کی صورت میں ایک ایسے نظام کا خاکہ پیش کیا ہے جو اس کے خیال میں آئیڈیل نظامِ حکومت ہے لیکن افسوس کہ افلاطون کا تخیل عمل کا شرمندہ احسان نہ ہوا۔ یونان تو بڑا ملک تھا۔ وہ ایک بستی بھی ایسی تیار نہ کر سکا جو اس کے اصولوں پر چل کر ایک مواخاۃ (Brotherhood) قائم کر لیتی اور بھولے بھٹکے انسانوں کو جنتِ ارضی کا ایک دھندلا سا خاکہ دکھا دیتی۔

اس کے بعد مختلف فلاسفہ نے مختلف خاکے تیار کیے چنانچہ (Hobbes's Leviathan) ہابز کی لیواتھیا دمن) انسان کامل (Moore's Utopia) مور کی "جمہوریت کاملہ" اور (Machiavelli's The Prince) میکیاولی کی "شہزادہ" بہت مشہور و معروف ہیں چنانچہ اکثر سیاستدانوں کا خیال ہے کہ یورپ کی موجودہ سیاست تمام و کمال "شہزادہ" پر مبنی ہے لیکن آج جو حشر یورپ کی سیاست کا ہو رہا ہے۔ وہ اربابِ دانش و بینش سے پوشیدہ نہیں اور اسے دیکھتے ہوئے کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ نسخے انسان کو خسران سے نجات دلانے والے ہیں۔

فلاسفہ کی ناکامی

اسی طرح جرمنی میں دو متوازی اسکول پیدا ہوئے۔ ایک تو ہیگل اور نیٹشے کا اسکول جس کا مرکزی خیال ہے کہ "فرد کی زندگی ریاست کے لیے ہے" اور جس کا بنیادی اصول جرمن قوم کی اخلاقی برتری ہے۔ اس کا جو کچھ حشر ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اور ہٹلر اس کی نازی پارٹی جو جرمن سیادت کی مجنونانہ علمبردار ہے نہ صرف خود فنا ہو چکے ہیں بلکہ تمام جرمن قوم کی تباہی و بربادی کا باعث ہوئے ہیں۔ نیٹشے نے سب سے پہلے (super man) مافوق الانسان، کا تصور پیش کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ فوق البشر — (super man) دنیا کی حکومت کے لیے بنایا گیا ہے اور وہ فوق البشر جرمن قوم ہے۔ اس خیال کا سب سے بڑا علمبردار ہٹلر تھا۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت اس نے تمام دنیا کو چیلنج دے دیا اور خدا کے کروڑوں بندوں کو خاک و خون میں ملا دیا اور ان شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور آج اس کی حماقت کی وجہ سے وہی آتشیں جو اس نے غیر ممالک پر ڈھائی تھیں خود اس کے اپنے ملک پر ڈھائی جا رہی ہیں اور جرمن قوم موت کے گھاٹ اتاری جا رہی ہے عین ممکن ہے کہ خود ہٹلر بھی مرتے وقت جرمن قوم کے اس حسرتناک انجام پر کف افسوس مل رہا ہو۔ مگر خود کردہ را چہ علاج۔ گویا نیٹشے کا تریاق زہر ہلاہل سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوا اور ایسی بہادر قوم کو ایک انسان کی غلامی کی وجہ سے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔

دوسرا اسکول بھی جرمنی ہی میں پیدا ہوا اس کا بانی مبانی ایک یہودی کارل مارکس

Marfat.com

تھا اور اس کی کتاب "سرمایہ" (The capital) اشتراکیت کی بائیبل کہلاتی ہے۔ اسے کمیونزم یا اشتراکیت کہتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا علمبردار لینن تھا جس نے روس میں اشتراکی نظام قائم کر کے کارل مارکس اور اینگلز کے تخیل کو عملی جامہ پہنایا۔ آج روسی حکومت کی عنان سٹالن کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ تجربہ گو شروع میں بہت کامیاب رہا اور اکثر لوگوں کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ انسانیت کے مرض خسران کا واحد علاج یہی ہے مگر بہت جلد یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ: ع

چو از چنگالِ گرگم در ربودی
چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی

بولشوازم بہت جلد عُریاں ہو گیا۔ اور اب بجائے عامۃ الناس کی جمہوریت کے وہ بھی ایک سخت ترین قسم کی آمریت بن کر رہ گیا ہے۔ سٹالن کی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) ہٹلر اور مسولینی کی آمریت اور سرمایہ دارانہ ممالک کی حرص و آز اور ہوسِ مُلک گیری اور امپیریلیازم کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ کل جس طرح ہٹلر اور مسولینی دنیا کو اپنے جذبۂ ملوکیت کی وجہ سے چیلنج کر رہے تھے۔ آج اسی طرح اسٹالن یورپ کی اور امریکہ کی سرمایہ دار سلطنتوں سے تقسیم مالِ غنیمت پر لڑ رہا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ع

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور آج جب کہ جرمن ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ روس نے لی ہے۔ اسٹالن کے ارادے روز بروز بے نقاب ہو رہے ہیں اور حیرت زدہ انسان افسوس سے دیکھ رہا ہے۔ کہ سٹالن کے تمام دعاوی حریت و اخوتِ انسانی کے پرچار محض دھوکہ ہی دھوکہ تھے، ورنہ سٹالن بھی ملک گیری کی ہوس میں اپنے رفقائے جنگ سے پیچھے نہیں۔ اور انسان حسرت سے پکار اٹھتا ہے کہ انسان کی مساعی کا انجام خسر ہی خسر ہے۔

درحقیقت کارل مارکس کے نظام کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ اس نے پیٹ کے مسئلے کو انسان کی تمام مساعی کی اساس و محور ٹھیرایا ہے اور باقی سب مساعی کو اسکی فروع قرار دیکر روحانیت کی بنیادیں کھوکھلی کرنیکی کوشش کی لیکن اس کوشش میں خود اس نظام کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی ہیں کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان میں دو متوازی فطرتیں ہیں۔ روحانی اور مادی۔ جس طرح عیسائیت، بدھ مت اور ہندو مذہب نے انسان کی روحانی فطرت کو جلا دینے اور مادی کو پامال کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح بولشوزم اور کمیونزم انسان کی روحانی فطرت کو پامال اور فنا کر کے مادی فطرت کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے جو حشر عیسائیت اور دوسرے راہبانہ مذاہب کا ہوا ہے۔ وہی اس کا، انشاء اللہ، ہوتا نظر آتا ہے۔ ابھی یہ تجربہ بالکل نیا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق پیشین گوئی کرنا بے کار ہے۔ لیکن بظاہر تو یہی معلوم دیتا ہے کہ تاوقتیکہ بولشوزم روحانیت کے متعلق اپنا نظریہ تبدیل نہ کرلے۔ اس کا کامیاب ہونا مشکل نظر آرہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس لیے اس سورہ مبارکہ کا موضوع یہ ہے اور یہی قرآن کے دعوے کی تشریح بھی ہے کہ تاریخ عالم کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان نے جس قدر مساعی مرض خسران سے نجات پانے کی کیں اور جس قدر نسخے اس موذی مرض سے نجات کے تجویز کیے گئے وہ یا تو غیر مکمل تھے یا سخت مضر اور ہر حالت میں نجات پانے کے لیے ناکافی۔ اس لیے ضرورت تھی کہ رب الناس انسان کو اس مرض سے نجات کے صحیح راستے کی طرف رہنمائی فرماتا۔ چنانچہ یہ شرف قرآن حکیم ہی کیلئے مخصوص ہے کہ اس نے ابتدائے نزول سے ہی وہ نسخہ کیمیا بیان فرمایا۔ اور انسان کی تشنگی کے لیے آب حیات پیش کر دیا اور تصریح فرمادی کہ اگر وہ اس نسخہ کیمیا پر عمل کرے گا تو کبھی خاسر و ناکام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مسلمانوں کی اپنی تاریخ اس امر

کی زندہ شہادت ہے کہ جب تک انھوں نے اس نسخہ کیمیا پر عمل کیا۔ وہ دین و دنیا دونوں میں کامیاب رہے اور خسران ان کے قریب بھی نہ پھٹکا۔ حکومت نے ان کے قدم لیے۔ علوم و فنون، حکمت و فلسفہ نے ان کے پاؤں چومے، اقبال و دولت نے ان کی رکاب تھامی اور انھوں نے ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی نظیر اس سے پہلے موجود نہ تھی۔ یہ مسلمانوں کی بدبختی تھی کہ انھوں نے ایسے نسخے سے بے اعتنائی برتی اور ایسے کامل رہنما کو چھوڑ کر ہر کس و ناکس کی پیروی شروع کر دی۔ ہندو ویدانت، یونانی فلسفہ و قانون، عیسائی عقائد، مختلف راستوں سے اسلام میں آ داخل ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے علم و حکمت کی جگہ تقلید جامد اور آباء و اجداد پرستی نے لی، اور ان کے ساتھ ساتھ تجارت و دولت و سلطنت سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ اور شاید اس میں بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ آج مسلمانوں سے زیادہ سقیم الحال، فلاکت زدہ، ذلیل اور علوم و فنون سے عاری قوم جو خالق و مخلوق دونوں کی مبغوض ہو، شاید ہی کوئی ہوگی چنانچہ خود مسلمانوں کو بھی اپنی پستی کا احساس ہو چکا ہے۔ اور وہ بھی اپنے جمود کو حرکت سے بدلنے کے لیے کروٹیں لے رہیں اور ان میں مختلف تحریکوں کی ابتدا ہوئی۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں سے اکثر تحریکیں تو فنا ہو چکی ہیں اور بہت سی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مگر مسلمانوں کا جمود ان کی غفلت و بے حسی اب تک نہ صرف ویسی ہی ہے بلکہ ان کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ قوتِ عملی دن بدن فنا ہو رہی ہے۔ اور قوائے عملیہ رفتہ رفتہ شل ہو رہے ہیں۔ افراد پر اخلاقی موت طاری ہوتی جا رہی ہے۔ علم و دولت و ثروت اور تجارت دن بدن نابود ہو رہی ہیں۔ جرائم پیشہ افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، مگر افسوس کہ اصل علاج کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوتی۔

وان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ ‏ اگر تو نہیں جانتا تو یہ تو مصیبت ہی ہے۔ لیکن اگر

وان کُنْتَ تدری فالمصیبۃ اعظم: تو جانتا ہے اور جان بوجھ کر تغافل برتتا ہے تو مصیبت بہت ہی بڑی ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہم روزانہ اخباروں میں اشتہارات پڑھتے ہیں کہ فلاں دوا فلاں مرض کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے اتنے مریض شفایاب ہو چکے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرض کے بیمار اس اشتہار کو ابرِ رحمت سمجھ کر اس کی طرف دوڑتے ہیں اور اس دوا کو آزماتے ہیں۔ لیکن افسوس ہم مسلمانوں کی غفلت اور نادانی کہ ہم ہر روز اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس امر پر فخر تو کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم نے عرب کی مُردہ قوم کو زندہ کر دیا۔ قرآنِ حکیم نے درندوں کو غمخوارِ دوراں بنا دیا۔ قرآنِ حکیم نے عرب کے چوروں اور رہزنوں کو جہاں بانی کے قابل بنا دیا۔ قرآنِ حکیم نے ایک جاہل اور تقلیدِ اسلاف کی خوگر قوم کو علم و حکمت میں تمام دنیا کا امام و پیشوا بنایا۔ قرآنِ حکیم نے انسانی تمدن کا دھارا بدل کر ایسے تمدنِ جدید کی بنیاد ڈالی جس کے اتباع میں تمام عالم کی ترقی کا رُخ ہی بدل گیا۔ لیکن افسوس کہ ہمیں کبھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوجھتا کہ لاؤ اس نسخہ کو ہم بھی آزما کر دیکھیں۔ ہمارے شیوہ بیان واعظ اور خوش مقال مقرر اپنی محفلوں میں، مسجدوں میں، خانقاہوں میں بڑے بڑے بلند بانگ دعاوی کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم نے ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جس کی نظیر تاریخِ عالم میں ملنی محال ہے۔ لیکن افسوس کہ ان مدعیانِ حق سے کسی کے ذہن میں ایسی بات کبھی نہیں آتی کہ کیا قرآنِ حکیم کا اعجاز صرف عربوں کے لیے تھا اور کیا اب وہ مردہ اور ناقابلِ عمل کتاب ہے۔ نہیں۔ قرآنِ حکیم تو وہی ہے اور اس کی زندگی بخش تعلیمات بھی وہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

Marfat.com

يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (یونس ۵۷)

اے بنی نوعِ انسان! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس نصیحت آئی ہے جو سینے کے تمام (یعنی روحانی) امراض کے لیے شفاءِ کامل ہے، اور مومنوں کے لیے یہ ہدایت اور رحمت ہے۔"

افسوس ہماری عقلوں پر ہی پردہ پڑ چکا ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ

ہاں! آنکھیں تو اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں مخفی ہیں اندھے ہو جاتے ہیں۔

ہماری مثال بالکل یہود کی سی ہو گئی ہے جنکے بارے میں خدا تعالےٰ قرآنِ حکیم میں فرماتا ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (البقرہ)

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو؟ اور اپنے تئیں بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ پس کیا اتنی موٹی بات بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آتی کہ اصلاح کی ابتدا اپنے گھر سے ہونی چاہیئے۔"

پس مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے کہ ان سے زیادہ نادان اور عاقبت نااندیش اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اہلِ مغرب کی کورانہ تقلید میں سرگرداں ہیں۔

اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائیِ بت خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

یہ ظاہر ہے کہ جس نے خدائی رہنمائی سے انکار کر دیا (یعنی حق سے منہ موڑ لیا) اس کے لیے کیا رہ گیا، بجز اس کے کہ ٹامک ٹوئیے مارتا پھرے یہی وجہ ہے کہ ہماری کوئی کوشش مثمر نہیں ہوتی اور ہماری کوئی تحریک کماحقہٗ نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔

Marfat.com

قرآن کا نسخۂ کیمیا

امام دارالہجرۃ حضرت امام مالک ابن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

لَا یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الا ما صلح اولھا " — اس امت کا آخر بھی اس سے فلاح پاسکتا ہے جس سے اس کے اول نے فلاح پائی "

کیونکہ یہ امر تو ظاہر ہے کہ اگر ست گلو جالینوس کے زمانے میں تپ کے لیے مفید تھا تو اب بھی ویسا ہی مفید ہوگا۔ اگر کونین آج موسمی بخار یا ملیریا کے لیے حکمی علاج ہے تو ہزار سال پہلے ملیریا کے لیے ہی مفید ہوگی۔ مرورِ ایام سے ادویہ کی تاثیر بدل نہیں جاتی۔ نہ فطرتِ انسانی بدل سکتی ہے یہی حال روحانی امراض اور روحانی ادویہ کا ہے۔ اگر قرانِ اول نے قرآن کی رہ نمائی سے فلاح وسعادت اور عالم کی خلافت حاصل کی تو اب بھی جو قوم ان اصولوں پر عمل کرے گی جو قرآن حکیم نے فلاح و سعادت کے لیے مقرر کیے ہیں۔ انشاءاللہ وہ ضرور فلاح و بہبود سے ہمکنار ہوگی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس قدر تمسک بالکتاب والسنۃ مسلمانوں میں زیادہ تھا۔ اسی قدر اُن کا عُروج اور ترقی بھی عدیم النظیر تھے۔ اور جس قدر وہ ان سے دور ہوتے گئے اُسی قدر مغضوب ہوتے گئے اور دنیا میں جس جس قوم نے جس جس شعبۂ زندگی میں قرآن حکیم کے بتلائے ہوتے اصولوں پر عمل کیا ہے اس اس شعبۂ زندگی میں ان کی ترقی نمایاں رہی ہے۔ دراصل قرآنِ حکیم حقائقِ ابدی کو بے نقاب کرتا ہے اور جس طرح کوئی مادی ترقی یعنے مادّی فزیکل قوانین کی دانستہ یا نادانستہ اطاعت کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح کوئی اخلاقی ترقی (اور حکومت بھی اخلاقی ترقی

Marfat.com

کا ہی الزامی نتیجہ ہے۔ بغیر ان ابدی اخلاقی قوانین پر عمل کیے حاصل نہیں ہو سکتی جو فطرت میں جاری و ساری ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم خود بار بار اعلان کر رہا ہے کہ اس کی تعلیمات تمام نوعِ انسانی کے لیے ہیں۔ اِس میں عرب و عجم، مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اگر ایک جماعت جو اپنے تئیں غیر مسلم کہتی ہے۔ ان حقائق ابدی پر عمل کرتی ہے جو قرآن حکیم نے پیش کیے ہیں تو ناممکن ہے کہ وہ جہاں تک ان پر عمل پیرا ہے وہاں تک کامیاب نہ ہو اور اسی طرح وہ قومیں جو اپنے تئیں مسلم کہتی ہیں آخر اس کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر ان قوانین حقہ کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔ تو ناممکن ہے کہ وہ تباہ و برباد نہ ہوں۔ چنانچہ ایک آیت ہم اوپر پیش کر آئے ہیں:

یاایھا النّاس قد جاءتکم موعظۃٌ من ربّکمْ وَشفاءٌ لما فی الصدور وھدًی و رحمۃٌ للمومنین (یونس ۵۷)

اے بنی نوع انسان تمھارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آگئی ہے اور سینے کے امراض کے لیے اور مومنوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

وننزل من القرآن ما ھو شفاء ورحمۃٌ للمؤمنین وَلا یزید الظّٰلمین اِلّا خسارًا ۵ (بنی اسرائیل)

اور ہم قرآن میں سے جو کچھ اتارتے ہیں وہ مومنوں کے لیے (تمام روحانی امراض کی) شفا اور رحمت ہے اور جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں انھیں گھاٹے کی زیادتی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

گویا قرآن حکیم تمام بنی نوع انسان کی قومی بیماریوں کا حکمی علاج ہے۔ جو قوم بھی اس کے تجویزہ نسخوں پر عمل کرے گی شفا پائے گی۔ لیکن جو قوم اس پر ایمان لا کر اس پر عمل پیرا ہوگی۔ اس کے لیے وہ سرتاسر رحمت و ہدایت ثابت ہوگا۔ یعنی دین اور دنیا دونوں کی کامیابی یا بالفاظِ دیگر اس دنیا میں حکومت و سربلندی اور آخرت میں نجات و ثواب۔ پس ہم مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تباہی کا یہی علاج ہے۔ کہ ہم تمام انسانی

راستوں کو چھوڑ کر اسی حبل اللہ المتین کو مضبوطی سے تھام لیں اور اپنے روٹھے ہوئے خدا کو پھر سے منانے کی کوشش کریں۔ ورنہ ہماری سب مساعی اکارت جائینگی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا (الکہف ۱۰۲)	اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ ہم تمھیں سب سے زیادہ خسارے والے عمل کی خبر دیں۔ وہ (عمل ان لوگوں کا ہے) جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئیں اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔"

اسی لیے رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں کو وصیت فرمائی تھی کہ :

انی ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وسُنّتی

"میں تم میں ثقلین (دو وزنی چیزیں) چھوڑ رہا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور (اس پر عمل کرنے کیلئے) میرا طریقہ۔ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے۔ تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ تو گویا کتاب اللہ، ہدایت، شفا اور رحمت ہے۔"

بشرطیکہ اس پر اسی طرح عمل کیا جائے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو کر کے دکھلایا۔ اس لیے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے تنزّل کا علاج آگے بڑھنا نہیں پیچھے ہٹنا ہے۔ ان کو چاہیئے کہ چودہ سو سال پہلے کے تجویز شدہ نسخہ کو از سرِ نو آزمائیں اور انہی شروط و قیود کے ساتھ جیسا کہ طبیبِ حاذق نے حکم دیا تھا۔ یعنی وہ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول سے تمسک کریں۔ جب وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو مضبوطی سے تھام لیں گے تو وہ دنیا کی تقلید سے بے نیاز ہو جائیں گے بلکہ دنیا انکی تقلید کریگی۔ وہ تمام دنیا کے امام، سردار اور رہنما ہوں گے اور تمام دنیا ان کی عیال اور مقتدی۔ چنانچہ سورۃ العصر میں یہی دعوٰی کیا گیا ہے۔

Marfat.com

قرآن حکیم کی آخری سورتیں جوامع الکلم ہیں۔ ان میں نہایت مختصر الفاظ میں دریائے معانی بند کر دیا گیا ہے۔ ان میں ہدایتِ انسانی کے ایسے روشن چراغ موجود ہیں کہ وہ اکیلے بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ سورہ العصر کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

لو لم ینزل الا ھٰذہ السورۃ لکفت النّاس (تفسیر سورہ والعصر مفتی عبدہ)	اگر قرآن حکیم میں سوائے اس سورت کے اور کوئی سورت نازل نہ ہوتی تو بھی لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہوتی

پھر اس سورت کے مطالب عالیہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

فکر النّاس ھم فیھا لکفتھم (ایضًا)	اگر انسان سب کے سب اس سورۃ کے مطالب میں غور کرتے تو ان کی ہدایت کے لیے کافی ہو جاتی۔

مفتی عبدہ رحمۃ اللہ علیہ اس سورہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اگر ہم اس دورِ فتن میں اس سورت کے مطالب عالیہ میں تدبر و تفکر کرتے تو وہ ہمیں دوسرے راستے سے مستغنی کر دیتی:۔

چنانچہ مشہور و معروف اثر ہے کہ جب کبھی کبھی کوئی دو اصحاب رسول اللہ صلعم آپس میں ملتے تو جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو سورۃ والعصر سناتے پھر سلام کر کے رخصت ہوتے۔ اور یہ ان کا معمول تھا۔ بعض شارحین حدیث نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ وہ تو تبرکًا اور تیمنًا اسے پڑھتے تھے۔ لیکن میری ناقص رائے میں تو یہ صحیح نہیں۔ میری رائے میں اس کی تلاوت کی اصل وجہ یہ معلوم دیتی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں انسان کے دشمن ان کا حکمی اور ناقابل خطا علاج درج ہے۔ اور چونکہ رسول اللہ صلعم اپنے اصحاب کو آنے والے دورِ فتن سے مطلع فرما چکے تھے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے سے

Marfat.com

جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے کی توجہ اس نسخۂ کیمیا کی طرف مبذول فرمایا کرتے تھے جس کا یاد رکھنا آنے والے فتنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ حساب کے طالب علم پہاڑوں اور گردان کو روزانہ مستحضر کر لیتے ہیں۔ تاکہ حساب کے سوالات کے حل میں انھیں کوئی مشکل پیش نہ آئے اسی طرح اس سورۂ مبارکہ کے مطالب عالیہ قرآن کے لیے بمنزلہ گُر کے ہیں۔ اور کوئی قوم، جو اس گُر کو یاد رکھیگی اپنی مشکلات کے حل کرنے میں ٹھوکر نہیں کھا سکتی۔ گویا وہ ایک دوسرے کو سنا کر اتمام حجّت کرتے تھے۔ نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہوگی کہ اگر کسی کو احقاقِ حق میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہو جس سے اس کا بھائی ناواقف ہو تو وہ فوراً اسے تواصوا بالحق پر عمل کرتے ہوئے بتلادے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بالجملہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم کے زندہ معجزات میں سے ہے اور دنیا کی کوئی مذہبی کتاب، دنیا کا کوئی فلسفہ وحکمت ایسا معجزانہ نسخہ پیش نہیں کرسکتی۔ یہ دعویٰ قرآنِ حکیم کے اس دعوے کی زندہ شہادت ہے کہ

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظہیرًا۔ (بنی اسرائیل)

"اے پیغمبر، ان سے کہدو کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکھٹے ہو جائیں کہ قرآن کی مانند (دوسرا قرآن) بنا لائیں تو اس کی مانند نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں"

اس سورت میں اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو خسران کی مزمن بیماری کا کامل ومکمل علاج بتلایا ہے۔ قدیم مذاہب کے مجوزہ نسخوں کی تصحیح کی ہے اور مسلمانوں پر حجت قائم کردی ہے کہ ضلالت وخسران سے نہ نکلنے کا ان کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے۔ اور اب مسلمان اگر اس سورت کو حرزِ جان نہ بنائیں تو یہ ان کا اپنا قصورِ فہم اور بدبختی ہے۔

قرآن حکیم کی ایک خصوصیت ہے جو اسے دوسری الہامی تعلیمات سے ممتاز کرتی

Marfat.com

ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں کہیں اس نے بنی نوع انسان کے امراضِ مزمنہ میں سے کسی کا ذکر کیا ہے، وہیں کمال بلاغت سے اس مرض کے علاج کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور یہ اشارہ کہیں تو استشہاد کے طور پر اور کہیں قانونِ فطرت کے پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ یہاں خسران کے مرض کا علاج استثنا کے پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ انسان ہمیشہ خسران میں مبتلا رہا ہے۔ مگر اس عمومی تباہی سے صرف ایک جماعت مستثنیٰ رہی ہے۔ اور یہ جماعت وہ ہے جو ان چار اوصاف سے متصف ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ "وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالح کیے اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کی اور (راہِ حق میں شدائد کو برداشت کرنے کے لیے) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔"

گویا کامیاب جماعت کی چار خصوصیات ہیں:۔

(۱) ایمان۔ (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق۔ (۴) تواصی بالصبر۔

قرآن حکیم میں یہ انداز بیان کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ والتین میں تسفل سے بچنے کا علاج بھی استثنا کے پیرائے میں ارشاد ہوا ہے:

ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ "پھر ہم نے (انسان) کو سب سے نیچے گرادیا لیکن اس تسفل سے وہی لوگ محفوظ رہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔"

یہاں مردودین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "کہ ایمان لانے والے اور عمل صالح کرنے والے تسفل سے محفوظ رہ گئے۔" گویا تسفل کا علاج ایمان اور عمل صالح ہے۔ اسی طرح سورہ العصر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہی جماعت خسرے سے محفوظ رہے گی؟

Marfat.com

مندرجہ بالا چاروں صفات سے متصف ہو۔

یہاں بطور جملۂ معترضہ کے قرآنِ حکیم کے اس بلیغ فرق کی طرف اشارہ کر دینا چاہیئے کہ تسفل کا علاج تو صرف ایمان اور عمل صالح تجویز فرمایا ہے۔ لیکن خسر سے محفوظ رہنے کے لیے ایمان اور عمل صالح پر دو اور نہایت اہم خصوصیتوں کا ذکر فرمایا ہے فی الحقیقت ایسے اختلافات پر غور کرنے سے انسان کے لیے فہم و بصیرت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور قرآنی مصالح اور حکمتوں کے سمجھنے کی طرف رہ نمائی ہوتی ہے۔ تسفل دراصل انفرادی ترقی کی ضد ہے۔ سورۂ والتین میں انفرادی ترقی و تنزل کا بیان ہے، چنانچہ اس سورۃ میں انسان کے احسن تقویم پر پیدا کرنے کا ذکر ہے جو اس کی انفرادی فضیلت ہے یعنی بنی نوعِ انسان کا ہر فرد بلحاظ تخلیق احسنِ تقویم پر پیدا کیا گیا ہے۔ اسلیے تسفل جو اخلاقی ردگی ہے۔ انفرادی تنزل کی انتہائی صورت ہے کہ انسان اپنی خلقی شرف د مرتبت بھی کھو بیٹھے اس سے بچنے کا علاج صرف ایمان اور عمل صالح کو، جو انفرادی اعمال ہیں، تجویز فرمایا۔ اور سورۃ العصر میں قومی مرض خسران کا ذکر ہے، اس لیے اس کے علاج میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا اضافہ ایمان اور عمل صالح پر کیا۔ گویا اس عظیم الشان حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر بعض افراد اپنی اصلاح بھی کر لیں اور اپنے تئیں زیورِ ایمان و اعمال صالح سے آراستہ بھی کر لیں تو بھی وہ خسر سے نہیں بچ سکتے جب تک کہ وہ تواصی بالحق و تواصی بالصبر پر عمل پیرا ہو کر اپنی قوم کو خسران کے مرض سے بچانے کی کوشش نہ کریں۔ یا بالفاظِ دیگر صالحین کی اپنی صلاحیت ان کی قوم کے لیے کچھ بھی مفید نہیں تاوقتیکہ وہ اپنی قوم کے غیر صالح افراد کو دعوتِ صلاح نہ دیں، جسے یہاں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بالجملہ جب تک قوم کو دعوتِ حق نہیں دی جائے گی اور وہ من حیث القوم متبع حق نہ بن جائے خسر سے نجات محال ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

Marfat.com

اس نسخہ کی اہمیت کو کما حقّہٗ سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جس طرح دعوا۔

ان الانسان لفی خسر۔ تحقیق انسان (ہمیشہ) گھاٹے میں رہا۔

ایک عمومی دعوا ہے، اور وہ تمام اقوام عالم اور امم سابقہ و حاضرہ، آتیہ کو محیط ہے۔ اسی طرح یہ مجوزہ نسخہ بھی جس کا ذکر استثناء کے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ سب پچھلی اور موجودہ اور آنیوالی امتوں اور قوموں کے لیے یکساں مؤثر ہے اور اس دعوے اور اس مداوا میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی کوئی تخصیص نہیں۔ گویا اس سورت میں ایک ایسا قاعدۂ کلیہ بیان کیا گیا ہے، جو تمام بنی نوع انسان پر بلا قید مکان و زمان جاری و ساری ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ جس قرن جس عہد اور جس زمانے کے حالات کا تم مطالعہ کرو گے تم پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ اس جماعت کے سوا جسے مبدأ فیاض سے ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی توفیق مرحمت ہوئی ہو۔ سب جماعتیں خاسر و ناکام رہتی ہیں آئندہ بھی اس جماعت حقہ کے سوا باقی تمام جماعتیں خاسر و ناکام رہیں گی۔

دُنیا کی سیادت صرف مسلمانوں کا حق ہے

یہاں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ خسران کی انتہا کسی قوم کی سیادت کا چھن جانا اور فوز و فلاح کے معنی دنیا میں کسی قوم کی سیادت کا قیام و بقا ہے، کیونکہ قوموں کی جزا و سزا اسی دنیا میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اسی لیے تمام حکماء اور فلاسفہ جنھوں نے کوئی نسخہ بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے تجویز کیا ہے اس امر کو پیش کرتے ہیں کہ انکے مجوزہ نسخہ پر جو قوم عمل کرے گی وہی دنیا کی سرداری اور حکومت کی اہل ہوگی۔ اس طرح قرآن حکیم کا دعوا بھی یہی ہے کہ وہی قوم دنیا کی سرداری اور حکومت کی اہل ہوگی جس میں یہ چاروں صفات ہوں گی، یا بالفاظ دیگر جب اور جس وقت ایسی قوم معرضِ وجود میں آجائے گی۔ دنیا کی تمام طاقتیں اسکے سامنے سربسجود ہو جائیں گی۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

"محال عقل است کہ ہنرمنداں بمیرند و بے ہنراں جاے ایشاں بگیرند"

ترجمہ: یہ بات عقلاً محال ہے کہ ہنرمند سب کے سب مر جائیں اور بے ہنر ان کی جگہ لے لیں۔"

اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی ؞ مرے کلام پہ شاہد ہے کلمۂ لولاک

Marfat.com

قصہ مختصر، یہاں ایک اٹل قانون فطرت بتایا گیا ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں اخلاقی نظام قائم ہے اور حق و صداقت کی حکومت ہے یہ ممکن ہے کہ عارضی طور پر باطل کو فروغ ہو جائے اور بد عملی پھیل جائے لیکن یہ امر محالات میں سے ہے کہ حق و صداقت کی علمبردار جماعت کے مقابلے میں باطل اور اس کی تمام قوتیں ٹھیر سکیں۔ موخر الذکر فنا ہونے کے لیے اور اول الذکر قیام و دوام کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

جاء الحق وزھق الباطل ط ان الباطل کان زھوقا ہ (بنی اسرائیل)

حق آیا اور باطل فنا ہو گیا، باطل یقیناً فنا ہونے کے لیے آیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق (الانبیاء)

بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں پس وہ باطل کا بھیجا نکال کر رکھ دیتا ہے اور باطل پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

گویا یہ خداوندی قانون ہے کہ حق کے مقابلہ میں باطل اور اخلاق فاضلہ کے مقابلے میں بد اخلاقی کبھی بھی نہیں ٹھیر سکتی۔ یہ ایسا قانون قدرت ہے جس کی کوئی استثنا نہیں ہو سکتی۔ آسمان اپنی جگہ سے ٹل جائے زمین اپنا دور چھوڑ دے۔ پہاڑ ہل جائیں لیکن خدا کا یہ قانون کبھی نہیں ٹل سکتا، اسی کو خداوند تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سنت اللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا ہ

اور بد عملی کی تدبیر تو اپنے کرنے والے کو ہی تباہی کی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور یہ خدا کا اٹل قانون ہے) تو کبھی بھی خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔ اور تو خدا کے قانون میں کوئی تغیر

Marfat.com

نہیں پائے گا۔ قوموں کے عروج و زوال کے متعلق یہی سنت اللہ ہے اور یہی ایک قانون قدرت ہے۔ باقی سب ظنیات اور عقلی ڈھکوسلے ہیں۔ ظنون و اوہام ہیں۔

وما یتبع اکثرھم الا ظنا ط	اور ان میں سے اکثر تو صرف اٹکل کی
ان الظن لا یغنی من الحق	پیروی کرتے ہیں اور اٹکل حق کے مقابلے
شیئا۔ (یونس)	میں کچھ کام نہیں دیتا۔

انسان کے اپنی خود ساختہ توانین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان قوانین سے انکار فرماتا ہے۔

حق و صداقت کی قوت ایسی زبردست قوت ہے جس کے مقابلے میں باطل اپنے ساز و سامان کے باوجود، اپنی جمعیت و طاقت کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکتا۔ قصہ مختصر، حق و صداقت کا دامن چھوڑ کر کوئی قوم دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

فماذا بعد الحق الا	"تو پس حق کو چھوڑ کر سوائے گمراہی کے
الضلال ہ (یونس)	اور کیا حاصل ہو سکتا ہے"۔

یہاں گمراہی سے مراد انسان کی مساعی کا گمراہ اور بے نتیجہ ہو جانا ہے۔

اب آپ اس امر کو پیش نظر رکھ کر ذرا اس مختصر سے نسخے کی حقیقت پر غور کیجئے۔ تمام جہان کی سرداری کا نسخہ ان چار لفظوں میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس لیے حدیث شریف میں اس سورت کو جوامع الکلم میں شمار کیا گیا ہے۔ گویا کوزے میں دریا بند کر کے دکھلایا گیا ہے کہ دنیا کی سیادت کی اہل صرف وہ جماعت ہو سکتی ہے جس میں یہ چاروں صفات ہوں اور مسلمان اگر کامیاب ہونا اور دنیا کی سیادت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں انہی چاروں اوصاف سے متصف ہونا چاہیئے۔

سب سے پہلے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ اس آیت میں تمام صیغے جمع کے

Marfat.con

استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کا مفہوم (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) یہ ہے کہ کوئی شخص
بھی انفرادی کوشش سے مرضِ خسران سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ جب تک
جماعت من حیث الجماعت ان اوصاف سے متصف نہیں ہو جائے گی۔ وہ خسران کی
دلدل سے نہیں نکل سکتی۔ پھر یہ بھی ان چاروں اوصاف کا بیک وقت پایا جانا
ضروری ہے۔ ورنہ عمل خسران شروع ہو جائے گا۔ ہمارے بعض صوفیا کرام نے
اس لطیف نکتے کو نظر انداز کر دیا اور انفرادی تزکیہ پر اتنا زور دیا کہ جماعتی مفاد
نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی لیے، باوجودیکہ ہم میں ہر زمانے میں بڑے بڑے
صلحا گزرے ہیں، لیکن ہماری جماعت مرضِ خسران میں زیادہ ہی مبتلا ہوتی جا رہی ہے۔

ایمان کی تشریح

اب ہم اِن چاروں خصائص کی مختصر سی تشریح کریں گے۔ فی الحقیقت یہ چاروں اوصاف اسلام کی اصل و اساس ہیں اور قرآن حکیم میں جا بجا ان کی تفصیل و تشریح مذکور ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ایمان :۔ یہاں ایمان کا لفظ اپنے اساسی اور اجمالی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ سورہ مبارکہ آنحضرت صلعم کی بعثت کی بالکل ابتدائی سورتوں میں سے ہے اس لیے اس وقت تک نہ تو خود مسلمان، نہ دوسرے مخاطبین ایمان اور عمل صالح اپنے اساسی اور لغوی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اصلاحی معنوں میں نہیں۔ درحقیقت بدو شعور سے انسان میں اپنے سے برتر ہستی پر ایمان لانے کا عقیدہ اور عملِ صالح کا تصور موجود ہے اور جہاں تک ہمارا موجودہ علم تاریخ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اب تک کسی ایسے زمانے یا قوم کا وجود نہیں پایا جاتا جس میں ایسا مجمل ایمان اور خیر و شر میں امتیاز خواہ وہ دونوں تصورات کیسے ہی ابتدائی (Rudimentary) کیوں نہ رہے ہوں۔ یہ انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنے سے بالاتر ہستی کا سہارا پکڑے اور اپنے اعمال و افعال کے لیے ایک مثبت و منفی ضابطہ تیار کرے۔ یعنی فلاں قسم کے کام کرنے چاہئیں۔ وہ ممدوح ہیں۔ فلاں قسم کے کاموں سے احتراز لازم ہے۔ وہ مذموم ہیں۔ اسی لیے ابتدائی مکی سورتوں میں ایمان اور عمل صالح کو مجمل طور پر بیان کیا گیا۔ ان کی تشریح اور توضیح نہیں

کی گئی۔ مکی سورتوں میں صرف انہی امور کی توضیح ہے جس میں فساد رونما ہو چکا تھا۔

عرب کے دورِ جاہلیت کے اشعار کا مطالعہ بھی اس طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ کفارِ قریش بھی ایمان وعملِ صالح کے تصورات سے ناآشنا نہ تھے بلکہ دل میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ یہ دونوں امور مذہب کا جزوِ لاینفک ہیں لیکن موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی طرح وہ بھی انہیں اہوائے نفسانی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا چکے تھے۔ خودغرضی کی انتہا ہمیشہ خودفراموشی ہوا کرتی ہے اور خودفراموشی ہمیشہ انسان کی عقل وبصیرت پر پردہ کا کام دیتی ہے جس سے حقیقت مستور ہو جاتی ہے۔ اسلئے انہیں صرف متوجہ کر دینا ہی کافی خیال کیا گیا۔

چنانچہ سورۂ واللیل میں بھی یہی فرمایا:۔

وصدّق بالحسنیٰ   اس نے نیکی کی تصدیق کی۔

اور حسنیٰ کی تشریح نہیں فرمائی۔ کیونکہ مخاطبین جانتے تھے کہ الحسنیٰ سے مراد ایمان اور عمل صالح ہے اس لیے اس سورہ مبارکہ میں صرف امنوا و عملوا الصٰلحٰت پر اکتفا فرمایا۔ گویا کہ یہ دونوں ایسی حقیقتیں تھیں کہ انھیں یاد دلانے کے لیے صرف ان کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان اور عمل صالح کیونکر کسی جماعت کو مرضِ خسران سے نجات دلا سکتے ہیں۔ یہ بہت اہم سوال ہے۔ اور اس کا جواب ہم ذرا تفصیل سے دیں گے۔

سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔

ایمان:۔

اس ایقان ویقین کا نام ہے جو کسی کو اپنے معتقدات، سماج کے اپنے اخلاقی اصول اور اپنے معاشرے کی اساس کی صحت وصداقت پر ہوتا ہے اور اس

میں مومن وکافر دونوں شریک ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں کفار کے اس ایقان واذعان کو جو انہیں اپنے معتقدات کی صداقت پر ہے، ایمان سے ہی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

یومنون بالجبت والطاغوت　　وہ اپنے بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:۔

والذین آمنوا بالباطل وکفروا باللہ　　اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ
(العنکبوت)　　سے انکار کیا۔"

اس لیے یہاں ایمان سے مراد اس غیر متزلزل یقین سے ہے جو کسی انسان کو اپنے عقیدے کی صحت اور دوسروں کی غلطی کا ہوجاتا ہے اور وہ اس پر یہاں تک تخت ہوجاتا ہے کہ اس کی راہ میں تمام مخالفتوں کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے اور اپنے عقیدے کی اشاعت کے لیے ہر قسم کی قربانی اور مصائب و شدائد برداشت کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ وہ آگ میں گرنا پسند کرتا ہے، لیکن اپنے عقیدے یا خیال کو ترک کرنا پسند نہیں کرتا۔ عقیدے کی اس پختگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جو اس کے عقیدے کے قیام و ثبات اور اشاعت و غلبے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

ولکن من شرح بالکفر صدراً (النحل) "ہاں جسے کفر پر پورا پورا ایمان ہو اور وہ کفر میں انشراح صدر کے درجے تک پہنچ گیا ہو۔"

گویا جس طرح مسلمانوں کو ایمان کی پختگی سے انشراحِ صدر حاصل ہوتا ہے، یعنی ان سے بے اختیار ایسے اعمالِ حسنہ سرزد ہوتے ہیں جو مرضاتِ الہٰی کے حصول کے لیے ضروری ہوتے ہیں، اسی طرح کفار کو اپنے عقائد کی پختگی سے کفر کی تائید میں انشراح صدر حاصل

ہوجاتا ہے اور ان سے بے اختیار ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جو ان کے عقیدے کے شیوع کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

غالب نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے   مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ایمان کا یہ تصور تمام مذاہب اور فرقوں میں مشترک ہے اور اس کی تعبیر مختلف الفاظ سے کی گئی ہے۔ اسی کو اشخاص کی زندگی کے مدعا ونصب العین (Ideal) سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک ایسا شخص جس کی زندگی کا کوئی مدعا ونصب العین نہ ہو مذہب کی اصطلاح میں جوہرِ ایمان سے بالکل خالی ہے۔ اب انفرادی ایمان سے ترقی کر کے ہم جماعتی ایمان کی طرف آتے ہیں کیونکہ یہاں آمنوا کا صیغہ جمع کا صیغہ ہے یعنی وہ جماعت من حیث الجماعت ایمان کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے۔

فی الحقیقت جماعت کی نفسیات پر غور کرنے سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ کسی جماعت وجود میں آنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور لازمی امر وحدتِ خیال ہے۔ جب تک کسی جماعت کے افراد میں وحدتِ خیال پیدا نہ ہوجائے وہ ایک مربوط ومنظم جماعت نہیں بن سکتی۔ گویا مندرجہ بالا بیان سے ثابت ہوا کسی جماعت کی تشکیل اور قیام وثبات کے لیے ضروری ہے کہ اس جماعت کا من حیث الجماعت ایک مدعا ونصب العین آئیڈیل ہو اگر ایک مشترکہ آئیڈیل نہ ہو تو وہ جماعت نہیں کہلا سکتی۔ وہ ڈھوروں کا ایک گلہ ہے جو ہر ہنکانے والے کا ساتھ ہولیتا ہے۔ اس وحدتِ فکری یا مشترک قومی آئیڈیل کو شریعت کی اصطلاح میں ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قومی ایمان کی قوت انفرادی ایمان سے کہیں زیادہ بے پناہ اور ناقابل تسخیر ہوتی ہے۔ جب کسی قوم میں قوت ایمان پیدا ہوجاتی ہے تو اس میں خودبخود

Marfat.com

جماعتی اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اس آئیڈیل کے حصول کے لیے ہر ممکن قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور اس میں شجاعت و تہوّر، قربانی و ایثار کے نہایت عدیم المثال جوہر پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے نظائر بکثرت پائے جاتے ہیں کہ انسانی جماعتوں نے ایک غلط عقیدے پر بھی اپنا تمام مال و متاع، گھر بار، وطنِ مالوف، جان و مال یہاں تک کہ ناموس تک قربان کر دی ہیں۔ اسی ایمان کی بدولت ان میں ایسی قوتِ فعلیہ پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے ایسے حیرت انگیز کارہائے نمایاں سرزد ہوتے ہیں کہ دنیا انگشت بہ دنداں ہو جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی دو تین نہایت روشن مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی، جاپان کا شاہ پرستی کا نظریہ اور اسٹالن اور اس کا روس۔ تینوں ایمان بالکفر کی نہایت روشن مثالیں ہیں اور تینوں کی شجاعت و بسالت، حیرت انگیز ایثار و قدومیت، محیر العقول قربانی نے دوست و دشمن دونوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

ہٹلر کے عقائد کی بنیاد نیٹشے کے "سپرمین" فلسفے مافوق الانسانیت، پر تھی جس سے متعلق ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جرمن قوم "سپر مین" کی قوم ہے اور تمام دنیا کی حکومت کی حقدار اور اہل ہے۔ ہٹلر نے اپنے اس عقیدے کو اپنی مشہور کتاب (m.Ein Kampf) "میری جدوجہد" میں بڑے شدّ و مد سے پیش کیا ہے اور (Theory of nordic Descent) اپنا نظریہ "جرمن قوم کی نارڈک سلسلہ نسب" میں پیش کر کے یہ ادعا کیا کہ جرمن قوم حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے اور ایشیائی اقوام محکومی کے لیے۔ چنانچہ اس قوم نے اس کی صدا پر لبیک کہا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ کیسا حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا۔ وہی جرمن قوم جو ۱۹۳۲ء سے پہلے دیوالیہ ہو چکی تھی اور انتہائی تسفل کے گڑھے میں گر چکی تھی اچانک جوان

ہو گئی۔ وہی جرمن قوم جو شرم و ندامت اور اعترافِ شکست سے سر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اب غرور سے سر اونچا کر کے ساری دنیا کو چیلنج دینے لگی۔ جرمن نوجوان ہٹلر پر اور اسکے مشن پر صحیح معنوں میں ایمان لے آئے اور وہ جرمن قوم کی کھوئی ہوئی عظمت اور اقتدار کو بحال کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ جب جرمنی نے ۱۹۳۹ء میں یورپ پر حملہ کیا تو دنیا نے دیکھ لیا کہ قومی قوتِ ایمانی کے کیا کرشمے ہوتے ہیں؟ ہر سپاہی کی زبان پر (Heil Hitler) "ہٹلر کی جے" کا نعرہ ہوتا تھا۔ اور وہ خوشی سے جامِ شہادت نوش کرتا تھا۔ اس کے مقابلہ مقابلے میں اتحادیوں کا دامن متاعِ ایمان سے خالی تھا۔ اس لیے انھیں ہر میدان میں شکست ہوئی۔ بالآخر ہٹلر کی ٹکر سٹالن کی اشتمالی جماعت سے ہوئی۔ اور پہلی دفعہ ایمان کی ٹکر ایمان سے ہوئی اور وہ بے پناہ سیلاب جسے اتحادی نہ روک سکے تھے اور جوان کے لیے بمنزلہ کابوس کے ہو گیا تھا اس کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اس کی تربیت بھی لینن نے اور اس کے بعد سٹالن نے اس اصول پر کی تھی کہ ہمارا نظام اشتراکیت دنیا کا بہترین نظام ہے اور ہم کمیونسٹ (اشتراکی) ہی دنیا کی سیادت کریں گے اور بنی نوع انسان کو اس کے مزمن مرض خسران سے نجات دلا سکیں گے۔ چنانچہ جرمن اور روس کی لڑائی میں ایک قوی تر ایمان نے دوسرے ایمان کو شکست دی۔

علیٰ ہذا جاپان کی ابتدائی کامیابی اور بعد کے شدید مقابلے کا راز بھی ان کی اس عدیم المثال قوتِ ایمانی میں مضمر ہے اور اس بات کا ثبوت پیش کر رہی ہے کہ ایمان خواہ وہ بالکفر ہی کیوں نہ ہو جہت اَلمز اعمال کا محرک بن جاتا ہے۔ لیکن ایمان بالکفر صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب تک اس کے مقابلے میں ایمان باللہ نہیں آتا۔ جہاں ایمان باللہ مقابلے میں آیا۔ ایمان بالکفر اس طرح نیست و نابود ہو جاتا ہے

جس طرح آفتاب کے نکلنے سے شبِ دیجور کی تاریکیاں غائب ہو جاتی ہیں۔

چنداں بود کرشمہ و نازِ سہی قداں
کاید بہ جلوہ سروِ صنوبر خرامِ ما

جب ایمان باللہ ظاہر ہوتا ہے تو ایک ابراہیم (علیہ السلام) نمرود کی سلطنت کا مقابلہ کرتا ہے اور ایک موسیٰ (علیہ السلام) فرعون اور اس کے تمام جاہ و جلال کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے اور اس کو فنا کر دیتا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

ایمان باللہ مومنین میں ایسی بے پناہ قوت پیدا کر دیتا ہے اور ان میں کلمۃ اللہ کو سربلند و ممتاز کرنے کے لیے ایسا عزمِ راسخ پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوت ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ چنانچہ معرکہ بدر اور دوسرے معرکوں نے ثابت کر دیا کہ

کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت	اللہ کے حکم سے کتنی قلیل جماعتوں نے اپنے
فئۃً کثیرۃً باذن اللہ ۰ (البقرہ)	سے بہت بڑی جماعتوں کو شکست دی

جنگِ موتہ کے ذکر میں مورخین نے لکھا ہے کہ عیسائیوں نے ایک لشکرِ جرار تیار کیا جس میں تیس ہزار ایسے جانباز تھے جو انجیل پر حلف لے کر آئے تھے کہ مسلمانوں کو تہس نہس کر دیں گے اور میدانِ جنگ میں انھوں نے اپنے تئیں زنجیروں سے باندھ لیا تھا۔ آں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین ہزار مسلم مجاہدین کو حضرت زید بن حارثہ کی سیادت میں صرف تفتیشِ حالات کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ اگر لشکر زیادہ ہو تو واپس آجانا۔ اور اگر لڑائی ہو تو اس طرح کرنا۔ چنانچہ مسلم فدائیوں کا یہ لشکر

Marfat.com

جب موتہ کے مقام پر پہنچا تو انہیں معلوم ہوا کہ ایک لاکھ سے زیادہ عیسائی جمع ہیں۔ اب ایک طرف تو ایک لاکھ عیسائی جنگی ساز و سامان سے لیس۔ بہترین رومی ہتھیاروں سے مسلح، مسلمانوں کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف تین ہزار مجاہدین نیم مسلح لیکن ان میں سے ہر ایک شوقِ شہادت سے سرشار۔ جلدی سے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی گئی۔ اور یہ مسئلہ پیش ہوا کہ کیا واپس جاکر دربارِ رسالت میں مزید کمک کے لیے درخواست کی جائے۔ یا اسی وقت اس ٹڈی دَل لشکر کو دعوتِ مبارزت دی جائے۔ چنانچہ شوقِ شہادت کی جیت رہی اور سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ بازجیت کا انحصار تعداد کی کثرت وقت پر نہیں ہے۔ ہمیں لڑنا چاہیئے۔ اگر شہید ہوئے تو سیدھے جنت میں جوارِ رحمت الٰہی میں اور اگر زندہ رہے تو غازی۔

اب ذرا خیال کیجئے کہ مقابلہ کتنا غیر مساویانہ تھا۔ ایک طرف تو لاکھ سے زیادہ لشکرِ جرار، جن میں تیس ۳۰ ہزار یہودی انجیل پر حلف لے کر آئے تھے۔ دوسری طرف صرف تین ہزار نیم مسلح سرفروش مجاہدین سے آپ حیران ہوں گے کہ فتح کا سہرا مسلمانوں کے سر رہا۔ دشمنوں کے تیس ہزار سے زیادہ سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے اور باقی تتر بتر ہو کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں میں صرف نصف کے قریب مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ عیسائی مورخین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ "ایسی مجنونانہ بہادری کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں مل سکتی۔ لیکن درحقیقت یہ فتح مقامِ تعجب نہیں۔ بلکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو مقامِ تعجب ہوتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم	ہمت نہ ہارو اور غمگین نہ ہو۔ بے شک
الاعلون ان کنتم مومنین	تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم مومن ہو۔

Marfat.com

لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا ہ — "اللہ تعالیٰ کفار کو مومنین پر کبھی غلبہ نہیں دیتا۔"

کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی ان اللہ قوی عزیز — "اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہوں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست غالب ہے۔"

یہ خدائی وعدے ہیں۔ مگر ان میں غلبے کی پیروی کی بڑی کڑی شرط ہے۔ اور وہ "ایمان" کی ہے سو ان آیات سے معلوم ہوا کہ خدا کے وعدے تو برحق ہیں۔ ہم جوہر ایمان سے خالی ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یہ خیال کرنا کہ تائیدِ غیبی کے جس قدر وعدے تھے وہ سب آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام پر ختم ہو گئے۔ قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم کی تکذیب کے مترادف ہے۔ وہ وعدے آج بھی قائم ہیں۔ ہم میں قوتِ ایمانی کی موجودگی شرط ہے۔ اقبال نے اس نکتے کو بیان کیا ہے ؎

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
پھر بھی درختِ طور سے آتی ہے صدائے لاتخف

پس اس سے ثابت ہوا کہ ایمان ہر کامیابی کی مفتاح ہے اور ایمان ہی کامرانی کی کلید ہے۔ صرف دولتِ ایمان سے ہی فلاح و سعادتِ دارین کی راہیں کھلتی ہیں۔ کفر و اسلام میں جو تنازع (struggle for existence) ازل سے جاری ہے اس میں کامیابی کا دارومدار صرف قوتِ ایمانیہ پر ہے۔ یہاں استطراداً اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ جب بھی مسلمانوں کی قوتِ ایمانیہ کمزور ہو جاتی ہے تو عارضی طور پر باطل کو فروغ ہو جاتا ہے

لیکن سچے عقیدے اور جھوٹے عقیدے میں ہمیشہ یہ امتیاز رہتا ہے کہ سچے عقیدے کے لیے جو قربانی دی جاتی ہے وہ ہمیشہ نیک ثمرات پیدا کرتی ہے۔ برعکس اس کے غلط عقیدے پر جو قربانی کی جاتی ہے وہ ممکن ہے کہ عارضی طور پر مثمر ہو لیکن اس کا پھل مرجھا جاتا ہے اور حبطت اعمالھم کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

قصہ مختصر جس طرح افراد میں ایمان ہی تمام اعمال حسنہ کی جڑ ہے۔ اور بغیر صحیح ایمان کے نہ صرف کوئی نیکی یا عمل صالح مقبول نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقی اور سچی نیکی ایمان کے بیج کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح تمام قوموں کے اجتماعی اعمال کی جڑ بھی قومی ایمان ہے۔ جب کسی قوم کو خدا کی طرف سے صحیح اجتماعی نعمت عطا ہو جاتی ہے۔ تو غیر متزلزل عزم کی مالک اور عدیم المثال قربانیوں کا پیکر بن جاتی ہے۔ چنانچہ کارل مارکس اپنے مذہب (کمیونزم) کی کامیابی کے بارے میں لکھتا ہے کہ۔

"ہمیں اپنے مقصد کی صداقت اور کامیابی پر ایک غیر متزلزل یقین اور ناقابل تسخیر ایمان ہونا چاہیئے اور یہی ایمان (Faith) ہماری کامیابی کا ضامن ہوگا اور واقعی لینن کی کامیابی اور اب سب سے آخر سٹالن کی کامیابی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ ایمان خواہ وہ ایمان بالباطل ہی کیوں نہ ہو، انسانی مساعی کا کس قدر زبردست ضامن ہے۔ مولانا روم اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر | گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
ہر چہ گیرد علتی، علت شود | کفر گیرد کاملے ملت شود

موجودہ مسلمانوں کے ایمان کی حقیقت

مسلمان بھی ہر وقت "ایمان، ایمان" پکارتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے ایمان اور حقیقی ایمان میں سوائے مجالستِ لفظی کے اور کوئی چیز مشترک نہیں جس طرح شِیر اور شِیر (دودھ) میں صرف ش۔ ی۔ اور۔ ر۔ کے تینوں حرف ہیں۔ مگر اس اشتراک سے شیر، شِیر (دودھ) نہیں بن سکتا، اسی طرح مولانا فرماتے ہیں کہ یہ اگر کوئی شخص علتی ہے۔ یعنی اس کا قلب صحیح ایمان سے خالی ہے اور اس دل میں نفاق کا روگ پرورش پا رہا ہے اور اسے خود اپنے معتقدات کی صحت پر یقین نہیں ہے تو اسے اگر قرآن حکیم جیسی کتاب اور حضرت سرورِ عالم صلعم جیسا ہادیٔ برحق بھی ملجائے تو سوائے علت یعنی روگ اور بیماری کے کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے برعکس اگر ایک کامل الایمان شخص کفر کو اختیار کرے گا تو وہ اسے بھی ایک ملت بنا دیگا چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ کیونکر قرآن حکیم آج مسلمانوں اور بالخصوص علماء کے ہاتھوں میں کفر تکفیر، تشتت وافتراق، اکل اموال بالباطل کا آلہ بن گیا ہے اور ایک کارل مارکس یا لینن یا سٹالن کے ہاتھوں کمیونزم کس درجہ کامیاب ہوتا ہے اور تشتت اور افتراق کو دور کر کے قومیت متحدہ کو استوار کر دیتا ہے۔ تو د مسلمانوں میں کمال اتاترک نے جب علماء کے ہاتھوں تنگ آ کر اسلامی اثرات کو ملک بدر کر دیا۔ اور تمام قبروں اور اوقاف پر قبضہ کر کے پیروں اور مشائخ کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا تو ترکی مریضِ ناتوان زندہ ہو کر از سرِ نو ایک ملت کامِلہ بن گیا۔

Marfat.com

فی الجملہ مسلمانوں کے امراض کا واحد علاج صحیح اور سچا ایمان ہے اور چونکہ ان کا ایمان کمزور ہے اور جماعتی ایمان تو سرے سے مفقود ہی ہو چکا ہے اس لیے انفرادی حسنات بھی ان میں مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جماعتی حسنات تو بالکل ہی نہیں۔

ہمیں شرم و خجالت سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آج قومی مفاد ملی مفاد اور مذہبی مفاد سے غداری اور ملت فروشی مسلمان کا طغرۂ امتیاز بن چکا ہے۔

دراصل جب ہماری اساس ہی کمزور ہو چکی ہو تو برگ و بار تو خود ہی قبل از وقت جھڑ جائیں گے۔ بلکہ جس درخت کی جڑ ہی کمزور ہو گئی ہو۔ وہ کبھی برگ و بار لا ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح جس شخص کا ایمان کمزور ہو اس کے اعمال کبھی بھی مثمر ثمرات حسنہ نہیں ہو سکتے۔ آج مسلمان ہر اونچی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور ہر مدعی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں تو کبھی پرانے صوفیوں کی تقلید میں اور پیروں فقیروں کے پیچھے دوڑتے ہیں تو کبھی مغربی اقوام کی تقلید میں۔ اور ہمسایہ اقوام کی نقالی میں سرگرم نظر آتے ہیں لیکن خدا نے حی و قیوم کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ آؤ کہ ہم پہلے اپنے ایمانوں کا جائزہ لیں اور کفر و نفاق، ملت فروشی اور اسلام سے غداری کے خفیہ جراثیم کو نکال باہر کریں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ہم میں بھی وہی بے پناہ قوت پیدا ہو جائے گی جو قرن اولی کے مسلمانوں میں تھی اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے وعدے اسی طرح پورے ہوتے دیکھیں گے جس طرح کہ ان بدوؤں پر ہوئے تھے۔ اس لیے اگر ہمارا پہلا قدم صحیح اور سچے ایمان باللہ کے لیے اٹھے گا تو آپ یقین کیجیے کہ دوسرا قدم تخت شاہی پر ہو گا۔ تمام دنیا کی سیادت ہمارے حصے میں آئے گی

بہشت عدن اگر خواہی بیا با ما بہ میخانہ
کہ از پائے خمت یکسر بہ حوض کوثر اندازیم

Marfat.com

دُنیا کے مصائب کا واحد علاج

آج دنیا ایک عجیب تلاطم انگیز دور سے گزر رہی ہے اور دنیا کی قسمتوں کی باگ اسٹالن اٹلی اور ٹرومین کے ہاتھوں میں آچکی ہے ستم رسیدہ دنیا کو ان لوگوں نے سینکڑوں سبز باغ دکھا دیئے اور آزادی اور اُخوت و مساوات کے وعدوں سے بنی نوعِ انسان کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے مگر ان سب کی مثال یہی ہے:

اذا کان الغراب دلیلِ قوم　　　سیهدیهم طریق الهالکینا

"جب کوا کسی قوم کا رہبر بن جائے تو وہ اسے تباہی کے گڑھے میں دھکیل کر لے جائیگا"

دنیا کے موجود مرض کا علاج یہ نہیں ہے کہ اس کا نظام جمہوری سرمایہ داری یا کمیونسٹ ہونا چاہیئے۔ بلکہ دنیا کا اصل مرض یہی ہے کہ اس نے خدا کے قانون کو چھوڑ کر بندوں کے قانون کی متابعت شروع کر دی ہے۔ اس لیے اب سوال یہی ہے کہ دنیا میں حاکمیت خدا کی ہوگی۔ یا سٹالن کی۔ یا ایٹلی یا ٹرومین کی۔ اگر دنیا نے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور انسانوں کی تجویز کردہ راہوں کو چھوڑ کر خدا کے قانون کی متابعت کا عہد کر لیا تو یقیناً دنیا جنتِ ارضی بن جائے گی اور بنی نوع انسان اخوت و مساوات اور صحیح حرّیت سے ہم کنار ہو جائیں گے، کالے اور گورے کے تمام امتیازات مٹ جائیں گے۔ اور کوئی قوم دوسری قوم کو غلام بنانے کی کوشش نہیں کریگی بلکہ سب قومیں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی دست و بازو بن جائیں گی۔ موجودہ

Marfat.com

تجارتی مسابقت کی جگہ مسابقت فی الحسنات کا دور دورہ ہوگا۔ اور ہر قوم اس کوشش میں سرگرم ہو جائے گی کہ کون بنی نوع انسان کی سب سے زیادہ خدمت کرتی ہے۔ لیکن پھر اگر وہی انسانی قوانین پر ہی گم کردہ راہ انسانیت نے اصرار کر لیا تو پھر وہی مسابقت، منافرت، وہی خون آشامی، وہی حرص و آز دنیا میں پھیل جائیں گے۔ اور پھر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ، یہاں تک کہ ایک اور لڑائی اور اس کے بعد ایک اور لڑائی ہوتی رہے گی۔ یہاں تک کہ یا تو بنی نوع انسان ہلاک ہو جائے گی یا پھر بھول بھٹک کر خدا کے قانون کی ماتحتی اختیار کرے گی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ مگر افسوس کہ جہاں ہم دنیا میں انسانی قوانین کی طرف بلانے والے کا شمار ہی نہیں کر سکتے وہاں خدا کے قانون کی طرف بلانے والی ایک ہی جماعت خود خواب خرگوش میں مبتلا ہی نہیں بلکہ ایمان فروشی کر کے خود انسانی قوانین کی تائید پر فخر کر رہے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

مرزا غلام احمد قادیانی نے اعلیٰ حضرت امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم کی خدمت میں ایک نہایت عمدہ مطلا سنہری دعوت نامہ کتابی صورت میں چھپوا کر اور جلد کروا کر بھیجا۔ امیر صاحب نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری مرزا سلطان احمد سے پوچھا کہ "یہ کیا ہے؟"

انھوں نے عرض کیا کہ "ہندوستان میں ایک متنبی پیدا ہوا ہے جس نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔"

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ "کتاب مجھے دو۔"

سکریٹری نے کتاب اعلیٰ حضرت کے حوالے کر دی۔ کتاب کھول کر اعلیٰ حضرت

Marfat.com

نے بغیر پڑھے اس پر لکھدیا۔

"مارا مسیح درکار نیست۔ عمر بکار است۔"

اور کتاب مرزا غلام احمد کو واپس بھیج دی۔ سو امیر مرحوم نے ہمارے مرض کا صحیح علاج تجویز کیا تھا۔ ہمیں آج مسیح کی ضرورت نہیں، ہمیں صدیقِ اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ایمان کی ضرورت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو اور تم اُس پہاڑ کو جو تمھارے سامنے کھڑا ہے اپنی طرف بلاؤ تو وہ اپنی جگہ سے ہل کر تمھارے پاس آجائے گا۔" تو اس سے مُراد بھی وہی صدیقی اور فاروقی ایمان ہے۔ فہل من مدکر۔

عملِ صالح کی حقیقت

عمل صالح، ایمان اور عمل میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایک کا وجود دوسرے کو متلزم ہے۔ یا یوں کہئے کہ ایمان اور عمل صالح کی مثال روح اور جسم کی ہے جس طرح جسم روح کے بغیر مردہ اور لاشئی محض ہے۔ اسی طرح عمل بغیر صحیح ایمان کے افسردہ اور غیر مثمر ہوگا۔ اور جس طرح روح بغیر جسم کے قائم نہیں رہ سکتی اور نہ اپنے وجود پر کوئی حجت قائم کر سکتی ہے اسی طرح ایمان بغیر عمل صالح کے ایک غیر محقق چیز ہے جو بالکل بے کار ہے۔ نفسیات کی رُو سے بھی ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ علم النفس کی رُو سے انسانی اعمال کی صحت کے لیے اخلاص قلبی، عزم صمیم اور صحت نیت کا ہونا ضروری ہے اور قلبی اخلاص، صحت نیت اور عزم صمیم کے بغیر صحیح ایمان پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں موقع تفصیل کا نہیں ورنہ ہم اس بحث کو مفصل بیان کرتے۔ قصہ مختصر ایمان اور عملِ صالح کا وجود ایک دوسرے کے بغیر تصور میں ہی نہیں آ سکتا۔ اعمال صالح شجرہ ایمان کے ثمرات ہیں اور چونکہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے صحت ایمان کی شناخت اعمال صالحہ اور صرف اعمال صالحہ سے ہوگی گویا انسان میں جس قدر صحت عمل زیادہ ہوگی اسی قدر اس کا ایمان بھی زیادہ مضبوط اور استوار ہوگا۔ گویا انسان کے اعمال صالحہ اس کے ایمان کے لیے بمنزلہ ترازو یا کسوٹی کے ہیں۔

بالجملہ ایمان و عمل صالح کا لزوم ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی صاحب بصیرت کو انکار نہیں ہو سکتا مگر مقام تعجب ہے کہ یہ اہم حقیقت

اسلام سے پہلے بالکل مستور ہو چکی تھی اور اس کی وجہ سے بہت سے مفاسد رونما ہو چکے تھے۔ خود اربابِ مذہب اس بارے میں مختلف تھے۔ یہودی مذہب میں تو ایمان کا صحیح مفہوم قریباً مفقود ہے۔ عیسائی مذہب میں اعمالِ صالحہ بالکل غیر ضروری ہیں۔ چنانچہ کفارے کے عقیدے کی بنیاد ہی یہی تصور ہے۔ کہ نجات کے لیے صرف یسوع مسیح کے صلیب پر سولی پانے کا اعتقاد کافی ہے۔ عیسائی یہ یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ان کے گناہوں کے کفارے میں مصلوب ہوئے اور اپنی اُمّت کے گناہ بخشوا گئے۔ چنانچہ انجیل میں ہے "میں ہی مبدا ہوں اور میں ہی معاد ہوں۔ جو کوئی مجھ پر ایمان رکھے گا، ہلاک نہیں ہو گا۔"

یعنی نجات کے لیے صرف ایمان کافی ہے۔ بلکہ اعمالِ صالح ضروری نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ہندو مذہب اور بدھ مت اور پارسی مذہب میں بھی ایمان اور عمل صالح کے لزوم عقلی کا تصور مفقود ہے۔ اس لغزش نے تمام مذاہبِ عالم میں نہایت گھناؤنے مفاسد پیدا کر دیئے تھے۔ سب سے بڑا فساد تو یہی تھا کہ مذہب ایک غیر فطری چیز متصوّر ہونے لگا تھا اور اکثر مذہبی آدمی انسان کے فطری جذبات کو فنا کرنا مذہبی کمال کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے فطرتِ سلیم اور مذہب میں کشمکش شروع ہو گئی، لیکن اس کی اصلی وجہ یہی تھی۔ کہ چونکہ انسان کی فطرتِ سلیم کا تقاضہ یہ تھا کہ ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہوں، اس لیے فطرتِ سلیم ایسے مذاہب کو قبول کرنے سے انکار کرتی تھی جو ان دونوں میں تفریق کرتے تھے۔ یہ شرف اسلام کیلئے ہی مخصوص تھا کہ اس نے انسانی فطرت اور مذہب کی جنگ کا خاتمہ کر دیا اور اعلان کر دیا کہ ایمان اور عملِ صالح غیر منفک ہیں اس لیے اس نے ذاتی اصلاح اور دنیوی فلاح کے لیے ایمان اور عمل صالح کا اکٹھا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ   بالیقین جو لوگ ایمان لائے اور ان کے عمل بھی نیک تھے

Marfat.com

كانت لهم جنت الفردوس نزلًا (الكہف)

ان کے لیے ہمیشگی کے باغوں میں مہمانی ہوگی۔"

بلیٰ من اسلم وجهه لله وهو محسن۔

"ہاں جس نے اللہ کے سامنے سر جھکا دیا اور وہ نیکوکار بھی تھا۔"

پھر ایمان کی صداقت کی نشانی اعمال صالحہ کو قرار دیا۔

انما المومنون الذين امنوا بالله ورسوله ثم لم يرتابوا وجاهدوا باموالهم وانفسهم في سبيل الله اولئك هم الصادقون ٥

مومن تو صرف وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر وہ متزلزل نہیں ہوئے اور انھوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے جہاد کیا وہی لوگ اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔"

گویا وہ ایمان جس کے بغیر کوئی مسلم مومن کہلانے کے قابل نہیں ہو سکتا اور خسر سے محفوظ نہیں رہ سکتا محض تقلیدی ایمان نہیں ہے چونکہ ہم مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے مومن و مسلم ہیں اور نہ وہ رسمی اقرار باللسان کا نام ہے۔ بلکہ حقیقی اور سچا ایمان وہی ہے جس کے ثمرات اعمال صالح ہیں اور ان میں سے بالخصوص مالی اور جانی جہاد فی سبیل اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے صاف اور صریح الفاظ میں فرما دیا کہ جو شخص ایمان اقرار کے ساتھ اعمال صالح بالخصوص جہاد فی سبیل اللہ نہیں کرتا۔ وہ وہ اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

Marfat.com

خواجہ حافظ نے بھی اِس مضمون کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے ۔

ترکِ جان و ترکِ مال و ترکِ سر
در طریقِ عشق اول منزل است

ایمان کی ابتداء تو کلمۂ شہادت

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ

سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چُھری اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن میں ہوتی ہے ۔

در مدرسہ کس را نرسد دعوی توحید
منزل گہِ مردانِ مؤحد سرِ دار است

گویا قرآن شریف نے خسران سے نجات پانے کے لیے جو چار خواص بتلائے ہیں ان میں سے صرف ایمان و عمل بلکہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر یعنی چاروں لازم و ملزوم ہیں ۔ یعنے قومیّتِ متحدہ یا انسانیتِ کبریٰ کی اصل و اساس ایمان ہے ۔ اعمال صالح بمنزلہ برگ و بار ہیں اور تواصی بالحق و تواصی بالصبر ان اعمال صالح کی تکمیل کرتے ہیں اور اسکے ثمرات اس دنیا میں سیادت اور رضوانِ الٰہی اور آخرت میں فوزِ عظیم ۔ عقلاً بھی اگر دیکھا جائے تو جب تک کوئی انسان خود ایمان اور عمل صالح کے زیور سے آراستہ نہیں ہوگا ۔ وہ تواصی بالحق کر ہی نہیں سکتا ۔ کیونکہ ؎

کو خویشتن گم است کرا رہبری کند

اور جب وہ تواصی بالحق کے لیے کھڑا ہوگا تو لوگ اسے حضرت عیسٰی کی زبان میں کہیں گے Phy sician ! Real they sels

حضرتِ ناصح! ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے۔ اور جب تواصی بالحق نہ ہوا تو اصی بالصبر کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔

آمدیم برسرِ مطلب۔ جس طرح ایمان اپنے مجمل معنوں میں مستعمل ہوا ہے اسی طرح عملِ صالح بھی اپنے لغوی اور عمومی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ شرعی اور اصطلاحی معنوں میں نہیں ہوا۔ مفتی عبدہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر سورۃ والعصر میں لکھتے ہیں۔

"سورہ والعصر میں جس ایمان کا ذکر ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام اقوامِ عالم کے لیے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم خطِ مشترک ہے اور اس یقین اور فطری اذعان سے عبارت ہے جو انسان کے سامنے ایک مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہوں۔ اسی لیے اعمالِ صالحہ سے مراد یہاں وہ اعمال ہیں۔ جو تمام بنی نوعِ انسان میں مسلم ہیں۔ اور ذوقِ سلیم اور طبیعت مستقیم (عام اس سے کہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) ان کی طرف راغب ہوتی ہے۔ مثلاً عبادت و شکر، حصولِ مقصد کے لیے ہر طرح کی مالی اور جانی قربانی دینا۔ مظلوم کو ظلم سے بچانے کی کوشش کرنا۔ فصلِ خصومات میں، مقدمات میں قیامِ عدل وغیر ذالک۔ اسی لیے قرآن حکیم نے ان تمام اعمال کو معروف سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا یہ ہر قوم و ملت ہر ملک اور مذہب میں مسلم اور مشہور ہیں اور ان کی اضداد کو منکر سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی جسے اربابِ عقلِ سلیم یا بالفاظِ دیگر تمام صحیح الدماغ انسان مکروہ سمجھتے ہیں اور ناآشنا رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔" انتہیٰ کلام ملخصاً۔

Marfat.com

درحقیقت اگر انسانی فطرت اور تاریخ پر غور کیا جائے تو جس طرح کوئی قوم اور جماعت اساسی معتقدات یعنی ایمان سے خالی نہیں ہوتی، اسی طرح ہر قوم اور جماعت میں تاریخ کے ہر زمانے میں عمل صالح کا تصور موجود رہا ہے۔ اور جیسا کہ مفتی عبدہ رح نے فرمایا ہے،

" کہ قرآن حکیم نے جو الفاظ ان اساسی معتقدات اور عوامل کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں وہ صرف گنجینۂ معنی کا ایک طلسم ہیں، بلکہ وہ ان کی حقیقت پر نئے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں اور ان کی بہترین مثال وہ ہے جو انھوں نے بیان فرمائی۔ یعنی اعمالِ صالح کو معروف سے اور اعمالِ غیر صالحہ کو منکر سے تعبیر فرمانا۔ ان دو الفاظ نے نیک و بد کے مفہوم پر نئی روشنی ڈالی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں گزری اور نہ اب موجود ہے جس میں معروف و منکر متعین نہ ہوں۔ انگریزی میں انہیں (DO AND DONTS) کہتے ہیں۔ ہر ایک کا ایک ضابطہ ہوتا ہے۔ ایک کوڈ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ چوروں اور ڈاکوؤں اور جواریوں کا بھی ایک کوڈ آف آنر (CODE OF HONOUR) ہوتا ہے۔

قصہ مختصر، یہاں اعمالِ صالحہ سے مراد خاص شرعی اعمال نہیں ہیں، بلکہ وہ اعمال جنھیں ہر قوم و ملت میں، ہر ملک و جماعت میں ممدوح قرار دیا گیا ہے۔ اور وہ کیا ہیں، سب سے پہلے تو اپنے جماعتی مقصد یعنی آئیڈیل کے لیے اپنے جماعتی مفاد کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنا حتی کہ اگر انتہائی قربانی یعنی اپنی جان کی یا اپنی اولاد کی ضرورت درپیش ہو۔ تو اس سے دریغ نہ کرنا ایمان کا لازمی خاصہ ہے کہ وہ اپنے قائلین اور معتقدین میں انتہائی ایثار کا یہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تمام اعمالِ صالحہ جو بالعموم ممدوح خیال کیئے جاتے، اس لفظ میں شامل ہیں۔

Marfat.com

چنانچہ بت پرستوں سے لے کر جملہ پیروانِ مذاہب عالم تک میں غداری، ملت فروشی، خیانت، دروغ گوئی اور اس کے تمام متعلقات سب قبیح و مذموم خیال کیے جاتے ہیں اور راست بازی، امانت، پاسِ عہد، حُبِّ قومی اور دوسرے ایسے ہی اعمال محمود خیال کیے جاتے ہیں. گویا اگر ہم ذرا غور سے کام لینگے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اعمال صالحہ کی مقبولیت کا انحصار انکے قوم یا جماعت کیلئے مفید ہونے پر ہے۔ یعنے جو عمل قوم یا جماعت کیلئے سب سے زیادہ مفید اور نافع ہو وہ سب سے زیادہ ممدوح سمجھا جاتا ہے۔ فالامثل۔ فالامثل۔ گویا عمل صالح یا معروف میں بھی تدریج ہے۔ اور وہ جماعتی مفاد پر مبنی ہے۔ جس طرح فرد کی بقار توالد و تناسل پر مبنی ہے۔ اسی طرح جماعت کا قیام اور بقا اسکے افراد کے جذبۂ ایثار پر مبنی ہے۔ گویا سب سے بڑا عمل صالح جماعت پر تن من دھن قربان کرنا ہے۔ اسی لیے اسے قرآن حکیم نے شہادت یعنی اپنے ایمان کی گواہی اپنے خون سے دینی، سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور شہادت کا اجر اس قدر عظیم ہے کہ خود حضرت سرورِ عالم نے فرمایا:

"میں چاہتا ہوں کہ لڑوں اور شہید ہو جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں، پھر لڑوں اور شہید ہو جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر لڑوں اور شہید ہو جاؤں"

او کما قال صلعم۔

اس کے بعد درجہ بدرجہ تمام اعمال جن پر جماعتی فلاح و بہبود کا انحصار ہے شامل ہیں۔ مثلاً یتیموں اور بیواؤں کی خبرگیری کرنا۔ ہمسایوں کے حقوق، احسان کا بدلہ احسان سے دینا۔ والدین اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی وغیرہ وغیرہ

گویا قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں صرف وہی جماعت دنیوی خسران سے نجات پا سکتی ہے جس کے ہاتھ میں ایمان باللہ کی مضبوط رسی ہو اور جو اعمال

Marfat.com

صالحہ سے مزیّن ہو۔ یا بالفاظِ دیگر خدا پرا سے اٹل ایمان ہو اور جماعتی تفوّق پر کامل یقین ہو۔ اور اس تفوّق کے حصول کے لیے ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی کے لیے تیار ہو۔

حکیم سیہانئوزا لکھتا ہے۔

"الہامی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا سے انسان کو ایسی غیر مشروط محبت ہو کہ وہ اسے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہو جائے وہ محبت کسی خوف یا امیدِ انعام پر مبنی نہ ہو۔ بلکہ محض اس لیے کہ وہ خدا ہے اور ہم بندے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا اصول یہ ہے کہ جس طرح خدا رحم و انصاف کا مجسمہ ہے اسی طرح ہم بھی اسکے بندوں کے لیے رحم و انصافِ مجسم بن جائیں۔ ہمسایوں سے فیّاضی اور محبت کا برتاؤ کریں۔"

ہم بندوں کے لیے مجسم رحم و انصاف کیونکر بن سکتے ہیں؟

ہم بندوں کے لیے مجسّم رحم وانصاف کیونکر بن سکتے ہیں؟

وہ یوں کہ بندوں پر خدا کی حکومت قائم کریں اور انھیں انسانی تراشیدہ قانون کے مظالم سے نجات دلائیں۔ گویا سب سے بڑا عمل صالح یہ ہے کہ خدا کی حکومت کے قیام کے لیے یا اسلام کے تفوّق کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کیلئے تیار رہنا۔

قرآن حکیم نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی قبولیت کا ایک بہت ہی عمدہ معیار یہاں بیان فرمایا ہے۔

الذین اٰمنوا وعملوا الصلحت	جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے انکے
طوبیٰ لھم وحسن ماٰب	لیے (اس دنیا میں) خوش حالی ہے۔ اور
(الرعد رکوع ۴)	(آخرت میں) نیک انجام ہے۔
من عمل صالحًا من ذکر او انثیٰ	جو کوئی شخص خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت
وھو مؤمنٌ فلنحیینه حیوٰۃ طیّبۃ	نیک کام کرے گا اور وہ ایمان پر بھی قائم ہے
ولنجزینھم اجرھم باحسن	تو ہم اسے (دنیا میں) پاک اور عمدہ زندگی بسر
ما کانوا یعملون۔ (النحل ع ۱۳)	کرائیں گے۔ اور (آخرت میں بھی) ان کے نیک

اعمال کے عوض میں (بہترین) اجر عنایت فرمائیں گے۔

یعنے ایمان باللہ اور اعمال صالحہ کے اثرات اس دنیا میں ظاہر ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ان لوگوں کی دنیوی زندگی سنورنی شروع

Marfat.com

ہو جاتی ہے۔ ان کے سینے اطمینان اور سُرور سے معمور ہو جاتے ہیں اور ان کے قلوب طمانیت سے منوّر ہو جاتے ہیں۔

پس اگر ہمارے ایمان باللہ اور اعمال صالحہ سے ہماری زندگی طیب نہیں ہو جاتی، یعنی آلام و حزن، محکومی و نومیدی سے پاک نہیں ہوتی تو یقیناً ہمارا ایمان ناقص ہے اور ہمارے اعمالِ صالحہ خلوص و صحتِ نیت سے خالی ہیں۔ اسلام نے دنیوی کامیابی و کامرانی کو اُخروی کامیابی و کامرانی کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔ اور حق کی باطل پر کامیابی کو بطور محبت باہرہ پیش کیا ہے۔

اِسلام سے پہلے مذاہب اور فلاسفۂ الٰہیین اور خود ہمارے صوفیائے کرام سے یہی غلطی ہوئی کہ انھوں نے اُخروی زندگی کو اس درجہ اہمیت دی کہ دنیوی زندگی کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ دنیا کو مایا اور دھوکے کی ٹٹی قرار دیا۔ حالاں کہ ایسا کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی تھا۔ چنانچہ یہی تصوّف جب حد سے بڑھ گیا تو عیسائیوں کی رہبانیت اور ہندوؤں کے یوگ اور سنیاس کے مشابہ ہو کر اسلام کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب بن گیا۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہر ہلاکِ اُمت پیشیں کہ بود
زاں کہ بر جندل گماں بردند عود

جب سے ہم میں عمل صالح کا غلط تصور شروع ہو گیا۔ ادبار و تنزل نے ہمیں آگھیرا۔ اب ہمارا ذہن نماز اور روزے، آمین و رفع یدین، طہارت اور ڈاڑھی کے ایک خاص طول تک ہی اعمال صالحہ کو منحصر کرنے لگ گیا ہے۔ اور ہم یہ بالکل بھول گئے ہیں کہ راست بازی، دیانت داری، امانت، ایثار و فدویت، مذہبِ اِسلام پر جان و مال اور اولاد قربان کرنے کا جذبہ بھی نیکیاں ہیں۔ ہم یہ نہیں

Marfat.com

کہتے کہ صلوٰۃ وصوم نیکیاں نہیں ہیں یقیناً اسلام کے اہم ترین فریضوں میں سے ہیں۔ مگر ان سب سے بڑی نیکی جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کے بغیر انسان کی نہ کوئی نیکی قبول ہو سکتی ہے اور نہ اقوام زندہ رہ سکتی ہیں۔

اسلام میں سب سے بڑا عملِ صالح اسلام کے نام پر، خدا کے نام پر، اپنی جان، اپنی اولاد اور اپنی تمام متاعِ دنیوی کو قربان کرنا ہے۔

ان اللہ اشتریٰ من المومنین	اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور
انفسھم و اموالھم بان لھم	ان کے مال خرید کر لیے ہیں اور ان کے معاوضہ
الجنۃ ط یقاتلون فی سبیل اللہ	میں انھیں جنت دے دی ہے۔ وہ
فیقتلون ویقتلون (التوبہ)	اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس یا تو

دشمن کو قتل کر دیتے ہیں یا خود قتل ہو جاتے ہیں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قصہ مختصر، یہاں اعمالِ صالحہ سے مراد جماعتی اعمالِ صالح ہیں۔ انفرادی اعمالِ صالحہ بمنزلہ تیاری کے ہیں۔ وہ ضمنی ہیں اور "الف، ب" کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو جماعتی اعمالِ صالحہ کے لیے تیار کریں جس طرح "ڈرل" فوج کو لڑائی کے لیے تیار کرتی ہے یعنی انسان اس قدومیت و ایثار کے لیے تیار ہو جائے۔ جو اس کی زندگی کا منتہا ہے۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

گویا اسلام مردانِ مجاہد پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن المبارک

Marfat.com

مشہور محدث نے حضرت شیخ الطائفہ فضیل بن عیاض کو جو حرم میں مصروف عبادت تھے، لکھا:۔

یا عابد الحرمین لو ابصرتنا
لعلمت انک فی العبادۃ تلعب

ترجمہ: اے حرمین میں عبادت کرنے والے، اگر تو ہماری طرف دیکھتا تو تجھے معلوم ہو جاتا کہ تیری عبادت صرف کھیل کود ہے۔"

من کان تخضب خدہ بدموعہ | فنحورنا بدمائنا منخضب

ترجمہ: کسی شخص کے رخسار اس کے آنسوؤں سے تر ہوتے ہیں لیکن ہمارے نیزے خون سے تر ہوتے ہیں۔

ریح العبیر لکم و نحن عبیرنا | رھج السنابک والغبار الاطیّب

ترجمہ: تمہیں زعفران اور زنجور کی خوشبو مبارک ہو اور ہمارے لیے تو گھوڑوں کے سموں کا گرد و غبار ہی بہترین خوشبو ہے۔

پروفیسر ہاب ہاؤس (HOB HOUSE) لکھتے ہیں:

" اگر فطرت پر غائر نظر ڈالی جائے تو جماعت اور نوع کے بقا کے لیے صرف ایک نیکی کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی جان کو اپنی جماعتی یا نوعی زندگی کے بقا پر قربان کرنے کے لیے تیار رہنا۔ کیا وجہ ہے کہ بکری باوجود کمزور ہونے کے اب تک زندہ ہے اور اس سے بہت زیادہ قوی الجثّہ اور مضبوط جانور مٹ چکے ہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ بکری میں انتہائی قربانی کا جذبہ موجود ہے۔ اور شیر جب بھی

اس کے بچوں پر حملہ کرتا تو وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اس کے مقابلے میں ڈٹ جاتی ہے۔ اور گو وہ اپنی جان تو دیدیتی ہے مگر اپنے بچوں یعنی اپنی نوع (نسل) کو بچالیتی ہے۔"

تواب انسان اگر اشرف المخلوقات ہو کر بکری سے بھی پیچھے رہے تو حیف ہے اس کے دین اور ایمان پر۔ اگر بکری اپنی نوع کی بقا کے لیے اپنی جان قربان کرسکتی ہے، تو ایک مسلمان کا مقام تو اس سے بہت بلند ہے اور اس پر فرض ہے اگر وہ اپنی ملت۔ اپنے مذہب کی حفاظت میں اپنی جان بچا کر رکھے۔

اقبال نے اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں پیش کیا ہے ؂

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیٔ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

حضرت امام احمد حنبلؒ کا ایک واقعہ مولانا آزاد نے "تذکرہ" میں میں نقل کیا ہے

امام موصوف کے لڑکے عبداللہ کہتے ہیں کہ:

میرے والد ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ " رحم اللہ ابا الهیثم غفر اللہ لابی الہیثم "خدا ابوالہیثم پر رحم کرے، خدا ابوالہیثم کو بخش دے"

میں نے ایک دن پوچھا" ابوالہیثم کون ہے؟

کہا، جس دن سپاہی مجھ کو دربار میں لے گئے اور کوڑے مارے گئے۔ تو جب ہم راہ سے گزر رہے تھے۔ تو ایک آدمی مجھ سے ملا، اور کہا۔

" مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں مشہور چور اور عیار ابوالہیثم حداد ہوں۔ میرا نام شاہی دفتر میں ثبت ہے۔ بارہا چوری کرتا پکڑا گیا اور بڑی بڑی سزائیں جھیلیں صرف کوڑوں ہی کی مار اگر گنوں تو سب ملا کر اٹھارہ ہزار ضربیں تو میری پیٹھ پر ضرور پڑی ہونگی

Marfat.com

بایں ہمہ میری استقامت کا یہ حال ہے کہ اب تک چوری سے باز نہ آیا۔ جب کوڑے کھا کر جیل خانے سے نکلا، سیدھا چوری کی تاک میں چلا گیا۔ میری استقامت کی وجہ صرف شیطان کی اطاعت تھی۔ دنیا کی خاطر۔ مگر افسوس تم پر اگر تم اللہ کی محبت میں اتنی استقامت بھی نہ دکھلا سکو اور دین حق کی خاطر چند کوڑوں کی ضرب بھی برداشت نہ کر سکو"

میں نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہا "اگر حق کی خاطر اتنا بھی نہ کر سکے جتنا دنیا کی خاطر ایک چور اور ڈاکو کر رہا ہے تو ہماری بندگی پر ہزار حیف اور ہماری خدا پرستی سے بت پرستی لاکھ درجہ بہتر" تذکرہ۔ صـ۱۲۶ صـ۱۲۵)

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

(۳) **تواصی بالحق** - یعنی ایک دوسرے کو حق (سچائی) کا حکم دینا۔

جب کوئی قوم ایمان باللہ اور عمل سے مزین ہو جاتی ہے۔ تو اب اسے منصب تبلیغ تفویض ہوتا ہے اور یہ آپ خود بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ جب انسان ایک عقیدے کو صحیح یقین کرتا ہے تو اس یقین کا خاصہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ یوں بھی دنیا میں دیکھیئے کہ صحیح نیکی کیا ہے؟ اگر ایک شخص ہمارے سامنے کنوئیں میں گر جائے اور ہم اسے بچانے کی کوشش نہ کریں۔ یا اسے کنوئیں میں سے نکالنے کے لیے انتہائی جدوجہد نہ کریں تو ہم انسانیت سے عاری سمجھے جائیں گے۔ ایک ڈاکٹر اگر مریض کو مرض سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لیے اگر ہمارے پاس خدا کی طرف سے حق آچکا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ بنی نوع انسان کو باطل کی پیروی سے بچائیں۔ ہمارا اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ اس حق کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیں۔ اسی کو قرآن حکیم نے تواصی بالحق یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور اسے اُمت مسلمہ کا امتیازی خاصہ قرار دیا ہے۔

کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس	"تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں میں پیدا کی
تامرون بالمعروف و تنہون	گئی تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے
عن المنکر و تومنون باللہ ۝	روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو" (آل عمران)

Marfat.com

اور یہیں سے اسلام اور دوسرے مذاہب میں حدِ فاصل قائم ہوتی ہے۔ دوسرے مذاہب انسان کی ذاتی اصلاح کو یعنے تزکیہ و تہذیبِ نفس کو منتہائے حیاتِ انسانی قرار دیتے ہیں۔ اور اس لیے اس میں یوگ، تپسیا، ترکِ دنیا، رہبانیت، مراقبے، چلّے اور اسی قسم کی نیکیوں کو جو درحقیقت انسان کے قوائے عملیہ کو معطّل کر دیتی ہیں، سب سے بڑی نیکی قرار دیا گیا۔ لیکن اسلام نے ان تمام تصوّرات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ فرمایا۔

لا رُھبانیتہ فی الاسلام — اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"

اس لیے جہاں قرآنِ حکیم نے یہ تسلیم کیا کہ انفرادی تزکیہ نفس ضروری ہے۔ اور انسان کو روحانی ترقی سے ہم کنار کرتا ہے۔ وہاں یہ بھی بتلا دیا کہ انفرادی تزکیہ نفسِ انسانی زندگی کا مدعا و منتہا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذریعہ ہے انسانیتِ کبریٰ کے حصول کا اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ یعنے تکمیلِ انسانیت بغیر جہاد کے ممکن ہی نہیں بلکہ تکمیل ایمان بھی بغیر اس کے نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مسلم کی مشہور حدیث ہے:

من رای منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ
وان لم یستطع فبقلبہ وھو اضعف الایمان

اور دوسری حدیث میں ہے:

ولیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان

گویا اب نسخہ مجوزہ یہ ہے کہ انفرادی اصلاح تو ایمان اور عمل صالح سے ہو جاتی ہے، لیکن انسان من حیث الانسان مرضِ خسران سے نہیں نکل سکتا، جب تک ان دونوں کے بعد وہ اپنے تئیں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف نہ کر دے۔

تواصی کے معنیٰ عربی لغت میں امر الغیر بالایمان والعمل الصالح۔ یعنے

دوسرے کو ایمان اور عمل صالح کا حکم دینا۔ لیکن کوئی امر بغیر نہی کے مکمل نہیں ہو سکتا اگر آپ توحید کا حکم دیں۔ تو لازم ہے کہ شرک اور مشرکانہ رسوم سے روکیں بھی۔ الغرض آپ کسی معروف کا حکم بغیر منکر کی ممانعت کے دے ہی نہیں سکتے۔ اس لیے تواصی بالحق اور امر بالمعروف ونھی عن المنکر مترادف اصطلاحات ہیں پس قرآن کریم نے اس نسخہ میں صاف بتلادیا کہ جب تک کوئی قوم من حیث الجماعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ نہیں بجا لائے گی اس وقت تک وہ خسران سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ درحقیقت افراد کی اصلاح بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ جب تک کوئی جماعت من حیث الجماعت خسران سے نہیں نکلے گی اس کے بعض افراد خواہ وہ کتنی ہی روحانی ترقی کرلیں خسرہ سے نہیں نکل سکتے۔ اور ان کی ترقی جماعتی خسران کے نقطہ نظر سے بالکل بے کار ہوگی۔

چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث میں (جو اوپر گزر چکی ہے) ارشاد فرمایا:

"جس نے تم میں سے منکر کو دیکھا اس کا فرض ہے کہ اسے بزور روک دے۔ اگر بزور نہیں روک سکتا تو زبان سے روک دے۔ اگر ایسا بھی نہیں کر سکتا تو دل ہی میں اسے برا سمجھے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور ترین درجہ ہے۔"

دوسری حدیث میں فرمایا کہ:۔

"اس کے بعد (یعنی اگر وہ دل میں بھی اس منکر کو برا نہیں سمجھتا) تو اس کے دل میں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

بالجملہ جب ایمان کی تکمیل ہی بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نہیں ہو سکتی تو اس کے بغیر مرض خسران سے نکلنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔

درحقیقت جس مذہب کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ مرض خسران کا حتمی اور حتمی علاج

تجویز کر رہا ہے۔ وہ کیونکر انفرادی نیکی کو اتنی اہمیت دے سکتا تھا کہ جماعتی نیکیوں یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ثانوی حیثیت دے کر انہیں اختیاری یا غیر ضروری قرار دے لیں بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر شخص کا فرض ہے، لیکن اسے ایک جماعتی نظام کے تحت کرنا لازمی ہے۔ اسے ہم قومی نفسیات کی رُو سے یوں بیان کر سکتے ہیں، کہ کوئی جماعت معرض وجود میں نہیں آسکتی جب تک اس کے سامنے کوئی جماعتی نصب العین اور آئیڈیل نہ ہو اور جس قدر اعلیٰ نصب العین کسی جماعت کا ہوگا اسی قدر ارفع مدارج سعادت وفلاح اس کی قسمت میں لکھے جائیں گے۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

مسلمان گویا خدا کا سپاہی ہے اور اس کا فرض ہے کہ منکر کے خلاف جہاد اور ہر بدی کا قلع قمع کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہنا، ورنہ وہ ناقص الایمان ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے سبت کو توڑنے کا واقعہ سورۃ الاعراف میں مذکور ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ سبت کے دن (یعنی ہفتے کے دن) مچھلی کا شکار نہ کیا کریں لیکن قدرتِ الٰہی سے اس دن دریا میں مچھلیاں بہت زیادہ آئیں اور باقی دن کم۔ اس پر ایک جماعت نے شرعی حیلہ نکالا اور انھوں نے دریا کے کنارے پر گڑھے کھود کر انھیں دریا سے ملا دیا۔ ہفتے کے دن وہ مچھلیوں کو گھیر کر ان گڑھوں میں لے آتے اور نہروں کو بند کر دیتے تاکہ وہ واپس دریا میں نہ جا سکیں۔ اتوار کو وہ ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔

اب ایک جماعت نے اس پہلی جماعت کو سبت کے توڑنے سے منع کیا۔ تیسری جماعت بھی صلح کُل تھی۔ انھوں نے دوسری جماعت کو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

Marfat.com

کرتی تھی، منع کرنا شروع کیا کہ تم کیوں خواہ مخواہ انہیں منع کرکے انکی مخالفت مول لیتے ہو، خدا خود ہی ان سے نپٹ لے گا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّۃٌ مِّنْھُمْ لِمَ
تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰہُ مُھْلِکُھُمْ اَوْ
مُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا قَالُوْا
مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ وَلَعَلَّھُمْ
یَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُکِّرُوْا
بِہٖٓ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ
السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا
بِعَذَابٍ بَئِیْسٍ بِمَا کَانُوْا
یَفْسُقُوْنَ ۝ (الاعراف-۱۶۴)

اور جب ان میں ایک جماعت (دوسری جماعت سے جو سبت کے دن شکار کرنے سے اپنی قوم کو منع کرتے تھے) کہا کہ جن لوگوں کو خدا ہلاک یا سخت عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے (بھلا ان کو) بیفائدہ کیوں نصیحت کرتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ (ہم تو) تمھارے پروردگار کی جناب میں (اپنے اوپر سے) الزام اتارنے کی غرض سے نصیحت کرتے ہیں اور (یہ بھی خیال ہے) کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں جب (ان نافرمان لوگوں نے) وہ نصیحتیں جو ان کو کی گئی تھیں، بھلا دیں تو ہم نے (صرف) ان لوگوں کو جو بُرے کام سے منع کرتے تھے (عذاب سے بچالیا اور جو لوگ شرارت پر اصرار کرتے رہتے تھے۔ ان کی نافرمانی کی پاداش میں ہم نے ان کو سخت عذاب میں مبتلا کیا۔"

اب اس آیت سے صاف ثابت ہوا کہ جب خدا کا عذاب آیا۔ تو اس سے صرف وہی جماعت محفوظ رہی جو تواصی بالحق یعنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی تھی۔ اور باقی کی دونوں جماعتوں کا شمار بما کانوا یفسقون یعنی فساق و فجار میں کیا گیا۔ اور ان دونوں کو رسواکن عذاب میں مبتلا کر دیا گیا۔ اور ہلاک کر دیا گیا گویا وہ جماعت جو گو خود سبت کو نہ توڑتی تھی لیکن امر بالمعروف سے اعراض کرتی تھی

فساق وفجار کے زمرے شامل کر لی گئی اور باغیوں کے ساتھ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ مرحومہ کے خصائص امتیازی میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کر رکھا ہے۔

الذین ان مکّنّاھم فی الارض و	یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں
اقاموا الصّلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ	حکومت دے دیں تو نماز کی پابندی
وامروا بالمعروف ونھوا عن	کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور معروف کا حکم
المنکر وللّٰہ عاقبۃ الامور۔	دیں اور منکر سے روکیں اور سب کاموں کا
(الحج ع ۶)	انجام تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

گویا تواصی بالحق اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر امتِ مسلمہ کے وظائف میں سے ہے اور امتِ مسلمہ کے قیام وبقا اور مرض خسران سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے۔

روح جہاد ہی میں قوموں کی بقا کا راز مضمر ہے

اجتماعی نفسیات کی رُو سے بھی دیکھا جائے تو وہی قوم ترقی کر سکتی ہے جس میں جہاد کی اسپرٹ ہو اور جونہی جہاد کی روح سرد ہونی شروع ہو جاتی ہے قوموں میں زوال یعنی خسران کے جراثیم نشوونما پانے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ قومیں جن میں جہاد کی روح بالکل فنا ہو جاتی ہے، خود فنا ہو جاتی ہیں۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ جب کوئی قوم متحد الخیال ہو کر کسی لیڈر کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتی ہے تو اس کی ترقی ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہوتی ہے۔

لیکن انسان جس طرح پہلے بچہ ہوتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے اور جسم مضبوط ہوتا ہے اور پھر اس کے قویٰ مضمحل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور وہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور بالآخر مر جاتا ہے۔ اسی طرح قوموں پر بھی ایسے دور آتے ہیں جب وہ بچہ ہوتی ہیں، پھر جوان ہو کر بڑھنا شروع کرتی ہیں۔ تیغ کے جوہر دکھاتی ہیں۔ دیگر قومیں جو اس کے مقابلے میں جہاد کی روح کھو بیٹھتی ہیں اس کے مقابلے سے عاجز آ کر خود فنا ہو جاتی ہیں اور اس کے لیے میدان صاف کر دیتی ہیں۔

اب جب وہ قوم سمجھتی ہے کہ میرا مشن پورا ہو چکا تو وہ جہاد کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے اور اس کی جوانی کا دور ختم ہو کر بڑھاپے اور اضمحلال کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ مذہبی رسوم محض نمائشی رہ جاتی ہیں۔ جہاد کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ امراء میں عیش و عشرت، فسق و فجور، اور غرباء میں غلط قناعت۔ مذہبی آدمیوں میں ریاکاری

Marfat.com

تقلید جامد اور غلط تصوف سرایت کر جاتے ہیں۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اللہ تعالٰے نے اس نفسی اصول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کر دیا اور انفرادی تقدس کو محض ایک وسیلہ قرار دیتے ہوئے اسے اجتماعی نیکی کا زینہ قرار دیا ہے۔ فی الحقیقت جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اسلام میں کسی ایسی زندگی کا تصور ہی نہیں جو جماعتی زندگی سے جدا ہو اور ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس حقیقت کا اعلان فرمایا ہے کہ انفرادی زندگی خواہ وہ کتنی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو انسان کو خسران سے محفوظ نہیں رکھ سکتی اور جب تک جماعتی زندگی میں تقوٰی اور پاکیزگی کے عناصر غالب نہ ہوں۔ لامحدود ترقی کا دروازہ کھل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

من شذ شذ فی النار — جو شخص جماعت سے الگ ہوا۔ وہ الگ ہو کر دوزخ میں ڈالا جائے گا۔"

پھر آپ صلعم نے فرمایا:

ید اللہ علی الجماعۃ — اللہ کا ہاتھ یعنی اس کی نصرت و تائید جماعت کے ساتھ ہے۔

حضرت علیؓ کا مقولہ ہے۔

الرجل المنفردۃ للشیطان
کما الشاۃ المنفردۃ للذئب

جس طرح ریوڑ سے بچھڑی ہوئی بھیڑ کو بھیڑیا لے جاتا ہے۔ اسی طرح جماعت سے بچھڑے ہوئے انسان کو شیطان لے جاتا ہے۔"

Marfat.con

گویا امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایسا آلہ کار ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا جو امتِ مسلمہ کو ہمیشہ جوان رکھ سکتا ہے اور جب تک دنیا میں ظلم و تعدی اور معصیت و خدا فراموشی موجود ہیں مسلمان اپنے ہتھیار نہیں اتار سکتا۔ جب تک خدا کی مخلوق میں سے کسی ایک پر بھی ظلم یا زیادتی ہو رہی ہے۔ اس وقت تک مسلمان اپنی کمر نہیں کھول سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ ہر منکر کے خلاف جہاد کرے اور نیکی کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وکذالک جعلنا کم امۃ وسطاً	اور اس طرح ہم نے تم کو درمیانی امت
لتکونوا شہداء علی الناس و	بنایا تاکہ تم تمام آدمیوں پر گواہ رہو (یعنی
یکون الرسول عَلَیکُم شہیدًا ہ	تم نے خدا کا آخری پیغام اس کے بندوں

تک پہنچا دیا) اور یہ رسول تم پر گواہ رہے (یعنے اس نے ہمارا پیغام تم تک پہنچا کر تمہیں حکم دیدیا تم اسے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دو)۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا:

الا ھل بلغت رسالتہ داوکما	اے لوگو! کیا میں نے خدا کا پیغام تم تک
قال)	پہنچا دیا۔

تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے متفقہ طور پر عرض کیا کہ

بلیٰ	"ہاں، آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا"

آپؐ نے تین دفعہ اسی طرح فرمایا اور ہر دفعہ ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ خداوندی میں عرض کی

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ	اے اللہ تو گواہ رہیو!

اس کے بعد آپؐ نے اپنی امت کو مامور فرمایا۔

Marfat.com

الا لیبلغ الشاھد الغائب — خبردار تم میں سے جو اس وقت موجود ہے اس
ضرب مبلغ ادعیٰ من سامع — کا فرض ہے کہ اسے دوسروں تک جو موجود نہیں
او کما قال؛ — ہیں پہنچا دے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا
ہے کہ وہ تم سے بھی زیادہ سمجھ دار ہوں گے؛

گویا ہم اللہ کی طرف سے اس امر پر مامور ہیں اور حضرت سرور عالم صلعم کی وصیت کی وجہ سے بھی مجبور ہیں کہ اللہ کے پیغام کو دنیا کے ایک ایک گوشے میں، بحر و بر میں، پہاڑوں اور بیابانوں میں، ملکوں اور قریوں میں اور ہر ہر گھر میں پہنچا دیں۔ اور اگر ہم اپنے اس فریضے کی ادائیگی میں سستی کریں تو ہم عند اللہ اور عند الناس ماخوذ و گنہ گار ہوں گے۔ گویا قومی روح کو زندہ رکھنے کے لیے قومی قوت فاعلہ کو جوان رکھنے کے لیے یہ ایک بے خطا نسخہ ہے اور درحقیقت انفرادی اصلاح کے لیے بھی اس سے بڑھ کر کوئی قوی تر محرک نہیں ہو سکتا اور نہ ہی بدون اس کے انسان کی انفرادی نیکیوں کے جوہر کھلتے ہیں۔

مفتی محمد عبدہٗ رحمتہ اللہ علیہ تفسیر سورۃ والعصر میں فرماتے ہیں کہ یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "تواصوا" فرمایا "اوصوا" نہیں فرمایا تاکہ اس بات پر زور دیا جائے کہ خسران سے نجات کا واحد ذریعہ صرف یہ ہے کہ مسلمان کا ہر ہر فرد امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر اس قدر حریص ہو کہ ہر شخص دعوت الی الخیر میں دوسرے پر سبقت لے جانے کا خواہشمند ہو اور ظاہر ہے کہ جو شخص دوسروں کو حق کی طرف بلانے میں اس قدر حریص ہوگا۔ وہ خود بھی فوراً حق بات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوگا۔

الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا — کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
فھو احق بھا (او کما قال)» — جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو (حالی)

اگر انسان کی مساعی کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بھی یہی ثابت ہوگا کہ فردِ واحد کو بھی تواصی بالحق یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بغیر معراجِ کمال حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ انسان کے اندر دو قوتیں کارفرما ہیں۔

اول: علمِ نافع کی قوت جس کا ثمرہ ایمانِ راسخ و یقینِ غیر متزلزل ہے۔

دوم: قوتِ عملیہ جس کا ثمرہ ایمان اور علم کے مطابق اپنے افعال کو ڈھالنا، کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کرتے ہیں، ایمان الغیب عملِ صالح کے بالکل بے خبر ہے اور عمل، بغیر ایمان کے ہمیشہ اکارت جاتا ہے۔ یہاں قوتِ عملیہ کے دو مدارج کی طرف توجہ مبذول کرانی ضروری ہے۔ قوتِ عملیہ کی ابتدا تو یہ ہے کہ انسان اپنے اکتسابی علم کی روشنی میں اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور ایک مقررکردہ اصول کے مطابق اپنے تمام اعمال و افعال کو ڈھال لے اور دوسری منزل تکمیل کی یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کو، اپنے سماج کو، اپنی سوسائٹی کو، اپنے علم و ایمان کی روشنی میں ڈھالنے کی کوشش کرے اور جس گڑھے میں گرنے سے وہ خود بچا ہے اسی میں گرنے سے دوسروں کو بھی بچالے۔ گویا تزکیہ نفس اگر پہلی منزل ہے تو تزکیہ جماعت اس کی آخری منزل ہے۔ شریعت نے اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر فرمایا ہے۔

اور اگر بہ نظرِ امعان انسانی سوسائٹی کا مطالعہ کیا جائے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بغیر کسی سوسائٹی کا وجود ہی متحقق نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص ڈاکٹری اور طب کے مطالعہ میں سالہا سال خرچ کرتا ہے لیکن اگر اس کے علم سے سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے تو ہم اسے بنی نوعِ انسان کا دشمن خود غرض کہیں گے۔ کیونکہ اس کا فرض ہے کہ اپنے علم سے جہالت کی تاریکی دور کرے اور اپنے علم کو گھر گھر پہنچائے۔ اس طرح ایک امیر آدمی جسے خدا نے اپنے فضل و کرم سے مال دیا ہو اگر مال کے خرچ

کرنے میں بخل سے کام لے تو وہ بہت ہی مذموم خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص رفاہِ عام کے کاموں میں اپنی دولت خرچ کرتا ہے۔ اس کی مدح و ستائش کی جاتی ہے۔ تو جب دنیوی علم و دولت کا یہ حال ہے کہ کوئی انسان "انسان" ہی نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ اپنی سوسائٹی کو اس علم و دولت میں شریک نہ کرے، تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حق اور سچائی کی دولت سے سرفراز فرمایا ہو، وہ کیونکر تنہا اس سے متمتع ہونا قبول کر سکتا ہے۔ نہیں، اس کا فرض ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے یہی صدا نکلے گی کہ خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ۔ خدا کے بندوں کو خسران سے بچنے کا نسخہ بتلاؤ۔ گویا یوں سمجھئے کہ جس طرح ایک دولت مند کا فرض ہے کہ اپنی خداداد دولت کو سوسائٹی یا جماعت کے لیے وقف کر دے۔ ورنہ وہ عند اللہ عاصی اور عند الناس مجرم ہوگا۔ جس طرح ایک عالم اور حکیم کا فرض ہے کہ وہ اپنے علم و حکمت سے بندگانِ خدا کی خدمت کرے ورنہ وہ قابلِ ملامت ہوگا۔ اسی طرح ایک عالم ربانی کا فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تشنہ کاموں کو سیراب کرے۔ ورنہ وہ عند اللہ ماخوذ اور عند الناس جواب دہ ہوگا۔ گویا انسان کو معراج کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ دوسروں کی تکمیل میں سعی بلیغ نہ کرے اور ان کی اصلاح و فلاح کے لیے کوشاں نہ ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے:

لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ	"تم میں سے کوئی شخص ایمان کے مراتب عالیہ پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ

اپنے بھائی کے لیے اسی چیز کو پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

اس حدیث شریف میں ایسا مہتم بالشان اخلاقی اُصول پیش کیا گیا ہے جو دینِ اسلام کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے اس حدیث شریف نے مسلمانوں

کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا ہے جس کے بغیر تکمیلِ ایمان محالات سے ہے۔ تواصی بالحق اسی لائحہ عمل کا ایک ضروری جز ہے۔ کیونکہ ایک مومن پر تلاشِ حق اور اس پر عمل کرنے کی کوشش فرض عین ہے، تو اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ جس طرح ہر ایک مومن پر فرض ہے کہ وہ حق کی تلاش میں سرگرم عمل رہے۔ اسی طرح اس پر فرض ہے کہ اپنے مومن بھائیوں تک حق کی روشنی پہنچانے کیلئے بھی سرگرم عمل رہے۔ اسی لیے دوسری حدیث میں فرمایا: ۔ "الدین النصیحۃ" دین خیر خواہی کا نام ہے:

گویا اصلی اور حقیقی دین کیا ہے؟ اللہ کی کامل اطاعت اور خدمت (کہ یہی اس کی خیر خواہی ہے) اور اس کے رسول کا سچا اتباع (کہ یہی ان کی خیر خواہی ہے) اور عامۃ المسلمین کی دلی خیر خواہی۔

ایک اور حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ۔

جو شخص خود پیٹ بھر کر سو جائے اور اسے اپنے بھوکے ہمسایہ کا خیال نہ آئے وہ مومن نہیں کہلا سکتا (او کما قال) ظاہر ہے کہ جب بدنی غذا میں اپنے ہمسائے کو شریک نہ کرنے سے انسان ناقص الایمان ہو جاتا ہے اور خسران میں مبتلا ہو جاتا ہے تو بھلا روحانی غذا میں اپنے ہمسایوں اور بھائیوں کو شریک کرنا کتنے بڑے خسران کا موجب ہو گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

شیخ سعدیؒ نے عابد اور مجاہد میں خوب مذاکرہ کیا ہے۔

گفت آں گلیم خویش بروں مے برد ز موج   ویں سعی می کند کہ بر آرد غریق را

چنانچہ جب بنی امیہ اور بنی عباس کے جور و ستم سے تنگ آکر بعض علمائے امت نے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا تو بڑے بڑے اکابر امت نے ان کے اس فعل کو مذموم خیال کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایسی روشن مثالیں پیش کیں جن پر ہم رہتی دنیا تک فخر کر سکتے ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بغیر تمام نیکیاں اکارت جاتی ہیں

فی الجملہ یہاں یہ ظاہر کر دینا مقصود ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بغیر عبادات اور دوسرے اعمالِ صالح محض لہو ولعب اور روحانی تفریح ہیں اور اعمالِ صالح کی غرض وغایت ہے کہ انسان کو جہاد کے لیے تیار کرتا رہے۔ جہاد میں قومی زندگی کا راز مضمر ہے۔ گویا اصل عمل صالح جہاد فی سبیل اللہ ہے اور تمام عبادتوں کی غایت الغایات بلکہ خود اشرف العبادت جہاد فی سبیل اللہ ہی رہی ہے۔ دوسرے تمام اعمال جہاد کے لیے تیاری کے مختلف زینے ہیں اور جس درجہ کوئی عمل انسان کو جہاد فی سبیل اللہ کیلئے تیار کرتا ہے اسی قدر اس کا درجہ حسنات میں بلند ہے۔ گویا اس آیت شریف نے انسان کے تمام مراتب کمال کو یکجا جمع کر کے بتلا دیا۔ کہ انسان کامل وہی ہو سکتا ہے جسے قسامِ ازل نے علم نافع، عمل صالح، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر یا جہاد فی سبیل اللہ میں اس کا جذبہ صبر واستقامت ہو جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ۔

پس تو اصوا بالحق سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پیدائشی مبلغ ہے اور اس کا فرض ہے۔ کہ پہلے خود حق پر عمل پیرا ہو اور پھر تمام دنیا کو حق کی دعوت دے مسلمان ہر باطل قوت اور طاغوت کے استیلا کے لیے پیام مرگ ہے۔ گویا مسلمان من حیث القوم خدمتِ خلق کے لیے وقف ہے اور جب تک دنیا میں طاغوت کی حاکمیت اور باطل کی حکومت ہے وہ خدا کا ایک کمر بند سپاہی ہے اور

Marfat.com

ظاہر ہے کہ بمصداق

سیّد القوم خادمھم — "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد"

اُمتِ مسلمہ سے زیادہ منصبِ امامت اور دنیا کی پیشوائی کا اور کون اہل ہو سکتا ہے؟ گویا اس آیت میں بالواسطہ اس امر کی بشارت دی گئی ہے کہ اُمتِ مرحومہ کو منصبِ امامت پر فائز کیا جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں حق کے سوا کسی کو ثبات و قیام ہو ہی نہیں سکتا۔ پس جو فرد یا قوم حق سے وابستہ ہو گئی وہ خسران سے محفوظ رہ کر ثابت اور قائم ہو گئی اور دنیا کی امامت بھی اسی کو تفویض کی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وجعلناھم ائمۃ یھدون	اور ہم نے انھیں دنیا جہان کا پیشوا بنایا
بامرنا	جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے تھے:
وعد اللہ الذین آمنوا منکم و	اور تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل بھی
عملوا الصلحت لیستخلفنھم فی	کریں، ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے
الارض کما استخلف الذین من	کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا۔
قبلھم ولیمکنن لھم دینھم	جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت عطا
الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم	فرمائی تھی، جس دین کو ان کے لیے پسند کیا
من بعد خوفھم امنا (الایۃ)	ہے اس کو ان کے لیے قوت دے گا اور ان کے
(الآیت النور)	اس خوف کے بعد اس کو بدل کر امن کر دے گا۔

گویا جہان کی حکومت و سرداری مسلمانوں کا حق ہے اور کسی دوسرے کو اس صورت میں ملے گی جب مسلمان اس کا اہل ثابت نہ ہوگا۔ یا بالفاظ دیگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا لازمی ثمرہ امامت ارضی ہے اور ایمان و عمل صالح جہاد کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں

Marfat.com

اس لیے ناممکن ہے کہ جب کسی قوم میں یہ سہ گانہ اوصاف پیدا ہو جائیں تو وہ دنیا کی امامت پر فائز نہ ہو۔ اسی لیے قرآن حکیم میں بعض جگہ صرف ایمان داروں کو عظیم الشان بشارتیں دی گئی ہیں۔ وہاں بھی وہی ایمانِ کامل مُراد ہے جو اعمالِ صالحہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بغیر متحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آیاتِ ذیل میں اسی طرف اشارہ ہے

لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم	ہمت نہ ہارو اور غمگین نہ ہو کیونکہ اگر
الاعلون ان کنتم مومنین ہ	تم مومن ہو تو تم ہی (کفار پر) غالب
(آل عمران)	رہو گے۔"

یہاں مراد کمالِ ایمان ہے۔ جو بغیر عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ کے متحقق الوقوع ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا:۔

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے
بظلم اولئک لھم الامن ہ	ایمانوں کو ظلم (یعنی کسی قسم کے شرک) سے

ملوث نہیں کیا۔ انہی کے لیے امن وسلامتی ہے" الامن سے مراد دنیا میں حکومت اور عقبیٰ میں نجات ہے۔"

فقہا نے اس امر پر لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ تواصی بالحق یا امر بالمعروف یا نہی عن المنکر فرضِ کفایہ ہے یا فرض عین۔ ہم یہاں ان بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتے۔ صرف اتنا عرض کریں گے کہ جس طرح اذنِ جہاد کے بعد ہر قابل و بالغ مسلمان پر جہاد میں شرکت فرض عین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق ہر مسلم اور مسلمہ پر فرض عین ہے۔ ہر مسلم و مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق تبلیغ کرے اور منکرات کو روکے اور نہیں تو صرف اپنے گھر میں ہی تواصی بالحق کرے۔

Marfat.com

جس طرح ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے جسم کی بقا کے لیے غذا کھائیں۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ ہم جسمِ اسلام کی بقا کے لیے بھی دامے درمے، قدمے آمادۂ عمل رہیں۔ مسلمان درحقیقت خدا کا سپاہی ہے۔ جب لڑائی کا بگل بج جائے تو کیا کسی سپاہی کی مجال ہے کہ وہ کسی بحث میں الجھے کہ۔ لڑائی میں میرا شریک ہونا فرضِ کفایہ ہے یا فرضِ عین۔ اس کا تو فرض ہے کہ فوراً وردی پہن کر میدان میں اُتر آئے۔

اسی طرح مسلمان، جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں، خدا کا مجاہد ہے۔ اور جہاد کا بگل بج چکا ہے۔ اور اس کے بجانے والے بھی کون ہیں؟ ہمارے آقائے نامدار سردارِ دوجہاں رحمۃ اللعالمین حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ تو کیا اب یہ کسی مسلم کے شایانِ شان ہے کہ وہ سوال کرے کہ میں تو اس بگل کی آواز پر لبیک کہوں یا نہ کروں؟ خوش نصیب جسے ایسا کمانڈر ملے اور خوش نصیب اُس کے جسے اس مبارک اور عظیم الشان کام کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

الجہاد ماضٍ الی یوم القیمۃ	جہاد تا قیام قیامت [illegible]
لا یبطلہ جور جائر ولا عدل	ظالم کے ظلم کا خوف یا عادل کے عدل کا خیال
عادل (او کما قال)	اسے منسوخ نہیں کر سکتا۔
من لم یغز او لم یجہز غازیا او لم	جس نے لڑائی نہیں لڑی اور [illegible]
یحدث نفسہ علی الغزو فقد	کسی غازی کو فی سبیل اللہ [illegible]
مات علی شعبۃ من النفاق (او کما قال)	سامانِ حرب وغیرہ دے کر دیا اور نہ اپنے

تئیں لڑائی کے لیے تیار رکھا جب وقت ملے گا میں اللہ کی خدمت میں شہید ہو کر [illegible] تو وہ نفاق کی حالت میں مرا۔

امرت ان اقاتل الناس حتی	مجھے حکم دیا گیا ہے اللہ کی طرف سے [illegible]

Marfat.com

یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ (او کما قال) جب تک لوگ لا الٰہ اللّٰہ کا اقرار نہ کرلیں اس وقت تک ان سے تلوار سے قتال کروں۔"

اب آپ خود ہی غور کیجئے کہ ہمارے فرائض کیا ہیں؟ جب تک دنیا میں دکھ درد ہیں، جب تک انسان انسانوں کو خدا کی غلامی سے نکال کر اپنی غلامی میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب تک دنیا میں ایک شخص بھی خدا کا منکر موجود ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی وردی نہ کھولیں۔ مسلمان تمام بنی نوعِ انسان کا سچا خادم اور ہمدرد ہے اور وہ ان کی خدمت کر کے اپنا حقِ سیادت منوانا چاہتا ہے۔ اس لیے ہر دردمند شخص کا درد اس کا درد ہے اور ہر مصیبت زدہ شخص کی مصیبت اس کی مصیبت ہے۔

خنجر پڑے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آج دنیا کو ایسے آبِ حیات کی ضرورت ہے جو اسے عیشِ دوام سے ہمکنار کر دے۔ آج دنیا دکھی ہے اور اپنے دکھ کے لیے دوا کی متلاشی ہے۔ آج دنیا کے رہنما اٹلی، سٹالن، ٹرومین اور کمینی دنیا کے سامنے بڑے بڑے بلند بانگ دعاوی پیش کر رہے ہیں مگر اس کی مثال اس سے زیادہ نہیں کہ ؎

گو خویشتن گم است کرا رہبری کند

دنیا کے مصائب کا یہ علاج نہیں ہے کہ انھیں ڈیموکریسی کے طاغوت سے نجات دلا کر کمیونزم کے طاغوت کی آغوش میں دے دیا جائے۔ بلکہ دنیا کے مصائب کا واحد علاج یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کی حاکمیت تسلیم کی جائے اور اس کے بندے آسانی سے اپنے خالق کے تجویز کردہ ضابطے پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اور دنیا میں پھر ایک دفعہ خدا کی حکومت قائم ہو جائے۔

Marfat.com

اسلام نے نہ صرف تواصی بالحق کا حکم ہی دیا تھا۔ بلکہ ایک ایسا مکمل اور خود اصلاحی نظام تواصی بالحق کا مرتب بھی فرمایا تھا کہ اگر ہم مسلمان اس پر عمل پیرا رہتے تو ہم کبھی صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکتے۔ مگر افسوس کہ ہمارے علماء نے اسے معطّل کر دیا۔ دراصل جب علمائے نے استبدادی نظام کو اسلامی نظام سمجھ کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تو، وہ اس نظام باطل کے کل پُرزے بن گئے اور ان کی تمام مساعی کا محور اس نظام باطل کا قیام و ثبات ہو گیا۔ الا ماشاء اللہ۔

بے شک، خدا کے بعض شیدائوں نے اس وقت بھی قرونِ اول کی یاد تازہ کی اور ہر دور میں تواصی بالحق کا فرض حقہ ادا کیا۔ لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی تواصی بالحق کا نظام کمزور ہی ہوتا گیا۔ مثال کے طور پر جمعہ کے خطبے ہی کو لو۔ ہر ہفتے میں ایک بار ہر شہر میں جمعہ مسجد میں امام شہر کا فرض تھا کہ جمعہ کے خطبے میں تواصی بالحق کا فرض انجام دے، چنانچہ احادیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جمعہ کے خطبوں میں تذکیر (یعنے وعظ و نصیحت) فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے علمائے نے جمعہ کے خطبے کو محض رسمی بنا کر چند غلط سلط عربی جملوں، موضوع حدیثوں کا مخلوط مجموعہ بنا دیا ہے۔ سامعین میں سے ایک فیصد بھی شاید اس خلط خطبہ کو سمجھ سکتا ہو۔ اور بالعموم لوگ پڑے اونگھتے رہتے ہیں۔ اس پر بعض ارباب علم و فضل و دانش نے تواصی بالحق سنت نبویہ کو تازہ کرنے کے لیے یہ تجویز کی کہ خطبہ اردو زبان میں، جسے سامعین سمجھ سکتے ہوں، دیا جائے تو دین کے ان اجارہ داروں نے اسے بدعت قرار دیا۔ اس پر فتوے شائع کیے کہ خطبہ عربی میں ہی ہونا چاہیئے۔ مگر افسوس کہ وقت کا تقاضہ زیادہ ثابت ہوا۔ اس لیے ایک بدعت سے بچ کر انھوں نے دوسری بدعت کے سائے میں پناہ لی یعنی یہ فیصلہ کر لیا کہ جمعہ کے خطبے سے پہلے ایک لمبا چوڑا وعظ کہا جائے۔ اب گویا دو خطبے بنا

بدعت ہے ۔ تو یہ بھی یقینًا بدعت ہے ۔ اور اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے اور تذکیر حاصل نہیں ہوسکتی ۔ خطبہ کا مقصود ہے تذکیر ۔ اسی لیے اس میں حاضری واجبات سے ہے ۔ اس کا سننا اشد ضروری ہے ۔ یہاں تک کہ اس میں کلام کرنا جمعہ ہی کو باطل کر دیتا ہے ۔ ان تمام احکام سے مقصود سامعین کے قلوب کو اخذ مطالب کے لیے تیار کرنا ہے ۔ اب ظاہر ہے کہ ایک تو نمازیوں کی اکثریت وعظ کے اکثر حصے سے غیر حاضر رہتی ہے اور خطبے کے قریب قریب ہی مسجد میں آتی ہے اور جو آتے بھی ہیں تو وہ نفسیاتی کیفیت ان کے قلوب میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی جو سمع اور طاعت کے لیے ضروری ہے

قصہ مختصر ، ہمارے علمائ نے اپنی سوء تدبیر سے تواصی بالحق کے نظام کو بہت کمزور کردیا بلکہ معطل بنادیا ہے ۔ جمعہ کے بعد عیدین اور حج کا نظام منجملہ اور فوائدِ عظیم کے تواصی بالحق کے نظام کی تکمیل کرتا ہے ۔

موجودہ زمانے میں حق بالکل بے یار و مددگار ہوچکا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق سے زیادہ نایاب اور کوئی جنس نہیں ہے ۔ اس لیے موجودہ زمانے اور تہذیب حاضر کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اسلام کے تواصی بالحق کے نظام کو از سرِ نو زندہ کردیا جائے تاکہ باطل کے پروپیگنڈے کی تمام راہیں مسدود ہوجائیں ۔ اسی میں بنی نوعِ انسان کی نجات کا تمام راز مضمر ہے ۔ یہی بابِ سعادت کی مفتاح ہے ۔ فافہم و تدبّر ۔

Marfat.com

تواصی بالصّبر کی حقیقت

۴) وتواصوا بالصبر   اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہو

مذکورہ بالا تقریر سے یہ تو ظاہر ہوگیا ہوگا کہ تواصی بالحق کا فریضہ کوئی آسان کام نہیں یہ ایک خدا کی محبت کے بدلے میں تمام ماسوی اللہ کی دشمنی مول لینے کے مترادف ہے۔ ایک اللہ کی رسّی کا دامن تھام کر باقی سب آسروں کو توڑ دینے کی دعوت ہے۔ ایک مالک کے قانون کی اطاعت میں تمام طاغوتی قوانین سے اعلانِ جنگ کا نام ہے۔ اس لیے اس راہ میں انسان کو کیا کیا شدائد برداشت نہیں کرنے پڑیں گے اور کن کن مصائب سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا۔ ان تمام مصائب و شدائد میں مومنین ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف خود ہی صبر کرتے اور دوسروں کے سامنے ایک روشن مثال قائم کرتے ہیں بلکہ قولاً اور عملاً صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ دوسروں کو صبر کی تلقین کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان خود صابر و شاکر بن جائے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھوک کی شدت کی شکایت کی۔ کہ اب تو پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت آگئی ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ مبارک اٹھا کر دکھلایا۔ آپ کے شکم مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ یہ تو مقام نبوت تھا۔ خود صحابہ کرام رض، تابعین، تبع تابعین اور دوسرے

Marfat.com

صلحائے امت نے صبر و استقامت کی ایسی روشن مثالیں پیش کی ہیں کہ کسی قوم کی تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

اب ہم صبر کے مفہوم کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

صبر اخلاقِ انسانی کے اعلیٰ ترین خصائل میں سے ہے۔ بلکہ یہ ملکہ تمام اخلاقِ انسانی کا محافظ اور قلبِ انسانی کا محتسب اور تمام ذمائم و رذائل سے بچانے والا ہے۔ انسان کو خدا ترسی اور تقویٰ پر قائم و ثابت کرنے والا یہی وصف ہے۔ ایمان حقیقی، عشقِ حقیقی اور منافقت و ریاکاری میں حدِ فاصل قائم کرنے والا یہی خلق ہے۔ لیکن دوسرے اخلاق انسانی کی طرح اس کے بھی مدارج ہیں۔ صبر کی ابتدائی صورت تو یہ ہے کہ اپنے مصائب پر رنج و الم کا اظہار نہ کرے اور یہ سمجھ کر کہ جو ہونا ہے ہو چکا اور اب بدل نہیں سکتا۔ اس پر رونا یا ماتم کرنا خلافِ عقل سمجھے اور خاموشی سے اس نقصان کو برداشت کرے۔ واقعی اس طرح رونا یا ماتم کرنا انسان کے شایانِ شان نہیں۔ یہ شق تو مومن اور کافر دونوں میں مشترک ہے۔ اور اس کے بغیر انسان کی زندگی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن جاتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بے صبر آدمی کی زندگی اس کے لیے وبال بن جاتی ہے اور وہ اسے جلد از جلد ختم کر دینا چاہتا ہے۔ جیسا کہ آجکل خودکشیوں کی بھرمار سے پایا جاتا ہے اور صبر کی تکمیل کی وہ صورت ہے جو ایک مومنِ قانت کے حصے میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ملکہ یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ حق کی راہ میں انتہائی قربانیاں بھی آسان معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں تکالیف و شدائد عین راحت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ وہ تمام مصائب کو نہ صرف خوشی سے برداشت کرتا ہے، بلکہ دعوت دیتا ہے کہ آؤ اور میرے صبر

Marfat.com

ثبات کا امتحان لو ؎

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نہ ناصح
بدست آور رگِ جانے ونشتر را تماشا کن

ان کے قلوب ایثار و فدویت کے جذبات سے معمور ہو جاتے ہیں اور ہر ایذا جو انھیں خدا کی راہ میں دشمنانِ خدا سے پہنچتی ہے۔ ان کے لیے عیشِ سرمدی و حیاتِ جاودانی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ ہر ابتلا پر ان کا جوش المضاعف ہو جاتا ہے اور وہ الہانہ پکارتے ہیں ؎

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

رضائے الٰہی ان کا مطلوب و مقصود ہو جاتی ہے۔

اس وقت ان کے قلوب مخلوقِ خدا کی حقیقی خیر خواہی سے معمور ہو جاتے ہیں اور وہ ان کی کسی اذیت کے انتقام لینے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں انبیاء اور مومنین کی شان میں آتا ہے:

ولنصبرن علےٰ ما اذیتمونا ہ — تبلیغ کی راہ میں تم ہمیں جس قدر بھی ایذا دو گے ہم اس پر صبر کریں گے!

ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا الاٰیۃ — اور اے جماعتِ مومنین! تم ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے ... تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہ بہت پختہ اور قائم رہنے والی بات ہے!

اس لیے فرمایا کہ تبلیغِ حق میں مومنین انتقام کا خیال بھی نہیں لاتے۔ بلکہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیتے ہیں۔

لا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہٗ ولیٌ حمیم وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظٍ عظیم ○ (حم سجدہ)

نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتیں۔ تم بدی کا جواب نیکی سے دو۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن۔ تمہارا جانی دوست بنجائیگا لیکن برائی کا جواب نیکی سے دینا وہ عالی مقام ہے۔ جس پر سوائے صابروں کے اور ان لوگوں کے اور کوئی نہیں پہنچ سکتا جنھیں اللہ تعالٰی کی طرف سے ایمان وعمل کا بہت بڑا حصہ عطا ہوا ہے"۔

صبر کے متعلق یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ یہ یقینی کامیابی کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ ایک ایسا جزیہ ہے جو کبھی خطا نہیں کرتا۔ اسی لیے انبیاء کرام نے صبر و رضا کا جو اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے، تاریخ کے اوراق ایسے عزم و ثبات کی مثال قائم کرنے سے قاصر ہیں۔

چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوتا ہے:۔

فاصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل (الاحقاف)

"پس اے پیغمبر! تم بھی تمام دوسرے اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر کرو"۔

اور اس کے نتیجے میں آپؐ کو کامیابی کی بشارت اور آپؐ کے دشمنوں کی تباہی کی نوید سنائی جاتی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فاصبر ان وعد اللہ حق ولا یستخفنک الذین لا یوقنون (الروم)

"پس، اے پیغمبر! صبر کرو۔ خدا کا وعدہ، تمہاری نصرت اور کامیابی کا اور تمھارے دشمنوں کی تباہی اور ناکامی کا بالکل سچا ہے"۔

اور وہ لوگ جو ایمان ویقین کی دولت سے تہی دست ہیں تم کو دل برداشتہ نہ کر دیں۔"

پھر فرمایا کہ صبر داعیٔ حق کے لیے ایک ڈھال ہے جو اسے دشمنوں کے ہر مکر و فریب سے بچاتی ہے۔

وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً ہ — اور اگر تم صبر کرو گے اور خدا سے ڈرتے رہو گے تو ان دشمنوں کے مکائد تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔"

پھر فرمایا:-

واستعینوا بِالصّبرِ وَالصّلوٰۃ — اور ہر مصیبت میں صبر اور نماز کے ذریعے خدا کی مدد طلب کرو۔"

گویا داعیٔ حق کا صبر خدائی نصرت کے لیے حسن طلب کا بہترین مظاہرہ ہے۔

اگر نفسیاتی پہلو سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ لیڈرشپ کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ عزم و ثبات ہیں۔

اور عزم و ثبات بغیر صبر کے پیدا ہو ہی نہیں سکتے بلکہ اسلام میں صبر عزم و ثبات کا دوسرا نام ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔

دوسرا وصف جو عزم و ثبات کے بعد لیڈرشپ کے لیے ضروری ہے۔ وہ ایثار و فدویت کا جذبہ ہے۔ اور یہ بھی صبر کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ صبر ہی وہ مقام ارفع و اعلیٰ ہے جس پر فائز ہو کر انسان اپنے تئیں خدا کے ہاتھ میں

دیتا ہے۔ پھر وہ اس کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ اس کا پیر ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھ ہو جاتا ہے۔

ساری دنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو۔ جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو۔ کیا عرض کروں کہ اس میں کیا لذت ہے۔ ایک مرتبہ تم کسی کے ہو کر دیکھو۔

گویا دنیا کی لیڈر شپ انہی کے حصے میں آسکتی ہے جو صحیح معنیٰ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور صابر ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ تواصی بالحق اور صبر لازم و ملزوم ہیں۔

قصہ مختصر تواصی بالحق وہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے جس تک پہنچنے کے لیے سوائے صبر کے کوئی آلہ کام نہیں دے سکتا۔

ترکِ جان و ترکِ مال و ترکِ سر　　　در طریقِ عشق اوّل منزل است (حافظ)

الغرض وہی شخص تواصی بالحق یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی دشوار گزار وادی میں اتر سکتا ہے جو اپنی جان، اپنا مال، اپنی عزت و حرمت، اپنا وطن، اپنی اولاد، غرض سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو۔

میں کھو کے تیری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے　　　(جوہر)

مومنین جب تواصی بالحق کے لیے میدانِ عمل میں اُترتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو صبر کی بھی تلقین کرتے ہیں۔

Marfat.com

موجودہ مسلمانوں کی صبر سے دُوری

صبر کے مقابلے میں ذرا بے صبری کا مطالعہ کیجئے۔ کیونکہ

وبضدھا تتعرف الاشیاء — اور چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں:

بے صبری آج کل مسلمانوں کا قومی شعار بن چکی ہے۔ دراصل جہاں صبر تمام اخلاق فاضلہ کا سرچشمہ ہے، وہاں بے صبری تمام رذائل اور جمیع اخلاقی مفاسد اور جملہ گناہوں کی جڑ ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے، لیکن اگر فطرت انسانی کا بنظر امعان مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ اکثر انسان ابتلاء پر صبر نہ کر سکنے کے باعث کبائر تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً:

بیماری میں، دکھ درد میں، اولاد نہ ہونے کی صورت میں یا اسباب و وسائل کے یکلخت مسدود ہو جانے کی صورت میں یا عارضی طور پر ترقی کی راہ میں موانع پیش آجانے کی صورت میں، تجارت میں یکایک گھاٹا آجانے سے یا بے روزگاری سے تنگ آجانے کی صورت میں انسان بہت جلد اپنے خدا کو بھول کر غیر اللہ کو اپنا کعبۂ مقصود بنا لیتا اور طاغوت کی حاکمیت کا جُوا اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

مثلاً کہیں بتوں کے سامنے نذر و نیاز یں مانتا ہے، تو کہیں قبروں پر جا کر ماتھے رگڑتے ہیں۔ کہیں درگاہوں پر جبہ سائی کرتا ہے۔ کہیں تعویذ گنڈوں کی طرف دوڑتا ہے اور کہیں پیروں فقیروں سے استمداد کرتا ہے اور کہیں

Marfat.com

مجازی حاکم کو اپنا حقیقی حاکم مان کر اس کے قانون کا حلقہ اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے غرض ذرا سی تکلیف پر اس قدر بے صبر ہو جاتا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر غیر اللہ کے سامنے جبین نیاز خم کرتا ہے۔

واتخذوا من دون اللہ الھۃ لعلھم ینصرون ○ "اور اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودانِ باطل کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں تاکہ وہ ان کی مدد کر سکیں"

اور افسوس کہ اس تھوڑی دنیاوی تکلیف کے عوض آخرت کا ابدی عذاب خرید لیتا ہے"

فما اصبرھم علی النار "انھوں نے آگ کے عذاب پر کس قدر قناعت کر لی ہے"

ایسے بے صبر نہ صرف اپنی ہی متاعِ ایمان و یقین کو برباد کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی قوم کے لیے بھی ہلاکت اور تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ وہ ایک متعدی مرض کی طرح قوم کے تمام جسم کو خراب اور مریض اور لاغر کر دیتے ہیں۔ علیٰ ہذا صابر اپنی قوم کو معزز بناتے ہیں۔

قصہ مختصر قلب مومن کی مثال ایک زرخیز کھیتی کی ہے جس میں ایمان و یقین کا بیج ڈالا گیا اور وہ عمل صالح کا تناور درخت بن گیا۔ اور حق اور صبر کا برگ و بار لایا اب اس کا فیضِ عام شروع ہوتا ہے اور وہ حق و صبر کے پھلوں اور پھولوں سے تمام دنیا کے روحانی مریضوں اور اخلاقی بیماروں کو شفا بخشتا ہے۔ چنانچہ خود قرآنِ حکیم نے اسی تمثیل کو بیان فرمایا ہے۔

الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا "دیکھو اللہ تعالیٰ نے پاک کلمہ کی کیسی اچھی مثال بیان فرمائی ہے۔ اس کی مثال ایک

Marfat.com

ثابتٌ وفرعها فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون ۔ (ابراھیم)

پاک درخت کی ہے جس کی جڑ تو مضبوط ہے اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر لحظ اور ہر آن خدا کے حکم سے وہ اپنا پھل کھانے والوں کو دے رہا ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ تو لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۔

اس مثال پر اور اس نسخہ پر جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے تجویز فرمایا ہے۔ غور کرنے سے ہماری سینکڑوں مشکلات کی عقدہ کشائی ہو سکتی ہے ۔

اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیر و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

Marfat.com

خلاصۂ مطالب

قصہ مختصر خسر سے بچنے کے لیے اور ایک قوم کی غیر محدود ترقی کے لیے جو نسخہ قرآن حکیم نے تجویز فرمایا ہے اس کے چار اجزا ہیں۔

۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق اور (۴) تواصی بالصبر،

جب تک کسی قوم میں من حیث الجماعت یہ چاروں وصف پیدا نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک وہ قوم لامحدود ترقی نہیں کر سکتی۔ پھر اگر ان میں سے ایک یا دو یا تین پیدا ہو جائیں۔ تو اس کے تناسب وہ ترقی کر سکے گی۔ اسی طرح جب یہ چاروں چیزیں ایک ایک کر کے رخصت ہونا شروع ہوتی ہیں تو لامحدود ترقی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور خسران کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ قوم تباہی کے گڑھے میں گر جاتی ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان چاروں امور مہمہ کو جس ترتیب میں ذکر فرمایا اسی ترتیب سے یہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور ترتیب معکوس میں رخصت ہونا شروع ہوتے ہیں یعنی سب سے پہلے تواصی بالصبر رخصت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ تواصی بالحق رخصت ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمل صالح رخصت ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اعلانیہ منکرات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور لوگ معصیت کا ارتکاب کرنے پر دلیر ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

بالآخر ایمان کی ٹمٹماتی ہوئی شمع بھی گُل ہو جاتی ہے اور قوم کی قوم کامل تباہی کے گڑھے میں گر جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

فھل یھلك الا القوم الفاسقون "پس سوائے نافرمانوں کے اور کوئی جماعت ہلاک نہیں کی جاتی" (الاحقاف)

ان چاروں خصائص کے فقدان سے وہ تمام قومی رذائل پیدا ہو جاتے ہیں جو بالآخر قوم کی قوم کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تباہی کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمارے مندرجہ بالا بیان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کیونکر حکومت نے علماء کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تاکہ عوام پر ان کا تسلط مستحکم ہو جائے۔ اس لیے سب سے پہلے امراء عیش پرست ہوئے۔ اور علماء (الا ماشاء اللہ) نے شدائد کے برداشت کرنے سے گریز کرنا شروع کیا۔ کیونکہ عیش پرست حکام کو متنبہ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ گویا علماء نے صبر و استقامت کے بجائے بے صبری اور دنیا طلبی سے رشتہ جوڑا اور حکومت کے دست و بازو بن گئے۔ اس طرح تواصی بالحق کا نظام بالکل ہی درہم برہم ہو گیا۔

قصہ مختصر۔ خلفاء اور علماء نے کبار اور انکی تبعیت میں حکام و عمال سلطنت سب کے سب ارتکاب معاصی پر دلیر ہو گئے۔ عامۃ الناس نے جب اپنے علماء اور امراء کی یہ حالت دیکھی تو ان کی عملی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو گئی اور امید و ولولے کی جگہ یاس و قنوطی نے لے لی۔ اور غلط قسم کے توکل و تصوف ان میں پھیل گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کی قوم اسلامی آئیڈیلز سے بیگانہ ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

Marfat.com

آج بھی اگر ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں، تو افسوس وندامت سے ہماری گردنیں جھک جائیں گی اور ہمیں بصد حسرت اقرار کرنا پڑے گا کہ ہماری قوم کے اکثر افراد کا دامن سچے ایمان کی متاعِ گراں مایہ سے بالکل خالی ہے
فیا حسرتا علیٰ ما فرطت فی جنب اللہ۔

ایمان راسخ کی جگہ کھلا ہوا شرک مثلاً قبر پرستی۔ غیر اللہ سے توسل، پیر پرستی اور اعاظم پرستی ہماری قوم کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئے ہیں۔ فہم و بصیرت کی جگہ تقلیدِ جامد ہمارا قومی شعار بن چکی ہے۔ یہاں تک کہ علماء اور جہلاء سب اسی میں مبتلا ہیں۔ الا ما رحم ربی وقلیل منہم۔

آج کتنے مسلمان ہیں جو اسلام میں قبر پرستی کو شرک کے مترادف خیال نہیں کرتے۔ دکھ میں، درد میں، مصیبت میں اور رنج و محن میں پیروں، فقیروں اور اولیاء اور اماموں کو خدا کے سوا اس دلیری سے پکارتے ہیں کہ آسمان و زمین تھرا اٹھتے ہیں۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ بہت باحمیت ہیں۔ لیکن ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ علم کی بے حرمتی پر، تعزیوں پر پتھر پھینکے جانے پر، مسجد کے سامنے باجا بجائے جانے پر ان کی رگِ حمیت بھڑک اٹھتی ہے اور وہ ایسی زیادتی کرنے والوں کو خاک و خون میں سلا دیتے ہیں۔ مگر افسوس اس حمیتِ جاہلیت پر کہ خلافِ شریعت امور کی حمایت اور حرام موت مرنے پر۔ یہ لوگ اس قدر دلیر اور جری ہیں، لیکن خدا کی حمایت میں اس قدر کمزور و بزدل ہیں کہ ہمارے اپنے بھائی دن رات خدا کو گالیاں دیتے ہیں۔ اعلانیہ خدا کی توہین کرتے ہیں اور کھلے بندوں خدا کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں مگر ہماری رگِ حمیت نہیں بھڑکتی۔ اور ستم بر ستم یہ کہ ہم لوگ ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے۔ ان سے میل جول رکھتے ہیں اور انھیں اپنی محفلوں میں عزت کی جگہ دیتے ہیں ؎ دین پر حیف ہے کہ دین کا منشا ہے یہی

ہمارا اشارہ اس مشہور اور مفصل حدیثِ قدسی کی طرف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے مجھے گالی دی جب اس نے کسی کو میرا شریک اور ساجھی ٹھہرایا۔ میرے بندہ نے میری اہانت کی۔ جب اس نے میرا دروازہ چھوڑ کر غیر اللہ کا دروازہ کھٹکھٹایا (او کما قال)

ہمارے بھائیوں کو آنکھیں کھولنی چاہئیں اور سنبھلنے کی کوشش کرنی چاہئے پیشتر اس کے کہ خدا کا عذاب انھیں بالکل تباہ و برباد کر دے۔

وان تتولوا یستبدل قومًا غیرکمْ	اگر تم (اے مسلمانو) دین اسلام سے پھر
ثُمّ لا یکونوا امثالکم ۝	جاؤگے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئیگا
(محمّد)	پھر تمہارا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا:

اعمال صالحہ کی جگہ اخلاق ذمیمہ اور رسوم قبیحہ نے لے لی ہے۔ کبائر کا ارتکاب اعلانیہ ہوتا ہے۔ اور قدم قدم پر خدا کے فرمان کو پس پشت ڈال کر فسق اور معصیت کی گرم بازاری ہے علم کی جگہ تقلید جامد اور جہالت کا دور دورہ ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ

"ایک مومن دوسرے کا بھائی ہے۔ ایک کی راحت سے دوسرے کو راحت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایک کو مشرق میں کانٹا چبھے تو دوسرے کو مغرب میں ایذا ہوتی ہے۔" (او کما قال)

لیکن آج مسلمان مسلمان کا گلا کاٹنے پر تُلا ہے۔ اور حسد، بغض و کینہ اور باہمی عداوت مسلمانوں کا قومی شعار بن چکے ہیں۔ بجائے مواخات کے منافرت عام ہے۔ اور ہندوؤں کے میل جول سے ہم میں بھی ہندوانہ رسوم داخل ہو چکی ہیں۔ مثلاً ہندوانہ ذات پات پرستی۔ مذہبی ہندوؤں کی طرح نکاح بیوگان سے احتراز۔ ہندوؤں کی طرح بیوی اور بیٹی کو وراثت سے محروم رکھنا۔ ہندوؤں کی طرح قبروں پر

اعیاد کا انعقاد، غرض ہمارے تمام اعمال و افعال ہندوانہ ہیں، صرف نام اسلامی ہیں۔ اور یہ مرض اس قدر عام ہو گیا ہے کہ پہلے تو ذات بات کا سوال شادی بیاہ تک محدود تھا، لیکن اب یہ لعنت کونسل، ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹی کے انتخابات تک میں جاری ہو چکی ہے۔ ان انتخابات کے مواقع پر یہ سوال نہیں ہوتا۔ کہ کون سا امیدوار قابل ترین ہے۔ بلکہ سید، سید کو ووٹ دیتے ہیں۔ پٹھان، پٹھان کو، راجپوت راجپوت کو۔ زمیندار، زمیندار کو، پھر صوبہ پرستی اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ بنگالی مسلمان ہندو بنگالی کو غیر بنگالی مسلمان پر ترجیح دے گا۔ ایک مسلم سندھی یا حیدر آبادی، غیر مسلم سندھی اور حیدر آبادی کو غیر ملکی مسلمان پر ترجیح دے گا۔ فیا اسفا۔

اسی طرح قومی کاموں میں خیرات کرنا جو قومی حیات کے لیے بمنزلہ آب حیات کے ہے، اس وقت مسلمانوں میں قریباً معدوم ہو چکا ہے۔ کسی قبر کے عُرس کے موقع پر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مسلمان کساد بازاری سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ ابھی کسی قبر کی تعمیر کی ضرورت ہو تو باوجود افلاس قومی ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ جمع ہو جائے گا۔ مگر قومی تعمیری کاموں کے لیے روپیہ ملتا ہی نہیں۔ تو قومی افلاس کا رونا رویا جاتا ہے۔ عورتوں کے حقوق سے اس درجہ تغافل برتا جاتا ہے اور ان پر ایسے ایسے معاشی ظلم روا رکھے جاتے ہیں کہ غیر مذہب کے لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ شاید اسلام میں عورت کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا۔ پنجاب، بمبئی، گجرات وغیرہ علاقوں میں۔ اب تک بیٹی کو ورثے سے محروم کرنا، بیوی کو حق مہر نہ دینا، نکاح بیوگاں کو حرام سمجھنا، روزمرہ کے واقعات ہیں۔ غرض مسلمانوں کی عملی زندگی کا کون سا

پہلو ہے۔ جو اسلامی تعلیمات کی بالکل ضد نہیں۔

مومن است و پیشۂ اُو آذری است
دین و عرفانش سراپا کافری است (اقبال)

اور پھر بھی ہمیں اصرار ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور غیر مسلم مردود ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے (حسرت)

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اطمینانِ قلب، راحتِ نفس اور زندگی میں شگفتگی اور سرور جو ایک مومن کا خاصہ ہوتے ہیں، بالکل مفقود ہو چکے ہیں، لیکن ابھی بھی شاید ہمارے تنزل کی انتہا نہیں ہے کیونکہ ہماری چشمِ بصیرت ابھی تک نہیں کھلی اور قلوب احساسِ زیاں سے خالی ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا (اقبال)

رہا تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، سو اس کا شاید مسلمانوں میں نام و نشان تک بھی باقی نہیں رہا۔ معروف کی بجائے منکرات کی اعلانیہ ترغیب دی جا رہی ہے۔ کتنے کلب ہیں جن میں منکرات کی باقاعدہ اشاعت ہوتی ہے۔ کتنی ہی سوسائٹیاں ہیں جن کا مقصد جرائم کی اشاعت کے سوا اور کچھ نہیں۔ کتنی جماعتیں ہیں جو فاسد خیالات اور باطل عقائد کی تبلیغ کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ کتنے ہی مزارات ہیں جن میں ہندوؤں اور عیسائیوں کی نقل میں ہر سال میلے لگتے ہیں۔ جنھیں عرس کا نام دیا جاتا ہے اور ان میں ہر طرح کے فواحش اور منکرات کا اعلانیہ ارتکاب کیا جاتا ہے۔ اور ہم سب ان منکرات کی نمائش میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔

Marfat.com

حسب الحکم حدیث شریف ۔

من رای منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہٖ و ان لم یستطع فبلسانہٖ (او کما قال)

جس نے تم میں سے منکر دیکھا اسے چاہیئے کہ اسے ہاتھ سے، یعنی بزورِ شمشیر روک دے اور اگر اس کی استطاعت نہ پائے تو اپنی زبان سے ہی اسے روکے ؟

ہم انھیں ہاتھ سے روکنے یا کم از کم اپنی زبان ہی سے ان کی برائیاں بیان کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے ۔ ہمارے علماء رات دن اِن منکرات کو دیکھتے ہیں اور شتر مرغ کی طرح اپنی گردن جھکا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں تا کہ منکرات و فواحش کی یہ آندھی ان کے سر سے اس طرح گزر جائے جیسے سرے سے اس کا وجود ہی نہیں تھا ۔

یہی نہیں بلکہ اب تو امر بالمنکر اور نہی عن المعروف داخلِ فیشن ہو گیا ہے ۔ اور ہماری نام نہاد اِسلامی سیاسی جماعتوں میں اعلانیہ شراب کی دعوتیں ہوتی ہیں ۔ ان کے جلسوں میں اسلامی شعائر کا اعلانیہ تمسخر اڑایا جاتا ہے ۔ ان کی مجالسِ عاملہ کے اراکین شراب خواری، قمار بازی، زنا اور دوسرے فواحش کا اعلانیہ ارتکاب کرتے ہیں ۔ اور وہ پھر لیڈر کے لیڈر ۔ دن رات وہ اسلامی حکومت کا پرچار کرتے ہیں ۔ مگر کیا وہ ایسی ہی اسلامی حکومت ہو گی جس کا خاکہ ہم ان کی کمیٹیوں میں ہر روز دیکھتے ہیں ۔ فیشن ایبل مسلمان نہ صرف خود اسلامی پردے کی پابندی نہیں کرتے بلکہ اپنے احباب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنی بیویوں کو بے پردہ کریں ۔

بہت سے جدید تعلیم یافتہ نہ صرف خود نماز روزے کی پابندی کو (معاذاللہ) فضول اور بے کار خیال کرتے ہیں بلکہ ایسا کرنے والوں کو احمق اور بے وقوف سمجھتے ہیں اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ اسلام کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد ہیں ۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد
وائے گر وا پس امروز شود فردائے

تواصی بالصبر کی بجائے ہم بے صبری پر اس قدر جری ہیں کہ ذرا سی تکلیف سے بچنے کے لیے ہم اپنے دین، ایمان اور زندگی کے اصولوں تک کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ذرا سے دنیوی مفاد کی خاطر ہم اپنے ایمان و اسلام اور ملک و ملت تک کو فروخت کر دیتے ہیں۔ ذرا سی حاجت براری کے لیے ہم اللہ کا دروازہ چھوڑ کر غیر اللہ کے آستانے پر ماتھا ٹیکنے سے بھی نہیں شرماتے۔

نبوت نہ گر ختم ہوتی عرب پر　　کوئی ہم پہ مبعوث ہوتا پیمبر
تو ہے جیسے مذکور قرآں کے اندر　　ضلالت یہود اور نصاریٰ کی اکثر
یونہی جو کتاب اس پیمبر پہ آتی
تو گمراہیاں سب ہماری بتاتی

ان حقائق کے ہوتے ہوئے کیا اب بھی کسی کو شبہ رہ جاتا ہے کہ مسلمان کیوں تنزل و خسران کے انتہائی گڑھے میں گر چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو جو اس بدبخت قوم کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں برا بھلا کہا جاتا ہے اور ہر طرح سے ان کی زباں بندی کی سعی لاحاصل کی جاتی ہے۔ انھیں وہابی، دشمن خدا و رسول وغیرہ کے القاب سے پکارا جاتا ہے۔ عوام کالانعام کی نظروں میں اب وہابی کا لفظ ایسا ہوا بن گیا ہے کہ جہاں کسی مولوی یا پیر نے اپنے کسی مخالف کو وہابی کہا، بس وہ گردن زدنی ہو گیا۔ مولانا حالی نے خوب کہا ہے۔

اسے جانتے ہیں بڑا اپنا دشمن
ہمارے کرے عیب جو ہم پہ روشن
نصیحت سے نفرت ہے ناصح سے ان بن
سمجھتے ہیں ہم رہ نماؤں کو رہزن

یہی عیب ہے سب کو کھویا ہے جس نے
ہمیں ناؤ بھر کر ڈبویا ہے جس نے

مسلمان مصلحین کا گلا گھونٹ سکتے ہیں۔ اصلاح کی آواز کو دبا سکتے ہیں مگر خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس کے قوانین اٹل ہیں، جو ان کی مخالفت کرتا ہے، تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی تلاش میں خدا اور رسول کی نافرمانی تو کر سکتے ہیں مگر اس کی مخالفت اور عناد کے نتائج سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں۔

رذرت ار پیش می رود بابا   با خداوند غیب داں نہ رود

تم ہمیں تو جھوٹ بول کر دھوکہ دے سکتے ہو، مگر خداوند عالم الغیب کے سامنے تو تمھارا جھوٹ نہیں چل سکتا۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر بھاگنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے مجوزہ نسخے پر عمل کریں۔ ابھی بھی وقت ہے۔ انھیں چاہیئے کہ وہ اپنے روٹھے ہوئے خدا کو منانے کی کوشش کریں۔ ورنہ یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم ہ " پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی تباہی یقینی ہے۔"

خاتمہ سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ مندرجہ بالا تمام مباحث کا لب لباب پیش کریں اور وہ یہ ہے کہ خسران کے مہلک مرض سے بچنے کا جو بے خطا نسخہ اس سورت میں پیش کیا گیا ہے وہ عمومی نسخہ ہے اور اس میں کسی خاص گروہ یا فرقہ

بندگی یا کسی خاص قوم یا جماعت کی تخصیص نہیں۔ اس کی مثال دوا کی ہے۔ اگر ایک دوا ایک مرض کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے تو وہ ہر اس شخص کو جو اس مرض میں مبتلا ہے اور تمام ہدایتوں و پرہیز کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دوا کا استعمال کرتا ہے تو وہ دوا اللہ کے حکم سے اس مرض سے شفا دے گی۔ اور ہندو یا مسلم یا عیسائی یا یہودی کی تفریق نہیں کرے گی۔ اسی طرح یہ نسخہ بھی ہر اس قوم کو جو اس پر اسی طرح عمل کرتی ہے۔ جس طرح ہادیٔ برحق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھلایا۔ خسران کے مرض سے نجات دے گا۔ علم النفس کی زبان میں ہم اسے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جماعتی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری وحدت فکری ہے جسے اسلام کی زبان میں ایمان باللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک مومن کے تمام افکار کا محور خدا کی ذات ہے۔ وحدت فکری کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری کی ساری جماعت ایک مرکزی فکر و عقیدہ کے گرد مجتمع ہو جائے گی اور اس مرکزی عقیدہ کی تائید میں ہر قسم کی جانی اور مالی قربانیاں دینے کیلئے تیار ہو جائیگی۔ یہ عمل صالح کی [illegible] ہے۔ جب کسی قوم میں وحدت فکری کے ساتھ ساتھ انتہائی قربانی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اب وہ خیر عام کیلئے کھڑی ہو جاتی ہے جسکو اسلام نے تواصی بالحق سے تعبیر فرمایا ہے۔ ہمیں حق کا لفظ استعمال کر کے اس طرف رہنمائی فرمائی کہ ملت اسلامیہ میں کوئی غدار نہ ہو۔ خائن ملت نہ ہو۔ نفس حق کی حمایت کے لیے کمربستہ ہو۔ اب اگر اس راہ میں اس جماعت نے انتہائی عزیمت اور استقامت کا ثبوت دیا تو وہ ایک بے پناہ سیلاب کی طرح تمام باطل قوتوں پر چھا جائے گی۔

آج دنیا دکھی ہے۔ اس کا قلب مجروح مرہم امن کا متلاشی ہے۔ [illegible] روس اور امریکہ جنہوں نے دنیا کو امن کے پر فریب اختلافات سے دھوکا دیتا رہا تھا، آج بے نقاب ہو چکے ہیں اور جنگ جیت کر صلح میں ہار رہے ہیں۔ اس لئے عیسائی، یہودی اور اشتراکی سرمایہ دار [illegible] اپنے اپنے نسخے پیش کر رہے ہیں

لیکن حقیقی نجات دہندۂ عالم یعنی اسلام کی آواز خاموش ہے اور مسلمانوں پر مُردنی چھارہی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ پہلے خود مسلمان بنیں پھر تمام دنیا کو اسلام کی دعوت دیں اور دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کرائیں کہ مُتمدّن انسان نے جب کبھی خدا سے بغاوت کی ہے منہ کی کھائی ہے۔ دُنیا کو امن ومساوات، اخوت، وحُرّیت صرف خدا کی غلامی میں ہی مل سکتی ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ تمام کفر کی طاقتوں کو چیلنج دیں اور اگر ہم میں ایمان ہے تو جیت ہماری ہی ہوگی۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

فبشر عبادی الذین یستمعون	پس میرے ان بندوں کو خوش خبری
القول فیتبعون احسنه اولئك	دو جو بات سنتے ہیں۔ پھر اس میں سے
الذین هدا هم الله واولئك	جو اچھی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔
هم اولوا الالباب	وہی لوگ ہیں جنھیں خدا نے سیدھی راہ

کی طرف ہدایت دی ہے۔ اور وہی لوگ ہیں جو عقلمند ہیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

دولت اور طاقت پر دھوکہ کھانے سے متعلق سورۂ ہمزہ اور سورۂ فیل کی تفسیر ملاحظہ کیجئے۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

سُوْرَۃُ الْھُمَزَۃ

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ ۙ
نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ۙ
یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخْلَدَہٗ ۚ
کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ ۖ
وَمَاۤ اَدْرٰىکَ مَا الْحُطَمَۃُ ؕ
نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ ۙ الَّتِیْ
تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَۃِ ؕ اِنَّھَا
عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ ۙ فِیْ
عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ ۠

ترجمہ: کامل تباہی اور ہلاکت ہے ہر اس
شخص کے لیے جو لوگوں کی عیب چینی کرتا
ہے جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر
رکھتا ہے اسے یقین ہے کہ اس کا مال
اسے بچائے رکھے گا [illegible]
بدولت مرض خسران سے [illegible]
ہمیشہ زندہ رہے گا ہرگز نہیں ایسا ہرگز
نہیں ہو سکتا [illegible]
ہے وہ ہاتھ حطمہ میں ڈالا جائے گا

اور اے پیغمبر آپ کو کیا معلوم کہ وہ حطمہ کیا چیز ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی
آگ ہے جو دلوں پر چھا جائے گی اور یقیناً وہ آگ لمبے لمبے ستونوں میں
انھیں گھیرے ہوئے ہوگی

سورۃ والعصر سے ربط:

قرآن حکیم کی [illegible] ہر سورت کی تمام آیتیں باہم مربوط ہوتی ہیں [illegible]

سورتوں کا باہمی ربط بھی ایسا فطری ہے کہ بعض مفسرین نے اسے جملۃً واحدہ سے تعبیر فرمایا، اور واقعی یہ بات ہے کہ نظم قرآن پر تدبر سے ان کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بسا اوقات اس ربط میں بعض بہت ہی عظیم الشان نکات اور فوائد پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جس شخص کا سینہ نظمِ قرآن کے لیے کھول دے اسے گویا فہمِ قرآن کی کنجی مل گئی۔

سورۂ ہمزہ کا سورۂ والعصر سے نہایت لطیف ربط ہے۔ اس سورت میں بیان کیا گیا ہے کہ صرف وہی جماعت مرضِ خسران سے محفوظ رہ سکتی ہے جو ایمان باللہ، عملِ صالح۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے چہارگانہ خصائص سے متصف ہو اور اس میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ جو جماعت بھی ان اصولوں پر عمل کرے گی وہ تنزّل اور خسران سے محفوظ رہ کر ابدی ترقّی سے ہمکنار ہو گی۔

اب اس دعوے کے مقابلے میں وہ معترضین فوراً سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک فریق مادّیت کا داعی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ، انسانیت کا دارومدار صرف مادّی اسباب کی فراہمی پر ہے اور یہی انسان کی تمام مساعی کا مآل اور محور ہے۔ مادّی اسباب ہی انسانی مسرت کے ضامن ہیں۔ ان کا مسلک تو یہ ہے کہ:۔

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا
ستّار عیوب و قاضی الحاجاتی

سرمایہ دار اور اشتراکی اگر اس نظریئے کی حمایت کریں تو بے جا نہ ہو گا۔ ان کے فلسفۂ حیات کا محور یہی ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ بعد میں آئے گی لیکن

تعجب ہے کہ خود مسلمان بھی آج اسی رَو میں بہہ رہے ہیں۔ ان کی ہر مجلس میں یہی رونا رویا جاتا ہے کہ فنڈز (روپیہ) ہونے چاہئیں۔ روپیہ ہو تو سب کام آپ ہی آپ انجام پا جاتے ہیں۔ روپیہ ہر قومی کمزوری کی دوا ہے۔ روپیہ ہو تو سبھی موافق اسباب آپ ہی آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح سب لوگ سورۃ العصر کے حقائق کا عملاً انکار کرتے ہیں۔

اور معترضین کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ:

دنیا کا اصول جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is Right) کا ہے۔ (Bright Force) قوت کے بغیر سرمایہ اور دوسرے سب مادی اسباب بے کار ہیں۔ دنیا میں حکومت اسی قوم کی رہی ہے جس کے پاس زور بازو (Brute Force) اور لاٹھی تھی۔ کمزور اور ناتواں قوموں کو جابر اور قاہر قوموں نے ہمیشہ مسل کر ملیامیٹ کر دیا ہے۔

قرآن حکیم نے پہلے معترض کا جواب موجودہ سورت میں اور دوسرے معترض کا جواب آئندہ سورت میں دیا ہے۔ اس لیے اس سورت میں خود معترض کا بیان پیش کیا گیا ہے کہ مال و زر بقائے دوام کا موجب ہے۔ آج افرنگ اور اس کے تمام پیرو اسی اصول پر عمل پیرا ہیں۔ اور ان کی تمام مساعی کا مرکز مال و زر کی فراہمی اور زیادہ سے زیادہ قوت (Brute Force) مہیا کرنا ہے۔ ان دونوں نظریوں کا ابطال بنی نوع انسان کے دماغی توازن کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے۔

حلِّ لغات:- وَیل: قرآن حکیم میں جا بجا ان اخلاقی خرابیوں کے نتیجے میں اور سزا کی تعبیر کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جن کے اثرات صرف افراد تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ قومی اور ملی نقصانات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً

Marfat.com

ویل لکل افاکٍ اثیم ۔ فویل للمصلّین ۔ ویلٌ للمطففین

اور اس کے معنٰی ہر جگہ دنیا و آخرت دونوں کی تباہی و نامرادی ہیں مثلاً ارشاد ہوتا ہے ۔

فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ۔ الاٰیۃ (بقرہ)

"پس ویل ہے ان لوگوں کے لیے جو خود کتاب کو لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ویل کی تشریح اسی میں اللہ تعالٰی نے خود فرما دی ہے ۔ یہ آیت علمائے بنی اسرائیل کے بارے میں آئی ہے اور ان کی بداعمالیوں کی سزا کی تصریح بھی اللہ تعالٰی نے فرما دی ہے ۔

فما جزآء من یفعل ذالک الاّ خزی فی الحیوٰۃ الدّنیا و یوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب (بقرہ)

"پس ان لوگوں کو جو ایسی بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں، سوائے اس کے کیا سزا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں وہ ذلیل و خوار کر دیئے جائیں اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں لوٹائے جائیں"۔

پس یہاں سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ ویل سے مراد دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں سخت ترین عذاب کے ہیں ۔

بعض مفسرین کرام نے ویل کی تفسیر کے ضمن میں لکھا ہے کہ وہ جہنم کی وادیوں میں سے ایک وادی کا نام ہے ۔ لیکن یہ ویل کی تصویر کا صرف ایک ہی رُخ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ویل کے مفہوم کو صرف آخرت کے عذاب پر ہی حصر کر دیں جب خود قرآن حکیم نے تصریح فرما دی ہے کہ اس کے مفہوم میں دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی دونوں شامل ہیں ۔

ھُمزۃ اور لُمزۃ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور ان میں فاعلیت کے معنٰی کی

Marfat.com

کثرت پائی جاتی ہے یعنی بہت زیادہ **ھمز** اور **لمز** کرنے والا ۔ ان دونوں الفاظ کے معنوں میں مفسرین کرامؒ نے کئی اقوال نقل کیے ہیں ۔

ابن جریرؒ کے نزدیک کل مغتاب للناس یغتا بھم ولیغضھم ۔ ہر وہ شخص جو غیبت اور اہانت کرے ۔

حضرت عبداللہ ابن عباس کا ایک اثر منقول ہے : ۔

ھم المَشّاؤن بالنمیمۃ المفرقون بین الاحبۃ الباغون اکبر الغیب (ابن جریر)	اور وہ چغل خور غیبت کرنے والے دوستوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے والے اور نہایت ہوشیاری سے بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب پر دلیر ۔ (ابن جریر)

ایک اور اثر ان سے منقول ہے جس کا قول ایک ہی ہے ۔

ھو المشاء بالنمیمۃ المفرق بین الجمع المغری بین الاخوان ۔ (تفسیر بیان القرآن نواب صدیق حسن)	وہ چغل خور غیبت کرنے والا جماعتوں میں پھوٹ ڈلوانے والا ، بھائی کو بھائی سے لڑا کرنے والا ۔

صاحب کشاف نے ہمز اور لمز کی تشریح کی ہے ۔ وہ لکھتا ہے : ۔

الھمزۃ کسر کاللمز والمراد الکسر اعراض الناس والغض منھم واغتیابھم والطعن فیھم ۔	ہمز کے معنی لمز کی طرح توڑنے کے ہیں اور یہاں دوسرے آدمیوں کے ننگ ناموس کو پامال کرنے ان کی اہانت کرنے ان کی پیٹھ پیچھے برائی کرنے اور نقص لگانے ۔

تشنیع کا نشانہ بنانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔

صاحب کشاف لکھتا ہے : ۔

ہُمَزَۃ فُعلۃٌ کے وزن پر ہے اور فعلۃ کا وزن اس بات پر دلالت کرتا ہے

کہ اس فعل کا صدور فاعل سے بطور عادت کے ہوتا ہے یعنی اس کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے۔ مثلاً اللعنۃ، جسے لعنت کرتے رہنے کی عادت ہو۔ الضحکہ، ہنسی کا عادی یعنے بہت زیادہ لعنت کرنے اور ہنسی کرنے والا۔

اسی طرح لمز کے معنیٰ ہیں طعن یا ضرب اور دفع کے۔ ابن جریر نے اس کے معنیٰ لوگوں پر عیب لگانے اور طعن کرنے کے کیے ہیں۔

گویا **ھُمَزَۃٍ** کے معنیٰ یہ ہے لوگوں کے ننگ و ناموس، حرمت و عزت کو بہت زیادہ پامال کرنے والا، جماعتوں میں پھوٹ اور دوستوں میں جدائی ڈلوانے والا، بھائیوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے والا۔

اور **لُمَزَۃٍ** کے معنی یہ ہیں:۔

لوگوں پر بہت زیادہ زور و ظلم کرنے والا اور انھیں مار مار کر اپنے سے دور کرنے والا۔ اب اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ یہ دونوں الفاظ جماعتی خصائص کا اظہار کرتے اور ایمان، عمل صالح اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی ضد ہیں۔ اور یہ دونوں ان مخصوص جماعتوں کے اوصاف ہیں جو مذہب کی ضد میں دنیا سے اپنی سیادت کا لوہا منوانا چاہتی ہیں۔ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

نظام پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جیسا کہ ہم آگے چل کر تشریح کریں گے۔ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت دونوں جمہور کی عزت و ناموس کو پامال کرکے انھیں غلام بناتے اور اپنی مطلب براری کے لیے آلۂ کار بناتے ہیں اور اگر جمہور ان کے خلاف آواز بلند کریں تو جبر و زور سے انھیں دباتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑوا کر اپنا کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان معنوں کی تائید اگلی دو آیتوں سے ہوتی ہے۔

Marfat.com

الذی جمع مالاً وعدّدہ	اپنے مال کو جمع کرتا اور اسے گن گن کر رکھتا
الذی جمع مالاً واحصٰی عددہ	ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے
ولم ینفقہ فی سبیل اللہ ولم	دریغ کرتا ہے اور اس میں اللہ کا حق ادا نہیں
یؤدّ حق اللہ فیہ ولکنہ جمعہ	کرتا۔ بلکہ اسکے برعکس مال کو حفاظت [illegible]
فاوعاہ وحفظہ (ابن جریر)	سمیٹ سمیٹ کر جمع رکھتا ہے۔

صاحب کشاف لکھتا ہے۔

عدّدہ ای جعلہ عدّۃ لحوادث الدھر۔

زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے ڈھال بناتا ہے یعنی مال کو اس لیے جمع کرتا ہے کہ وہ اسے حوادث زمانہ سے بچائے گا۔ اسی لیے وہ اسے خرچ کرنے سے دریغ کرتا ہے۔

یحسب ان مالہٗ اخلدہ	یعنی وہ یقین کرتا ہے کہ وہ مال [illegible]
ای یظن یتیقن انّ مالہ الذی	جمع کیا اور گن گن کر رکھا ہے اور [illegible]
جمعہ واحصاہ وبخل فی انفاقہ	کے واللہ کی راہ میں خرچ کرنے [illegible]
مخلدہ فی الدنیا فیزید عند	ہے۔ وہ اسے دنیا میں [illegible]
الموت (ابن جریر)	اور موت کو اس سے [illegible]

صاحب کشاف نے ذرا تفصیل سے کام لیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

ای طوّل المال امله ومنّاه الا	یعنی اس نے اپنے مال سے [illegible]
مانی البعیدۃ حتی صار اصبح	وابستہ [illegible]
لفرط غفلتہ وطول املہ یحسب	خیال باندھ رکھے [illegible]
ان المال ترکہ خالدا فی الدنیا	[illegible] مال [illegible]
اوسلسل من تشئید البنیان	[illegible] اس کام میں [illegible] باقی

Marfat.com

من الفخر (تفسیر کشاف) رہے گا، یا یہ کہ وہ بڑی بڑی مضبوط عمارتیں پتھر کی بناتا ہے تاکہ اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے۔ گویا اسے یقین ہے کہ مال یا اس سے بنائی ہوئی عمارتیں غیر فانی ہیں اور اپنے مالک کو بھی غیر فانی بنا سکتی ہیں۔"

ان دونوں آیتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اشارہ ایک خاص نظریۂ حیات کی طرف ہے جو مذہب کی ضد میں قائم کیا گیا ہے اور جس کا منشاء یہ ہے کہ انسان اپنی تمام کوششوں کو کسی بالا و برتر ہستی کے مضامین کے تابع بنائے بغیر محض دنیا کی آسائش کے حصول اور عیش و مسرت کی تلاش کے لیے وقف کر دے۔ چنانچہ دوسری جگہ اس قلبی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

قال ما اظن ان تبید هذه ابدا	اس نے کہا مجھے تو یقین نہیں۔ کہ
و ما اظن الساعة قائمة	میرا باغ کبھی بھی خراب ہوگا اور میں تو یہ بھی
الآیۃ (الکہف)	جانتا ہوں کہ قیامت کبھی بھی قائم نہیں ہوگی۔"

اور اگر (بفرض محال) مجھے کبھی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش کیا گیا۔ تو وہاں بھی (میری عزت افزائی ہی ہوگی اور) اس باغ سے بہتر باغ ملے گا۔"

الذی جمع مالاً و عدّدہ محل نصب ہے اور اس میں مذمت کا پہلو پایا جاتا ہے یعنی اس کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ مال کو جمع کرتا اور گن گن کر رکھتا ہے۔ اس سے بھی صاف عیاں ہوتا ہے کہ یہ ایک جماعتی بیماری ہے جو اقوامِ عالم کو صحیح نظریۂ حیات سے باغی ہونے کی صورت میں لگ جاتی ہے۔ اور اگر خداداد عقل و بصیرت سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مادہ پرستانہ نظریہ حیات کی اس سے زیادہ صحیح تصویر ناممکن ہے۔

سرمایہ داری نظام ہو یا اشتراکی۔ دونوں کی مساعی کا مآل یہی ہوتا ہے

کہ زیادہ سے زیادہ مادی اسباب اپنے لیے فراہم کرلیں۔ سرمایہ داری نظام میں تو تمام کارخانوں، تمام بینکوں اور تمام تجارتی اداروں کا مقصد وحید یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کیا جائے۔ وہ کوڑی کوڑی کا حساب رکھتے ہیں۔ اور ہر لحظہ اور ہر آن سرمایہ دار کی نظر سرمائے کی بڑھوتری پر ہوتی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر حساب رکھنے کا جنون اس درجہ سوار ہوتا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دن رات اپنے ہی کھاتوں میں گم رہتا ہے۔ وہ نفع کو بڑھانے۔ سرمائے کو دوگنا چوگنا کرنے کی دھن میں ہر شخص کی حق تلفی کرنے اور اسے دھوکہ دیتا رہتا ہے اور غلط امیدوں سے اپنے تئیں بہلاتا رہتا ہے۔

اشتراکی نظام بظاہر سرمایہ داری سے مختلف ہے، لیکن درحقیقت اس کی مساعی کا مآل بھی واحد ہے۔ صرف طریق کار میں فرق ہے۔ وہ بھی خدا سے اور مذہب سے بغاوت اور مادہ پرستی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دنیا میں نظام زندگی (Philosophy of life [illegible]) کے متعلق دو ہی نظریے ہو سکتے ہیں۔ ایک نظریہ تو خدائی نظریہ حیات ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے اور جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب نے یہی نظریہ حیات پیش کیا ہے اور وہ نظریہ یہ ہے کہ یہ زمین خدا کی ملکیت ہے اس لیے اس پر صرف خدا کا حکم جاری ہونا چاہیئے۔ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ یعنی نائب ہے اور اس کے احکام کو نہ صرف نافذ کرنا بلکہ ان کی کمال اطاعت اور سچے دل سے اس حقیقی مالک کی بندگی و پرستش کرنا اس کا فرض منصبی ہے اور حکومت و سلطنت مال و دولت اور تمام متاع دنیوی، یہاں تک کہ اس کی اپنی جان اور اسکی اولاد سب کے سب خدا کا عطیہ اور اس کی امانت ہیں جو محض بطور وسائل کے عطا ہوئے

ہیں تاکہ وہ دنیا میں خدائی مشن پورا کر سکے۔ اس کے تمام اعمال کا محرک خدا پر اعتقاد، تقویٰ اور رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تئیں ہر عمل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔

دوسرا نظریۂ حیات جو خدا کی بغاوت پر مبنی ہے، مادی نظریۂ حیات ہے۔ اور اس میں گو اشتراکیت یا اشتمالیت (سوشلزم یا کمیونزم) سرمایہ داری نظام کو فنا کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کا بنیادی تخیل بھی خالص مادی اور خدا و فطرت سے بغاوت ہے۔ چنانچہ کارل مارکس کا شاہ کار یعنی تاریخ کا مادی تصور (material conception of History) بھی اسی اساس پر مبنی ہے۔ اس کا اساسی تخیل ہی یہ ہے کہ دنیا کی تمام ترقی اور قوموں کا عروج و زوال، تمام تاریخی وقائع و انقلابات، تمام کے تمام مادی اسباب و محرکات کے تابع ہیں۔ ان کے تمام نتیجات بھی مادی ہیں۔ روحانی طاقتیں (spiritual forces) اور اخلاقی مقتضیات (moral necessities) سب کالعدم ہیں۔

قصہ مختصر، انسان کے اخلاقی نظریئے، سیاسی رجحانات اور معاشی تعمیریں سب کی سب مادی اور اقتصادی مقتضیات کا نتیجہ ہیں۔ یہاں تک کہ خود مذہب اور خدا کا عقیدہ بھی انسان کی اقتصادی بے بسی کی پیداوار ہے اور موجودہ اخلاق سب کی سب اقتصادی عدم مساوات اور معاشی جور و ظلم کے پیدا کردہ ہیں، جن کی مذہبی رہنماؤں نے مظلوموں کو ظالموں کے ظلم پر قناعت سکھلانے کے لیے تعلیم دی۔ جس طرح ایک ڈاکٹر جب مریض کے درد کا علاج نہیں کر سکتا تو اسے افیون دے دیتا ہے تاکہ وہ بے حس ہو جائے۔ اس لیے بمصداق حدیث شریف۔ الکفر ملتہ واحدۃ بولشوزم ہو یا سوشلزم یا کمیونزم سب کے سب سرمایہ داری نظام کی طرح مادہ پرستی پہ مبنی ہیں۔ دونوں مادہ پرستی اور اقتصادیات کو انسان کے خسران کا واحد علاج تصور

کرتے ہیں۔ دونوں، انسان کی تمام مساعی کا محور و مرکز، سامانِ معیشت کی فراہمی، اس کی کثرتِ طلب قرار دیتے ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں فرق اساسی تخیل یا نقطۂ نظر کا نہیں بلکہ طریقِ کار کا ہے۔ دونوں اس پر امر پر متفق ہیں کہ انسانی خوشحالی، فارغ البالی اور دائمی مسرت کے لیے سامانِ معیشت (جس کا دوسرا نام اقتصادئین نے دولت رکھا ہے) کی فراوانی لازمی ہے۔ فرق صرف دولت کی پیدائش کے وسائل اور اس کی تقسیم کے ذرائع میں ہے۔ ورنہ دونوں کا نظریہ یہی ہے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اقبالؒ نے اس خیال کو پیش کیا ہے

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

اول الذکر نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے کے بعد انسان کے تمام اعمال و افعال اختیاری اور محض خواہشِ نفس کا نتیجہ نہیں رہتے، بلکہ اس کا ہر کام خدا کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے اس کی تمام زندگی خدا کے احکام کی مطیع ہو جاتی ہے اور خدا کی خوشنودی کا حصول اس کی زندگی کا مقصدِ وحید ہو جاتا ہے۔ اس کی معاشرت اس کا معاشی نظام اس کی سیاست سب اللہ کی رضا اور حکم کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس کے نظامِ زندگی میں جبر و ظلم استحصال بالجبر اور لوٹ کھسوٹ، ملکوں اور قوموں کو غلام بنانے۔ عدمِ مساوات اور مسابقت ([illegible]) یعنی جماعتی تصادم اور نفرت کی قطعی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس دوسرے نقطۂ نظر کے اختیار کر لینے کے بعد انسان شیطانی نظام کا پابند ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی کا مقصد صرف نفس پروری یا قوم پروری ہے۔ اس لیے وہ ہر بے راہ روی کو اختیار کرنے سے باز نہیں آئے گا بشرطیکہ وہ اس مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہو۔ چنانچہ مغربی اقوام کی معاشرت۔ ان کا اقتصادی

نظام، ان کی سیاست سب کی سب خود غرضی ہوسِ و استعمار کا نمونہ ہیں۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے کہ ان دونوں نظریوں میں اشتراکِ عمل ممکن ہے۔ مغرب کے اتباع میں بعض مسلمان بھی مذہب کو ایک مفروضہ قسم کی روحانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان چند عبادات کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ اگر غیر اسلامی معاشرت یا غیر اسلامی معاشی نظام یا غیر اسلامی سیاست کو اختیار کرے تو مضائقہ نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک مذہب صرف انسان کا خدا کے ساتھ ایک موہوم سے تعلق کا نام ہے۔ اس لیے وہ مغرب کی نقالی میں (secularization of state) ریاست کو مذہب سے الگ کرنے) کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں لیکن قرآن حکیم کا نقطۂ نظر یہ نہیں کہ (to give to Kaiser what his due give to god what is His) "قیصر کا حق اسے دو اور خدا کا حق خدا کو دو" وہ تو یہ کہتا ہے کہ اگر تمہاری تمام انفرادی اور جماعتی زندگی خدا کے فرمان کے تابع نہیں۔ تو پھر روحانیت اور مذہبیت اور مسلمان ہونے کا خیال ہی ترک کر دو۔ جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ یا دو بادشاہ ایک ملک میں فرماں روا نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اطاعتِ الٰہی اور اطاعت غیر اللہ ایک سینے میں جمع نہیں ہو سکتیں ؎

اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل\
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر۔ اقبالؔ

مثلاً ایک تہجد گزار سود خوار بھی ایسا ہی بُرا اور اراذل النّاس ہے جیسا کہ ایک فاسق و فاجر سود خوار۔ ان دونوں میں تمیز کرنا اور حد فاصل قائم کرنا محض خوش خیالی ہے اور فریبِ نفس کا نتیجہ۔ انسان اپنے معاشی ماحول اور معاشرتی اور سیاسی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اسی لیے جب نام نہاد مسلمان مغربی معاشرت اختیار کر لیتے ہیں تو ان میں بھی وہی بےحیائی، عریانی اور بےغیرتی وغیرہ پھیل جاتی ہے جو خود

مغربی معاشرے کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے صرف دو جماعتوں کا وجود تسلیم کیا ہے۔ اولیا اللہ اور اولیاء الشیطان یا کافر اور مادہ پرست وغیرذالک۔

اب قرآن حکیم نے دوسرے نظریۂ زندگی کے پرستاروں کے مخصوص امتیازات کی تصویر ہُمَزَہ اور لُمَزَہ کے دو لفظوں میں کھینچ کر رکھ دی ہے۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ قوموں کی سیرت اور ان کے کردار کے نقوش اُجاگر کرنے کے لیے ایک ایک دو دو لفظ استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس سے بہتر قلمی تصویر صفحوں اور کتابوں میں نہیں کھینچی جا سکتی۔ چنانچہ ان دو لفظوں میں آپ سرمایہ داری نظام کی تمام تاریخ پڑھ سکتے ہیں۔ انھی دو الفاظ میں آپ اشتراکیت کی سیرت اور ان کی تمام گزشتہ تاریخ اور ان کا آئندہ کردار دیکھ سکتے ہیں۔ سرمایہ داری کے متعلق آپ بھی تسلیم کریں گے کہ اس کا ہُمَز (لوگوں اور قوموں کے ناموس کو اپنے مفاد کی خاطر پامال کرنا) تو اظہر من الشمس ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں لیکن اشتراکیوں اور اشتمالیوں کے گزشتہ کارہائے نمایاں اور ان دونوں الفاظ کو منطبق کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آزادی، مساوات اور خدمت خلق کے نعروں سے وہ اپنی سیاہ کاریوں کی طرف عامۃ الناس کی توجہ مبذول ہونے ہی نہیں دیتے۔ عوام تو درکنار اکثر بے بصیرت خواص اور تعلیم یافتہ بھی انھیں بنی نوع انسان کا نجات دہندہ تصور کرتے ہیں اور نہایت وثوق سے کہتے ہیں کہ بنی نوع انسان کا مستقبل اشتراکیت کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اگر اشتراکی لٹریچر کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کی اکثر کتابیں تمام تر بورژوا (طبقۂ اعلیٰ) کی نفرت اور ان کے خلاف پرولتاری (طبقۂ ادنیٰ) کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے وقف ہیں۔ وہ بدترین قسم [illegible]

کی دعوت دیتی ہیں ، اور پرولتاری کو بورژوای اثر و اقتدار سے نکلنے کے لیے ہر ممکن ذریعے کو اختیار کرنے اور بزورِ شمشیر انقلاب (Armed Revolution) کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ حق و انصاف ان کے نزدیک بے معنی الفاظ ہیں۔ چنانچہ یہ داعیانِ حریت و مساوات اپنے مخالفین پر گھناؤنے سے گھناؤنے الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ جو جھوٹ بھی وقت پر کام دے وہ انکے لیے جائز ہے۔ اپنے اغراض کے پورا کرنے کے لیے جس قدر کشت و خون بنی نوع انسان کا ان خیر خواہوں نے کیا ہے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا انقلاب پیش کر سکتا ہے۔ گزشتہ خون خرابوں اور قتل عاموں کو تو خیر جانے دیجیے۔ کیونکہ یہ علم برداران حریت کہہ سکتے ہیں کہ وہ انقلاب کے شروع کے افسانے ہیں اور ابتدائے انقلاب میں چونکہ پہلے جور و استبداد کا عمل ہوتا ہے اس لیے ایسے جور و ظلم ہوتا ناگزیر ہے۔ اور خود انقلابی بھی اپنے اصولوں سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے۔ موجودہ زمانے کے روس کو ہی لیجیے جس پر سالہا سال سے انقلابی آمریت (Revolutionary dictatorship) قائم ہے اور جسے کمیونسٹ تعلیمات کا شاہکار کہا جاتا ہے ہم روزمرہ دیکھتے تھے کہ جب جرمن، ہوسِ اقتدار میں مختلف ممالک کا شکار کر رہا تھا، تو کمیونسٹ لیڈر اور کمیونسٹ اخبار، ہٹلر اور ہٹلریت کے خلاف چیخ چیخ کر کروبیوں کے بھی کان بہرے کر رہے تھے۔ اور کوئی بڑے سے بڑا سفید جھوٹ جو وہ ہٹلر کے خلاف گھڑ سکتے تھے، ایسا نہ تھا جسے جلی حروف میں شائع نہ کیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے کہ روسی حکومت آیۂ رحمت ہے۔ یہ تمام اقوامِ عالم کی آزادی کی محافظ اور سچی مساوات کی ضامن ہے۔ لیکن جب اسی خرس روس یعنی کمیونسٹ حکومت نے مشرقی یورپ کی مختلف سلطنتوں کو کسی نہ کسی بہانے ہڑپ کرنا شروع کیا اور کسی کے پٹرول اور کسی کے گیہوں کے کھیتوں کی وجہ سے ان پر

اپنا تسلط ضروری خیال کیا اور ایران اور ترکیہ سے بدترین بدعہدی کر کے ان کے مختلف علاقوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ تو نہ صرف روس کے اخبار اور انقلابی مصنف اس پر خاموش رہے اور اس پر مختلف توجیہیں کر کے عام پبلک کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کرتے رہے بلکہ دوسرے ممالک کے کمیونسٹ اور علم برداران حریت و مساوات انسانی ایسے خاموش ہوئے کہ گویا انھیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ چنانچہ موجودہ روسی حکومت کی تصویر ایک انگریز مصنف نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچی ہے۔

"ماسکو اب زار روس کی حکومت کی طرح نئی صورت میں ایک نہایت مستبد حکومت کا پایہ تخت ہے اور سوویٹ حکومت کے مساوات کا نصب العین (Demagogeai baanssa) محض فریب خیال اور جھوٹ ہے۔ سٹالن کا مقصد جرمنی اور دوسرے (مفتوحہ) ممالک کو اپنی کاربراریوں کے لیے اپنا آلۂ کار بنانا ہے"

دراصل ان کی اخلاقی تصویر ایسی گھناؤنی ہے اور ان کی سیرت اور ان کے کردار ایسے سیاہ ہیں کہ خود ابلیس کو بھی ان پر شرم آ نے۔ قرآن حکیم نے دو لفظوں میں ان کے کیرکٹر اور عمل کی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ لوگوں اور جماعتوں کے ننگ و ناموس کو بے دریغ پامال کرنے میں اپنے برادر سرمایہ داری نظام سے کچھ کم نہیں بلکہ اس سے دو قدم آگے ہی ہے۔ ان کی مثال اس بھیڑیئے کی ہے جس نے ایک بھیڑ کے بچے کو دوسرے بھیڑیئے سے چھڑا کر اپنا نوالہ بنالیا۔

چو از چنگال گرگم در ربودی
چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی

Marfat.com

پہلا بھیڑیا ذرا اصول پرست تھا۔ وہ ہمیشہ بھیڑ کے بچے کو ہڑپ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتا تھا۔ مگر یہ بھیڑیا سرے سے کسی اصول کا قائل ہی نہیں ہے۔ اسے کسی بہانہ کے تلاش کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ یہ کمزور اور بیکس حکومتوں کو ہڑپ کرنے میں زار کے نظامِ حکومت سے بھی بازی لے گیا ہے خود روس میں، جہاں امن و حریت و مساوات کا دور دورہ ہونے کا تمام دنیا میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ یہ حالت ہے کہ بائیس کروڑ نفوس میں سے صرف ساٹھ لاکھ آدمی کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں اور یہ اراکین بائیس کروڑ انسانوں کو ان کی ذہنی آزادی اور حریتِ فکر سے محروم کر کے ان کو آئندہ کے سبز باغ دکھا کر ان کے دل و دماغ پر تسلط جمائے بیٹھے ہیں اور ان پر بزورِ شمشیر حکومت کر رہے ہیں۔ زارِ روس کے عہد میں وہ چند سرمایہ داروں کے غلام تھے۔ اور اب وہ ایک جابر و قاہر اسٹیٹ (ریاست) کے صرف روٹی کپڑے کے غلام ہیں۔ بے شک اِس اسٹیٹ کا سلوک بعض حالتوں میں عوام کے ساتھ ایک مہربان آقا کا سا ہوتا ہے مگر اس کے ہاں ذرا سی نافرمانی کی سزا موت سے کم نہیں۔ ان کی اسی معصومیت کو لمز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام کا انجامِ کار ایک ہی ہے۔

اس لیے آئندہ تفسیر میں جہاں بھی دولت پرست عبد الدنیا کا لفظ استعمال کریں گے تو اس سے مراد دونوں قسم کے کفار سے ہوگی۔ یعنی سرمایہ دار اور اشتراکی انھیں ہم مادہ پرست انسان سے تعبیر کریں گے۔

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ مادہ پرست انسانوں کی قوم میں کیوں ہُمز اور لُمز کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ باوجود انتہائی کوشش کے بھی ان اوصاف سے اپنے تیئں پاک نہیں کر سکتی۔

مادہ پرست انسان کی سب سے بڑی اور اصولی گمراہی یہ رہی ہے کہ وہ "بدی" اور "غلطی ناحق" کے خلاف جہاد نہیں کرتا۔ اس کا نصب العین یہ نہیں ہوتا کہ وہ وہ برائی کو ختم کرے یا "ناحق" سے باز رکھے۔ اور بقول انجیل اسے اپنی آنکھ کا شہتیر تو نظر نہیں آتا۔ لیکن دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی بہت بڑا نظر آتا ہے۔ اور اس سے اس میں قومی عصبیت اور نسلی غرور کے زہریلے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری گروہ بندیوں اور دوسری قوموں کی عیب جینی اور تنقیص پہ دلیر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے زعم باطل میں یہ سمجھتا ہے کہ ان جماعتوں کی "برائیوں" کے خلاف جہاد کرنے کے لیے خدا نے اسے مامور کیا ہے۔ وہ ان جماعتوں کو ان برائیوں سے پاک کر کے ان کی اصلاح کے لیے میدان میں اُتر آتا ہے۔ لیکن وہ اپنی قوم یا جماعت کی ان ہی یا اس سے بھی زیادہ قبیح "برائیوں" کو "محاسن" سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ پچھلی ہولناک جنگ میں جرمنی اور اس کے حلیف ایک طرف اور انگریز و روس و امریکہ اور ان کے حلیف دوسری طرف دونوں خدا کا نام لیتے تھے۔ اور دونوں ہی بنی نوع انسان کی "آزادی" و "مساوات" کے لیے لڑ رہے تھے۔ قدرت نے اتحادیوں کو فتح دی تو اب اگر جرمنی نے روس استعمار کی تو وہ خونیں مجرم اس کے تمام فوجی مجرم دار پر کھینچنے کے قابل۔ اگر جرمنی نے نہتے مردوں، عورتوں، بچوں اور شہریوں پر گولہ باری کی تو وہ واجب القتل اور اس کے تمام فوجی افسر سولی پر چڑھانے کے قابل۔ لیکن اگر انگریز یا امریکہ یا روس اسی استعمار کی خاطر ہر قسم کی بے ایمانی، بد عہدی اور ظلم و ستم کریں تو وہ "حق" کی حمایت ہے۔ اگر انگریز اور ان کے حلیف بے گناہ شہریوں پر بمباری کریں اور ایٹم بم (Atom Bomb) جیسے شیطانی حربے استعمال کریں تو وہ بالکل معصوم اور ان کا یہ عمل سرتاسر قابل تعریف ہے۔ کیونکہ اس نے انسانیت کو ایک عظیم الشان خطرے سے نجات دی۔

کاش! بنی نوعِ انسان کے ان ناخداؤں کو کوئی ان کی منافقت اور شیطنت سے آگاہ کرے اور حضرت علیٰؑ کا یہ زریں مقولہ سنائے کہ:

"طبیب پہلے اپنا تو علاج کرو۔ پھر دوسرے کے مرض کی طرف توجہ دو۔"

اب اس امر کے لیے کسی خاص جماعتی نفسیات کے مطالعہ کی ضرورت نہیں کہ جس قوم یا جماعت کا نقطۂ نظر (Altitude of mind) یہ ہو وہ عصبیت کا شکار ہو جاتی ہے اور اس میں ہمز اور لمز کی نفسی بیماریوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا۔

لیس منا من قام علی عصبیۃ لیس منا من قاتل علی عصبیۃ

لیس منا من مات علی عصبیۃ او کما قال۔"

"ہم میں سے نہیں جو قومی اور نسلی عصبیت پر قائم رہا۔ ہم میں سے نہیں ہے جو قومی اور نسلی عصبیت کی خاطر لڑا۔ ہم میں سے نہیں جس نے قومی اور نسلی عصبیت کی خاطر جان دی۔" یعنی یہ تینوں خاصے جاہلیت کے ہیں۔ جس شخص میں یہ تینوں خاصیتیں پائی جائیں گی۔ اسے اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ، عصبیت کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا "تم اپنی قوم یا جماعت کی حمایت اس حالت میں بھی کرو جب تم جانتے ہو کہ وہ حق پر نہیں ہے۔"

اس حدیث نے قومی اور نسلی عصبیت کی ایسی جامع اور مانع تشریح فرمادی ہے کہ اس سے بہتر تشریح ممکن ہی نہیں اور اسلامی اور مادہ پرستانہ نصب العین میں حدِ فاصل قائم کر دی۔ یعنی ایک مسلمان جماعت اور مادہ پرست جماعت کے زاویۂ نگاہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ مسلمان صرف "مطلق شر" کے خلاف "مطلق بدی"

کے خلاف، مطلق منکر کے خلاف، مطلق ناحق اور بدی" کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی اصلاح کا قدم سب سے پہلے اپنے نفس، اپنے قبیلے اور اپنی قوم کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ پہلے اپنے گھر کو "برائی" سے اور "ناحق" سے پاک کرتا ہے، پھر دوسری جماعتوں کو اسی اصلاح اور تزکیۂ نفس کی دعوت دیتا ہے۔ اس کیلئے کوئی سودیشی یا بدیشی ظلم "یا ناحق" نہیں ہے۔ ظلم اور ناحق سب کے سب بدیشی ہیں۔ جنھیں ہر حالت میں دیش نکالا ملنا چاہیے۔ اس لیے وہ جب بھی ظلم اور ناحق کا قلع قمع کرنے اٹھتا ہے تو کسی ظلم یا معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا۔ وہ کسی ناحق اور ناروا بات کو جائز نہیں ٹھیراتا۔ وہ بدعہدی یا خیانت کو روا نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک ظلم و معصیت یا ناحق یا ناروا باتیں، بدعہدی و خیانت سب شیطانی عادات ہیں اور خواہ وہ اس کی اپنی جماعت میں ہوں یا غیر جماعت میں، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے قابل ہیں۔ وہ کبھی کسی قوم کو اس وقت تک "بدی" کے دور کرنے کی دعوت نہیں دے گا جب تک کہ وہ اپنی جماعت کو اس سے پاک نہیں کرلے گا۔

اس کے برعکس مادہ پرست "شر" کی مخالفت تو کرتا ہے مگر صرف بدیشی شر کی۔ وہ دوسروں کے شر کو شر سمجھتا ہے اور اپنے لیے ہر قسم کے شر کو جائز سمجھتا ہے۔

اس تمام ملمع کاری سے دراصل اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ شر کا مطلق قلع قمع کردے بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے شر و فساد پھیلانے کے اور زیادہ مواقع ہاتھ آئیں اور دوسری جماعتیں اس کے شر و فساد کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرسکیں۔ وہ اسی لیے بدیشی ظلم کی مخالفت کرتا ہے تاکہ اسے سودیشی ظلم کرنے میں کامل آزادی حاصل ہوجائے اور وہ بلا روک ٹوک اپنی ہوس کو پورا کرسکے۔

قصہ مختصر، وہ اصلاح کی بجائے ہمز اور لمز کو اپنا شعار بناتا ہے تاکہ دنیا کی نظروں میں زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کر کے معاشی معنوں میں دولت و زر کے جمع کرنیکے زیادہ سے زیادہ مواقع بلا شرکت غیرے پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قوم کی کوششیں برباد ہو جاتی ہیں۔

ولا یحیق المکر السیّئ الا باھلہٖ ہ اور بری تدبیر کا وبال تو اس کے کرنے والے پر ہی لوٹتا ہے۔

اگر اس کا ثبوت درکار ہے تو صلح کانفرنس ہی کو دیکھ لو کس طرح روس، امریکہ اور انگلستان جو کل تک جرمن کے مقابلے میں ساتھی تھے۔ اب ایکدوسرے کے خلاف صف آرا ہیں اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ دُنیا کی چودھراہٹ اسی کے حصے میں آئے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے مخالف پر طرح طرح کے الزام تراش رہا ہے۔ حالانکہ اس تالاب میں سبھی ننگے ہیں۔ آج دنیا ان لوگوں کی شاطرانہ چالوں کی وجہ سے جہنّم بن چکی ہے۔ قحط سالی، فاقہ کشی، نیم برہنگی، اور کپڑے کی نامیسری کے باعث ضروریاتِ زندگی کا فقدان، بیماریوں کی کثرت۔ غرض عذاب الٰہی مختلف صورتوں میں ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن یہ ہیں کہ دنیوی طمع کے لالچ میں اوندھے مُنہ تباہی کے گڑھے کی طرف جا رہے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ لوگ خداداد عقل وبصیرت سے کام لیتے تو ان پر ان کے نقطۂ نظر کی غلطی واضح ہو جاتی کہ دنیوی اقتدار اور مادّی ساز وسامان آنی جانی چیزیں ہیں۔ اس لیے اپنے ملک کو زمانے کے حادثوں سے محفوظ رکھنا تو درکنار وہ خود بھی ایک شخص یا سلطنت کے پاس ایک حالت میں نہیں رہ سکتے۔

یہ ایک موٹی سی حقیقت ہے جس کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں لیکن

Marfat.com

پھر بھی جب خود غرضی اور قومی و نسلی عصبیت کا شیطان ان پر مسلط ہو جاتا ہے تو یہ بدیہی بات اس کی آنکھوں سے ایسی مستور ہو جاتی ہے کہ گویا سرے سے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ انسان اخلاق فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی ضرورت سے یکسر انکار کر دیتا اور خود کشی کے راستے پر چل پڑتا ہے ورنہ یہ حقیقت تو آفتاب کی طرح روشن ہے کہ دنیا میں صرف اعمالِ صالحہ اور ایمان باللہ ہی بقائے دوام کا ذریعہ ہیں۔

والباقیات الصالحات خیرٌ عند ربك ثوابًا وخیرٌ املاً ہ (الکھف)

اور باقی رہنے والی نیکیاں، خدا کے ہاں اجر و ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ اور آئندہ کی توقعات استوار کرنے کے لیے بہتر ہیں:

عُرفی نے کیا خوب کہا ہے

ہر کس نہ شناسندہ راز است ایں وگرنہ
کایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اس لیے قرآن حکیم نے بھی پہلے تو ان کے نظریے کی صرف تردید کی۔ تاکہ غفلت شعار انسان اپنے نقطۂ نظر کی غلطی پر متنبہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

کَلَّا: نہیں، ہرگز نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ حرف نفی ہے جو اپنے ماسبق کی نفی کرتا ہے۔

چنانچہ ابن جریر اس کی تفسیر میں لکھتا ہے:۔

ما ذالك كما ظن وليس ماله مخلده و انه هالكٌ ومعذبٌ على افعاله ومعاصيه التى كان ياتيها فى الدنيا (ابن جریر)

ترجمہ:۔ جیسا کہ اس کا ظن ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اور اس کا مال اسے

بقائے دوام نہیں بخش سکتا۔ بلکہ وہ اپنے دنیوی اعمال وافعال اور گناہوں کے پاداش میں ہلاک ہوگا اور عذاب میں مبتلا ہوگا۔"

لینبذن فی الحطمۃ النبذ الطرح وفیہ اشعار باھانتہ (کشاف)

"ینبذ کے معنی پھینک دینے کے ہیں اور اس میں اس کی اہانت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ بہت ذلت سے حطمہ میں پھینک دیا جائے گا۔"

الحطمۃ۔ النار التی من شانھا ان تحطم کل من یلقی فیھا (کشاف)

ترجمہ: ۔ ایسی آگ جو ہر اس شخص کو جو اس میں ڈالا جائے گا، توڑ دے گی۔" (کشاف)

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ ویجوز ان یخص الافئدۃ لانھا مواطن الکفر والعقائد الفاسدۃ والنیات الخبیثۃ۔

ترجمہ: اور قلوب کو مختص کرنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہی کفر اور باطل عقیدوں اور خبیث ارادوں کا مصدر اور منبع ہے۔ اسی لیے بعض اہلِ تاویل نے کہا ہے چونکہ آگ اور تہذیب معنوی امور ہیں۔ اس لیے ان سے قلوب ہی متاثر ہوں گے اور چونکہ وہی ادراکات اور عقائد کا مرکز ہیں۔ اس لیے ایذا انہی کو پہنچائی جائے گی۔"

اطلاع النار علیھا انھا تعلوھا وتغلبھا وتشتمل علیھا او تطالع علی سبیل المجاز معادن موجبھا۔ (الکشاف)

اطلاع نار کے یہ معنی ہیں کہ وہ ان کے دلوں پر مسلط ہو جائے گی اور انھیں بالکل مغلوب کرے گی۔ یا مجازی طور پر برائی کے محرکات کے منبع پر مسلط ہو گی۔

انھا علیھم مؤصدۃ مؤصدۃ ای مطبقۃ (الکشاف)

چاروں طرف سے گھیرے ہوئے دروازے بند کیے ہوئے جس سے مفر کی کوئی صورت نہ ہو۔"

والمعنی انہ یوکد یاسھم من الخروج وتیقنھم بحبس الابد (الکشاف)

Marfat.com

ترجمہ: یعنی انھیں اپنی رہائی کی طرف سے کامل مایوسی ہو جائے اور ابدی قید کا
یقین ہو جائے گا۔ کیونکہ جب کسی شخص کو ایسے کمرے میں بند کر دیا جائے جس کے تمام
دروازے مقفل ہوں اور مزید احتیاط کی خاطر دروازوں پر ستون کھڑے کر دیئے
جائیں تو اس کا باہر نکلنا امر محال ہوگا۔"

یا

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جس طرح چور ٹکٹکی پر کھینچے جاتے ہیں۔ اسی طرح
وہ ستونوں پر باندھ دیئے جائیں گے۔ (الکشاف کا اختصار)

مگر جیسا کہ انشاء اللہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے۔ یہاں مقصود
عذاب کی اہمیت پر اتنا زور دینا نہیں ہے، جتنا اس کی شدت

اس تفسیر کے شروع میں ہم نے شرح و بسط سے اس امر پر روشنی ڈالی
ہے کہ دنیا میں نظام زندگی کے متعلق دو ہی نظریے ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ہم نے
خدائی یا اسلامی نقطۂ نظر اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے تعبیر کیا ہے۔ اور
درحقیقت محض نقطۂ نظر کے فرق سے انسان بالکل متضاد نتائج اخذ کرتا ہے
اور انہی کے مطابق اپنا طریق کار (Programme of action) مرتب کرتا ہے
سورہ العصر کی تفسیر کے ضمن میں ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ اگر
اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ تمام تاریخ انسانی اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ سوائے اس جماعت کے
کے جو ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے خصائص سے متصف ہے
اور کوئی جماعت خسران یا کامل تباہی سے نہیں بچ سکتی اور ہم نے اس امر کی
تصریح کی ہے کہ جس طرح ان الانسان لفی خسر کا دعویٰ بالکل عام تھا اور
ہے۔ اسی طرح الا الذین امنوا۔ الایۃ کا استثناء بھی عمومی ہے اور کبھی اس کے
خلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر تصریح کر چکے ہیں، مادی نقطۂ نظر سے تاریخ

Marfat.com

اپنے نقطۂ نظر کی صحت کے زبردست داعی ہیں۔ اور وہ بھی تمام تاریخ کے مطالعہ کے بعد اپنے نتیجہ کی صحت کا جو اسلامی نتائج کے بالکل ضد ہیں۔ دعوے کرتے ہیں۔ اب اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر ہی صحیح ہے اور کارل مارکس کا نظریہ تاریخ کا تصور مادی (Material Conception of History) اور افادیین (utilitaraians) کا نظریہ افادیت و تاریخی جبر (utilitaranison) (Historical Determinion Necesity) اپنے دعوے کے اثبات اور مخالف نظریے کے ابطال کے لیے قرآن نے ایک نہایت ہی لطیف طرز استدلال استعمال کیا ہے جو نہایت مسکت اور خود مخالف کے مسلمات پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ مخالف نظریئے کو صحیح تسلیم کر کے اس کے نتائج کو پیش کرنا اور ثابت کرنا کہ وہ نتائج سرتاسر باطل ہیں۔ اسی طرح اس نظریہ کا ابطال خود بخود ہی ہو گیا۔

ریاضی میں اس استدلال کو (الزامی دلیل) یعنی جس مفروضہ کا نتیجہ باطل ہو۔ وہ مفروضہ خود باطل ہے۔ مثلاً: ہندسہ (geometry) میں ہم دعوائے کرتے ہیں کہ مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ دو زاویہ قائمہ کے برابر ہوتا ہے یا اس کے ہر دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے سے بڑا ہوتا ہے تو ہم اس کے عکس کو صحیح فرض کر لیتے ہیں تو ہم ایسے نتیجے پر پہنچتے ہیں جو ہمارے مسلمات کے خلاف ہے اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا مفروضہ بالکل باطل تھا۔

اسی طرح یہاں بھی ثابت کیا گیا ہے کہ اس نظریئے کو تسلیم کر لینے سے ہم ایسے نتیجے پر پہنچتے ہیں جو بداہتہً باطل ہے۔ اور جس سے ہر صاحب فہم انسان ابا (Reason) کرے گا۔ اب اس کی تفصیل یہ ہے:۔

مخالف کا دعویٰ یحسب ان مالہ اخلدہ۔ اس کا یقین ہے۔ اسکا مال

Marfat.com

اسے حیاتِ جاوید بخشے گا اور خسران یعنی تباہی سے بچائے گا۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم دیتا ہے کہ قرآن حکیم یحسب کو ہمیشہ باطل یقین اور خیالِ خام کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ مثلاً وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا (اور وہ خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ وہ نیکی کر رہے ہیں) ایحسب الانسان ان یترک سدی (کیا انسان اس زعمِ باطل میں مبتلا ہے کہ وہ یونہی بغیر بازپرس کے چھوڑ دیا جائے گا)

مُخالف کا عمل:

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ: وہ مال جمع کرتا اور اسے گن گن کر رکھتا ہے۔ یعنی اسبابِ معیشت کا حصول اس کی زندگی کا واحد نصب العین ہو جاتا ہے۔ ان کی قلت و کثرت ہی اس کے نزدیک قابلِ اعتنا اقدار ہیں۔ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اسباب فراہم کرنا اور دوسروں کو ان سے محروم کرنا۔

اس کا پہلا نتیجہ۔ ویلٌ لکلّ ھُمزۃ لُمزۃ: وہ جماعت یا قوم جس کا مقصدِ زندگی صرف اسبابِ معیشت کی طلب ہو جاتا ہے۔ اس میں تمام اخلاقی اور قومی روگ پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ اس قوم کی ہلاکت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اِس کا دوسرا نتیجہ:-

لینبذن فی الحطمۃ: وہ دنیا و آخرت میں حطمہ میں ڈالا جاتا ہے۔

اس لیے ثابت ہوا کہ مخالف کا دعوےٰ باطل ہے۔ بجائے حیاتِ جاوید کے جس کی اسے جستجو تھی وہ اپنے یقین اور عمل کی وجہ سے انجام کار تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور خسر کی دلدل سے نکلنے کی بجائے وہ اس میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

اب ہم اس استدلال کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

Marfat.com

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ تاریخ انسانی کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی کوششوں کا مآل یہی معلوم دیتا ہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح اس کیمیا کا کھوج نکالیں جس سے انسان کو ابدی مسرت اور بقائے دوام حاصل ہو یا بالفاظِ دیگر مسلسل لامحدود اور لازوال ترقی کے راستے کا سراغ لگائیں۔ کیونکہ اس طرح انسان دکھ درد پر فتح پا کر کمالِ انسانی حاصل کر سکتا ہے۔
یہاں اس امر کو ذہن نشین کرنا چاہئے کہ ابدی مسرت اور ابدی زندگی دراصل ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ کیونکہ اگر انسان دکھ درد پر فتح پا کر ابدی مسرت کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے تو ابدی زندگی خودبخود حاصل ہو جائے گی۔ اور تاریخ انسانی کے مطالعہ سے ایک اور حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ہر انسانی تمدن ایسے دور سے گزرتا ہے جب کہ اس کے افراد حصولِ زر (یہاں زر اپنے وسیع اقتصادی مفہوم بمعنی دولت (wealth) یا اسبابِ معیشت میں استعمال ہوا ہے) کو انسانی مسرت کا ضامن اور ابدی مسرت کی چابی خیال کرنے لگتے ہیں اور انھیں اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ زر ہی تمام مصائب کا علاج اور اقوامِ عالم کو مصیبت اور موت کی تلخی سے بچانے کا واحد ذریعہ ہے۔ زر ہی انسانی ضروریاتِ زندگی کا کفیل اور انسانی مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقتصادی فارغ البالی کا حصول ہی تمام انسانی دوڑ دھوپ کا محور بن جاتا ہے اس بارے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت دونوں حقیقی بھائی بہن ہیں۔ فرق صرف تعبیر اور الفاظ کا رہ جاتا ہے۔

اگر سرمایہ داری نظام سرمائے کی فراہمی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے تو اشتراکی بھی "پیٹ کے سوال" اور "روٹی" کو دنیا کا سب سے اہم سوال بتلاتے ہیں۔ تو گویا موجودہ تمدن بھی اسی دور میں سے گزر رہا ہے۔ اور

Marfat.com

تمام مہذب قومیں اسی جنون میں مبتلا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اخلاقی قدروں (Moral Values) کی اہمیت اس قدر گھٹ گئی ہے۔ کہ وہ صرف نام ہی نام رہ گئی ہیں۔ جنہیں مخالف کو ملزم ٹھہرانے کے لیے وقتاً فوقتاً استعمال کیا جاتا ہے۔ آج سرمایہ داری نظام ہو یا اشتراکی نظام دونوں ایک دوسرے سے مختلف بالجبر حقوقِ ہمسایہ کے غصب کرنے اور کمزوروں کو ہڑپ کرنے میں بازی لے جا رہے ہیں۔

قرآن حکیم نے اس ذہنیت کو بے نقاب کرنے کے لیے ان کے باطنی رجحانات سے چند اہم واقعات اور خصائص کو لے کر اپنے استدلال کی عمارت تعمیر کی ہے جس سے ان کی تخیل کی غلطی کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

اوّل: سرمایہ داری یا اشتراکیت میں خالص مادہ پرستی کے ساتھ ساتھ بعض ایسی اخلاقی اور قلبی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں جو اصلاً اخلاق اور تمام انسانی جوہر کے منافی ہوتی ہیں اور چونکہ دنیا کا کاروبار ایک زبردست اخلاقی نظام کے تابع ہے اس لیے وہ اخلاقی اور قلبی کیفیات انسانی تباہی کے جراثیم کی پرورش کرتی ہیں اور جب کسی قوم کا اخلاقی معیار ایسا پست ہو جائے۔ تو خود غرضی اسے ایک مشین کی طرح صرف ایک کام یعنی حصول زر کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ اس لیے وہ کسی قسم کے اخلاقی برائی کے ارتکاب سے دریغ نہیں کرتا۔ دوسروں کی عزت و حرمت جان اور مال سب اس کے لیے مباح ہو جاتے ہیں بشرطیکہ انھیں پامال کرنے سے اپنی مطلب براری ہوتی ہو۔ ان میں عصبیت اور قومی تفاخر کا مرض جڑ پکڑ جاتا ہے اور ان کے پیش نظر بنی نوع انسان کی بھلائی کے بجائے صرف اپنی قوم یا اپنی نسل کی بھلائی رہ جاتی ہے۔ وہ دوسری قوموں کی عزت و حرمت، ذرائع آمدنی، [illegible] دولت و ثروت کو اپنی ہوس کے پورا کرنے کے لیے تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ دوسری

قوموں کو ان کی جائز آزادی سے محروم کر کے انہیں طرح طرح سے اپنا غلام بنا لیتے ہیں پھر ان کی زندگی کا مقصد فاتح قوم کی غلامی کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

پہلے زمانے میں بے رحم آقا صرف چند انسانوں کو اپنا غلام بنا کر ان کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرتے تھے مگر موجودہ زمانے کے بردہ فروش پوری ایک قوم کو اپنا غلام بنا کر ان سے حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کرتے ہیں۔

چنانچہ اشتراکیت کے علم بردار روس کو ہی لیجئے۔ فتح سے پہلے وہ کس طرح بھیگی بلی کی طرح مظلوم قوموں کی حمایت کا پروپیگنڈہ کرتا رہا اور دن رات آزادی و حریت کے راگ الاپتا رہا۔ مگر فتح حاصل ہوتے ہی اس کی "مظلوم انسانیت" کی حمایت کا ملمع اتر گیا۔ اور اس کے شیطانی عزائم بے نقاب ہو گئے۔ اور پیرس "صلح کانفرنس" کے موقع پر وہ بالکل عریاں ہو کر دنیا کے سامنے آ گیا۔ اور امپیریلسٹ طاقتیں جس طرح ایشیائی اور افریقی ممالک کو غلام بنا کر اپنا پیٹ بھرنا چاہتی ہیں اسی طرح یہ بھی اپنا امپیریلزم تعمیر کرنا چاہتا ہے اور دنیا کو یہ تلخ حقیقت معلوم ہو رہی ہے کہ یہ دونوں گروپ بھیڑوں کے غول ہیں جن کا مقصد انسانیت کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اب ان دونوں فریقوں کی شاطرانہ چال بازیوں

) کے تحت میں حرص حسد کا جذبہ کارفرما ہے اور ایک ظلم انہیں دوسرے ظلم پر ابھارتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کا قانون تعذیب اُمم حرکت میں آتا ہے چنانچہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا۔

لو کان لابن آدم وادیان من مالٍ لابتغیٰ ثالثاً ولا یملاء جوف ابن آدم التراب ویتوب اللہ من تاب او کما قال ۰

"اگر ابن آدم کو مال و زر کی دو وادیاں مل جائیں تو وہ تیسری کی تلاش میں سرگرداں ہوگا۔ اور ابن آدم کے پیٹ کو (قبر کی) مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ ہاں جسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف

رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وہ فوز و فلاح پائے گا۔

ارسطو نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ظلم کی سزا دُرّے یا کوڑے نہیں، بلکہ وہ داعیہ ہے جو انسان کو ایک ظلم کے بعد دوسرے ظلم پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان اپنے ظلم سے آپ ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔"

امریکہ اور یورپ میں روپیہ اور روس میں اسباب معیشت کی فراوانی ہی انسانی زندگی کا منتہا و مُدعا ہو چکے ہیں اس لیے ان لوگوں میں تجرانی اور شرافت کا معیار رولز رائس کاریں، اونچے محلات اور سامان عیش و عشرت کی فراوانی ہی ہے۔

روس کے متعلق لینن کا یہ دعویٰ تھا کہ اشتراکیت انسان کو حرص و ہوا سے بالاتر اور نفسانیت سے پاک کر دے گی اور چوری، غصب اور رشوت ستانی وغیرہ جیسے جرائم جو سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں بالکل ختم ہو جائیں گے۔ وہاں کا یہ حال ہے کہ حال ہی میں وہاں ہزاروں کاشت کار، کھیتوں کے منتظم، زراعت کے افسران اور عمال رشوت ستانی، استحصال بالجبر، خیانت اور چوری کے جرم میں گرفتار کیے گئے تھے۔

رائٹر نے روسی سرکاری اخبار "پراودا" کے حوالے سے ۲۱ ستمبر ۱۹۴۶ء کو لندن سے ایک مفصل بیان شائع کیا جس میں لکھا ہے کہ:

"(cooperative Farming) امداد باہمی کی ملکیت کے عمال (administration) اور افسروں میں حیرت انگیز رشوت ستانی، استحصال بالجبر، سرکاری مال میں غصب اور غبن پائے گئے ہیں اور خطرہ ہے کہ اگر ان کا بروقت انسداد نہ کیا گیا تو روس کا سارا نظام

Marfat.com

معیشت برباد ہو جائے گا۔ اس لیے ہزاروں انسانوں کو گرفتار کر کے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔" (تفصیل کے لیے دیکھئے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ، مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۶ء)

دراصل جب مادہ پرستی انسان کی زندگی کا نصب العین بن جائے تو وہ ایک خونخوار بھیڑیا بن جاتا ہے اور کوئی چیز اسے دوسرے انسان کا گلا گھونٹنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ صرف خدا پر ایمان اور یوم آخرت پر اعمال کی جواب دہی کا یقین ہی یقیناً وہ روک ہے جو انسانی خواہشات کو باغی بننے سے روک سکتے ہیں۔

دوئم: کسی قوم یا فرد میں ان خصائص کا پیدا ہو جانا اس کی یقینی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور یہ کیفیات اسے ابدی مسرت اور دوامی زندگی سے ہمکنار کرنے کے بجائے اسے تباہی کے گڑھے میں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ کیونکہ ناممکن ہے کہ انسان ہمہ گیر اخلاقی نظام کی مخالفت کر کے مکافاتِ عمل سے بچ سکے۔

سوئم: زندگی کی حقیقی مسرت اطمینانِ قلب میں مضمر ہے نہ کہ سامانِ معیشت کی کثرت یا مال و دولت کی فراوانی میں۔ مسرت ابدی اور حیاتِ ابدی توام ہیں۔ اور ابدی مسرت کی طرح حیاتِ ابدی کا بیج بھی قلبِ انسانی میں بویا جا سکتا ہے نہ کہ انسان کے باہر مادی دنیا میں۔

انسان دولت اور سامانِ معیشت کی فراہمی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر دنیا کو اپنے لیے جہنم بنا لیتا ہے۔ بالخصوص جب یہ ہوس بہت بڑھ جاتی ہے تو انسان حسد کے جذبے سے معمور ہو کر اپنے تمام ابنائے جنس کو اپنا دشمن اور اپنے نصب العین (Goal) کے راستے میں سنگِ راہ مان کر انھیں ہر قسم کا جسمانی یا اخلاقی نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی سوسائٹی کے تمام افراد اسی جذبے سے معمور ہو جائیں گے تو وہ سوسائٹی خود بخود اپنے افراد کیلئے

Marfat.com

ناقابلِ برداشت ہو جائے گی اور ان کی زندگی خود ان کے لیے ایک عذاب ہو کر رہ جائے گی بنی نوعِ انسان کی مثال بھوکے بھیڑیوں کے مانند ہو جاتی ہے۔ جو شکار نہ ملنے کے باعث ایک دوسرے کو شکار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہاں تک کہ خود ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ روس میں برفانی موسم میں ہر سال یہ تماشا دیکھنے میں آتا ہے۔

چہارم: مکافاتِ عمل اسی دنیا میں شروع ہو جاتی ہے۔ وہ جس طرح سچے مومن اپنے اخلاقِ فاضلہ کی بدولت اسی دنیا میں ابدی مسرت، استخلاف فی الارض اور زمین میں خدا کی نیابت، امن اور اطمینانِ قلب اور ابدی زندگی سے سرشار اور بہرہ ور ہوتے ہیں اور اپنی اُخروی زندگی کا ایک دھندلا سا عکس دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح مادہ پرست اقوام اسی دنیا میں اطمینانِ قلب سے محروم، مسابقت پیدائش و نفع (competition) کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حسد اور خود غرضی کی آگ میں جلتے ہیں اور اسی دنیا میں جہنم میں مبتلا ہو کر اپنی اخروی زندگی کا ایک دھندلا سا عکس بھی اسی دنیا میں دیکھ لیتے ہیں۔

پنجم: اخلاقی نظام کے قوانین اٹل ہیں اور ان کی کوئی استثنا نہیں اس لیے جب کوئی قوم خاص قسم کے اخلاقی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس قوم کا نقطۂ نظر مادی ہے اور وہ تباہی کے راستے کی طرف جا رہی ہے۔ اس قوم کی نجات اپنے نقطۂ نظر کے بدل دینے میں ہے اور مادہ پرستی کی بجائے حق پرستی ہی اس قوم کو یقینی تباہی سے بچا سکتی ہے۔ لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک مخلص مومن اور مادہ پرست طالبِ دنیا میں فرق صرف نقطۂ نظر کا ہے۔ شیخ سعدی نے اس فرق کو خوب نمایاں کیا ہے۔

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

مولانا رومؒ نے بھی اس حقیقت کو پیش فرمایا ہے :-

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان روح اور جسم سے مرکب ہیں، بلکہ انسان عبارت ہے روح اور جسم کے صحیح امتزاج سے اور اشتراکِ عمل سے۔ اگر انسان صرف روح کو ترقی دینے کی کوشش کرے اور جسم کو نظر انداز کر دے، جیسا کہ ہندو، بدھ، جینی اور عیسائی مذاہب نے کیا تو ناممکن ہے کہ وہ انسانِ کامل بن سکے یا ابدی زندگی یا ابدی مسرت سے ہمکنار ہو سکے۔

اِسی طرح انسان اگر صرف جسم کی ترقی کی کوشش میں مصروف رہے اور روح کو بالکل نظر انداز کر دے جیسا کہ موجودہ مغربی تمدن کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے، تو ناممکن ہے کہ وہ کمالِ انسانی کے مدارج طے کر سکے یا بقائے دوام یا ابدی مسرت سے ہم کنار ہو سکے۔ بلکہ بقائے دوام اور کمالِ انسانی کی کلید روح اور جسم کی متحدہ ترقی میں مضمر ہے۔ اسلام نے عیسوی رہبانیت اور مغربی مادیّت کے بین بین اعتدال کی راہ تجویز کی اس لیے اس نے دنیا اور دنیا کے ساز و سامان کو محض شیطان کا آلۂ کار بنا کر مصنفینِ انجیل کی طرح یہ نہیں کہا کہ "پہلے اپنا سب کچھ چھوڑ دو، پھر میرے ساتھ آؤ" یا "اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا آسان ہے مگر ایک دولت مند شخص کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل" نہ ہی اس نے موجودہ تمدن کے علم برداروں کی طرح یہ کہا کہ :

"روحانیت اور مذہبیت احمقوں کا شیوہ ہے جن کی فی زمانہ کوئی ضرورت نہیں یا مذہبی اخلاقیات محض افیون ہے جو مذہبی پیشواؤں نے عوام پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے انہیں کھلانی شروع کر دی" بلکہ اس نے کہا تو یہ کہا :-

Marfat.com

المال والبنون زینۃ الحیوٰۃ الدنیا۔ (الکھف) — مال اور اولاد مگر وہ چیزیں نہیں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے بلکہ دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہیں۔ اس لیے انھیں نیکی کمانے کا ذریعہ بناؤ۔

انما اموالکم واولادکم فتنۃ — تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو تمہارے لیے ایک آزمائش ہیں۔

یعنی اللہ تعالےٰ تمہیں آزماتا ہے کہ تم ان کا صحیح استعمال کرتے ہو یا انہیں محو ہو کر خدا کو بھی بھول جاتے ہو۔

زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذالک متاع الحیوٰۃ الدنیا۔ واللہ عندہ حسن الماٰب۔ (آل عمران) — "انسان کے لیے مرد اور عورت کے رشتے، اولاد، چاندی سونے کے ذخیرے، چنے ہوئے نشان زدہ گھوڑے، مویشی و کھیتی [illegible] [illegible] اور حقیقت [illegible]

کی طبیعت اور اس کی ساخت ہی ایسی بنائی [illegible] انسان [illegible] دنیا کی زندگی کی خوشحالی اور زینت میں اس کا دل اٹکا رہے۔ اس لیے ان کی [illegible] طلب کا پیدا ہونا ایک [illegible] [illegible] لیکن اس حقیقت کو نظر انداز [illegible] دنیاوی زندگی کا فانی [illegible] اور [illegible] تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ اس لیے تم دنیا کے مال متاع کو اللہ کی رضامندی کے حصول کا ذریعہ بناؤ۔"

اس لیے آنحضرت نے فرمایا:۔

الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ — دنیا آخرت کی کھیتی ہے

گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ روح انسان کے جسم کی مالک ہے اور جسم اس کا

Marfat.com

تابع فرمان۔ جسم کا فرض ہے کہ روح کی خدمت کے لیے ہمہ تن مستعد رہے اور روح کا فرض ہے کہ جسم کی صحیح رہنمائی کرے۔ تمام جسمانی تعلقات اور لذتیں روحانی تعلقات اور لذتوں کے تابع ہونی چاہئیں۔ تبھی انسان کامل بن سکتا ہے اور ابدی مسرت اور زندگی کا سراغ پا سکتا ہے۔ غم واندوہ اور خوف وخطر کی تمام طاقتیں مغلوب ہو جائیں گی۔ اگر جسم روح سے بغاوت کرے گا تو روح بیمار ہو جائے گی۔ اور رفتہ رفتہ روح اور جسم دونوں ہی فنا ہو جائیں گے۔

اس سورۂ مبارکہ میں ان بیماریوں کا ذکر ہے جو روح کو فنا کرتے اور مادہ پرستی میں منہمک ہونے سے کسی قوم یا فرد کو لاحق ہو جاتی ہیں۔ انھیں قرآن حکیم نے ہُمزاور لُمز سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو ان دونوں لفظوں میں موجودہ مغربی تمدن کی تصویر نظر آ جائے گی۔

اوپر ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ کیونکر روسی تہذیب، اشتراکیت بھی انہی دو لفظوں کے چکر میں گردش کر رہی ہے۔

کونٹ ٹالسٹائی نے موجودہ دور کو (commercialisom) سے تعبیر کیا ہے۔ کمرشیلزم سے مراد محض تجارت نہیں ہے بلکہ تجارت پرستی اور سرمایہ پرستی اور اس کے جمیع لوازم۔ یہاں تک کہ اشتراکیت بھی اسی کی ایک شکل ہے۔ جیسا کہ روس کے موجودہ رویے نے ظاہر کر دیا ہے۔ ہر شخص میں ایک بے کلی اور ایک تڑپ پائی جاتی ہے کہ کس طرح اپنے حریف کو نیچا دکھائے۔

اسی طرح افراد سے بڑھ کر یہ مرض قوموں میں سرایت کر گیا ہے۔ اور ہر قوم اس جدوجہد میں مصروف ہے کہ کس طرح وہ دوسری اقوام کو نیچا دکھاتے اور لوٹ کھسوٹ کے تمام مواقع پر قابض ہو جائے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے موجودہ تمدن کو ایک مشین سے تشبیہ دی ہے۔ جس میں

Marfat.com

تمام کل پرزے بلا قصد و ارادہ حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ متمدن مغربی انسان تمام انسانی جذبات سے بالکل خالی ہوکر اپنے مقصد کے پیچھے دیوانہ وار دوڑے چلے جارہے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھو "نیشنلزم" رابندرا ناتھ ٹیگور)

جان رسکن کا خیال ہے کہ ہماری استعماری ہوس، تجارت اور سرمایہ پرستی نے ایسے اقتصادات کی نشو و نما کی ہے جس میں انسان وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے میں مشغول ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وحشی درندے للکار کر اپنے حریف پر حملہ کرتے ہیں اور موجودہ کاروباری انسان مکر و فریب سے اپنے حسن تدبیر کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے، دوسرے بے کس انسانوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ان کی عزت و حرمت اور ان کے مال و دولت کو تباہ کرکے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ کتنے مہذب ڈاکو ہیں جو سفید ([illegible]) اخباروں ([illegible]) سے اپنے ابنائے جنس کا خون چوس رہے ہیں۔ لیکن دنیا انھیں ہوشیار یا ماہر تجارت وغیرہ کے اعزازی القاب سے سرفراز کرتی ہے۔ حالانکہ وہ ان ڈاکوؤں سے کہیں زیادہ قابل نفرت و ملامت ہیں جو رات کی تاریکی میں آکر اپنے امیر بھائی کو لوٹتے ہیں۔

آج دنیا ایک جنگل بن گئی ہے جس میں مختلف پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں اور سوائے ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے کوئی اور مقصد ان کے پیش نظر نہیں۔ انسانی اخلاق انسانی جان و مال، انسانی عزت و حرمت سے زیادہ ارزاں آج شاید ہی کوئی چیز ہو۔ ان میں سے ایک ایک کو خود غرضی، وطنیت اور مسابقت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ آج جس چیز کو ادیب انگلستان اور روس کی مخالفت کہہ رہا ہے اس کی تہ میں یہی جذبہ کارفرما ہے اور روس کے مقابلے میں امریکہ اور انگلستان

کا وقتی اتحاد اس سے زیادہ پائیدار نہیں جتنا کہ روس اور انگلستان کا اتحاد جرمن کو شکست دینے کے لیے پائیدار ثابت ہوا۔ یہ سب قومیں اس مرضِ ھُمزہ اور لُمزہ میں مبتلا ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی حالت اب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ مکافات اور مجازات کا عالم گیر قانون حرکت میں آچکا ہے۔ مغربی ممالک کا علم، ان کی دولت، ان کی طاقت اور ان کے تمام مادی ساز و سامان انھیں خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا ؕ (آل عمران - ع ۱۲) "جن لوگوں نے ایمان، راست بازی کی جگہ) کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو (وہ یاد رکھیں) کہ انھیں اللہ کے مواخذہ سے نہ توان کو ان کی دولت بچا سکے گی (جس کی کثرت کا انھیں گھمنڈ ہے) نہ آل اولاد (جو ان کی مصیبتوں اور مشکلوں میں ان کے کام آتی رہتی ہے)

وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (اللیل) "جب وہ گڑھے میں دھکیلا جائے گا تو اس کا مال اسے اس سے نہیں بچا سکے گا۔"

موجودہ مہذب دنیا بھی تباہی کے گڑھے کے کنارے پر کھڑی ہے اور عنقریب اس میں گرا ہی چاہتی ہے اور جو دوزخ اس نے اپنے لیے خود تیار کیا ہے اس کے شعلوں میں خود ہی بھسم ہوا چاہتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یہاں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے مکافات اور مجازات کو خود انسانی اعمال کا پھل قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی۔ اور وہ اپنی کوشش کا پھل عنقریب دیکھ لیگا

جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ بُرائی کا بدلہ ویسا ہی بُرا ہوتا ہے۔

Marfat.com

عارف رومی نے اس حقیقت کو پیش کیا ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

ہم اوپر ایک مشہور حدیث پیش کر چکے ہیں۔ وہ بھی دراصل اسی اصول مجازات کو پیش کرتی ہے۔

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ — دنیا آخرت کی کھیتی ہے

یعنی عمل کو بیج تصوّر کیجیے جو دنیا میں بویا جاتا ہے۔ اور گو دنیا میں بھی انسان اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر وہ اپنا پورا پھل آخرت میں لائے گا۔

اسی طرح قرآن حکیم نے مکافات کو عمل ہی کی جنس قرار دیا ہے۔

ولا یحسبن الذین یبخلون بما آتا
ھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم
بل ھو شر لھم سیطوقون
ما بخلوا بہ یوم القیمۃ۔
(آل عمران ع ۱۸)

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل و کرم سے کچھ دیا ہے اور وہ مال کے خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ایسا کرنا ان کے لیے کوئی بھلائی کی بات ہے بلکہ ان کے لیے بڑی ہی برائی کی بات ہے۔ قریب ہے کہ قیامت کے دن یہ مال متاع جس کی حفاظت کے لیے وہ بخل کر رہے ہیں۔ ان کے گلوں میں (عذاب کا) طوق بنا کر پہنا دیا جائے گا۔

اس لیے درحقیقت جو عمل ہم دنیا میں کرتے ہیں اس کا تکملہ ہماری مکافات و مجازات ہے۔ یا زیادہ وضاحت کے لیے یوں سمجھیے کہ دراصل درخت اپنے بیج میں ایسے ہی موجود ہوتا ہے جیسے انسان نطفہ میں اس لیے جو شخص بیج کو پہچانتا ہے وہ فوراً بتلا سکتا ہے کہ اس بیج سے فلاں قسم کا درخت پیدا ہوگا۔ درخت کے پھل کی تلخی یا شیرینی

Marfat.com

اس کی شکل و صورت، اس کے برگ و بار سب کے سب اِس بیج میں پنہاں ہوتے ہیں۔ اسے انگریزی میں (potentialism) کہتے ہیں۔ یہی حال انسانی اعمال کا بھی ہے۔ ان کی جزا و سزا، ان کے انعام اور ان کے نتائج سب کے سب انہی اعمال میں مضمر ہوتے ہیں۔ چنانچہ شہید کے انعام کو ابدی حیات سے تعبیر فرمایا:۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل	اور جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہو جائیں
اللّٰہ اموات بل احیاءٌ ۵	انھیں مُردہ مت کہو۔ نہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں؛

گویا انھوں نے اپنی زندگی کا بیج بویا اور حیاتِ ابدی کا پھل کاٹا۔ خیرات کو قرضِ حسنہ سے تعبیر فرمایا جو کبھی ضائع نہیں ہوتا اور ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے ـــــ یہی حال اقوام کے اعمال کی مکافات و مجازات کا ہے فرق صرف یہ ہے کہ افراد کو تو مکمل مکافات و مجازات تو آخرت میں ملیگی لیکن اقوام کو پوری پوری مجازات اسی دنیا میں خدا کے قانون کے مطابق مل جاتی ہیں۔

اب زیرِ بحث صورت کو لیجئے۔

ایک فرد یا قوم کا تصوّر کیجئے۔ جو دولت اور سرمایہ (بمعنی سامانِ معیشت) کو حیاتِ ابدی کا ضامن یقین کرتی ہے، اپنی تمام مساعی کو اس کے حصول کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ سوائے مادہ پرستی کے اور کوئی چیز اس کے نزدیک قابلِ توجہ نہیں۔ وہ مادی ساز و سامان کو ہر مرض کا علاج اور ہر دکھ کی دوا یقین کرتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام اخلاقی داعیوں (human values) کو پسِ پشت ڈال کر صرف مادی ساز و سامان کے حصول میں منہمک

Marfat.com

ہو جائے گی۔ وہ ہمز یعنے دوسری اقوام یا افراد کو غلام بنانے اور ان کی ناموس اور جان و مال کو پامال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گی اور اگر انھیں حق کی راہ دکھلانے کی کوشش کی جائے گی تو لمز یعنی حق کو ٹھکرا دیگی۔

اب اس قوم کا ضمیر بالکل مردہ ہو جائے گا۔ اور ان کی اخلاقی حالت دن بدن ردی ہوتی جاتے گی۔ یہاں تک کہ رحم و انصاف سے عاری، اخوت و ہمدردی کے جذبات سے خالی ہو کر مجسم خود غرضی بن جائے گی۔ اعلیٰ انسانیت کا وجود صرف برائے نام رہ جائے گا اور مادہ پرستی میں انہماک کی وجہ سے اس کی روحانی قوت (یعنے National Conceteness) گھٹ گھٹ کر بالکل فنا ہو جائیگی اس کی مثال یوں سمجھئے کہ روح ایک چیڑیا ہے جو ایک ایسے پنجرے میں بند کر دیگئی ہے جس کے تمام کواڑ بند کر دیئے گئے ہیں اور اس میں کھونٹے لگے ہوئے ہیں اور جن میں بھاپ دوڑ رہی ہے تو اس چڑیا کی موت سخت تکلیف سے دم گھٹ گھٹ کر واقع ہو گی۔

قرآن حکیم نے اس مکافات کو صرف ایک لفظ **حطمہ** سے تعبیر فرما کر اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔

حطمہ کے لفظی معنیٰ توڑنے کے ہیں۔ الحطم الکسر (ابن جریر والکشاف)

یعنی جس طرح وہ دوسرے انسانوں یا قوموں کی آزادی۔ جان و مال، تجارت وغیرہ سب کو تباہ کرتے اور آہستہ آہستہ ان کا خون چوس کر انھیں فنا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ خود بھی نہایت تکلیف سے گھٹ گھٹ کر فنا کی گھاٹ اتر جاتے ہیں یعنی جس طرح انھوں نے لوگوں کو توڑا اور پامال کیا۔ اسی طرح جو عذاب خدا کا ان پر مسلط ہو گا اسے بھی **حطمہ** سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی وہ عذاب بھی انھیں اسی طرح پامال کرے گا۔ اسی طرح تباہ و برباد کرے گا جس طرح انھوں نے۔

محکوم اقوام اور محکوم جماعتوں کو مثلاً مزدوروں، کاشت کاروں اور دوسرے مکینوں کو پامال کیا تھا۔

اگر آپ حطمہ کی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو اقوامِ مغرب کی حالت پر غور کیجئے کہ کس طرح پہلے عالم گیر جنگ میں انھوں نے ایک دوسرے کو تباہ و برباد کیا۔ کل تک جس طرح یہ مغربی اقوام، افریقی اقوام اور ایشیائیوں کے خلاف اتحاد کر کے انھیں تباہ و برباد کر رہے تھے۔ اسی طرح سے ان کے آتش بار اسلحہ خود انکے گھروں کی تباہی و بربادی میں سرگرم تھے۔ سرمایہ داری نظام اور بولشویکی نظام نے اتحادِ عمل کر کے فسطائیت اور نازئیت کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن کیا اس سے دنیا کو امن نصیب ہو گیا؟

جرمن اور جاپان کے افسروں کو انسانیت کے خلاف جرائم کی پاداش میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور دنیا پر ظاہر کیا گیا کہ اتحادی امن و انسانیت کے دیوتا اور آزادیٔ عالم کے حامی ہیں۔ لیکن کونسا جرم ہے جس کا جرمن اور جاپانی افسروں نے ارتکاب نہ کیا ہو؟ جو خود انکے افسروں نے بھی اس سے زیادہ گھناونی صورت میں نہیں کیا۔

حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد بے اختیار ہمیں یاد آتا ہے کہ:۔

"تمہیں اپنے مخالف کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے، لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا"

اے منافق! پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر تو نکال تاکہ مخالف کی آنکھ کا تنکا دیکھ سکے"

لیکن اتحادیوں کی سیاہ کاریوں سے قطع نظر، کیا واقعی ان کا اتحاد ایک مقدس مہم کے لیے تھا کہ بنی نوع انسان جور و ستم سے نجات حاصل کریں۔ اور آزادی اور اخوت سے ہم کنار ہوں۔ صلح کانفرنس کی تقریروں اور بعد از جنگ کی ریشہ دوانیوں نے ان سب کی ناپاک سازشوں کو بے نقاب کر دیا ہے اور وہی اتحادی جو پہلے جرمن اور

Marfat.com

جاپان کے خلاف ہمز اور لمز میں مشغول تھے اور ان کے خلاف ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا کہ ناجائز اور ضروری خیال کرتے تھے اب ایک دوسرے کے خلاف ہمز اور لمز میں مصروف ہیں۔ اور اب ماسکو، لنڈن اور نیویارک کے ریڈیو ایک دوسرے کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

یہ حالت تو ان ممالک اور حکومتوں کی ہے۔ اگر مغربی سوسائٹی کو بھی لیا جائے تو وہ اس سے بہتر نقشہ پیش نہیں کر رہی۔ سوسائٹی میں مختلف تخریبی عناصر اپنا کام کر رہے ہیں

جنگ کے بعد جرائم کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوگیا ہے کہ رپورٹرز کی رپورٹوں کے مطابق لندن کی پولیس جو دنیا کی بہترین پولیس میں شمار ہوتی ہے۔ لنڈن اور اسکے مضافات میں جرائم کی لہر (Crime wave) کی روک تھام کرنے سے عاجز ہے۔

۳ نومبر ۱۹۴۶ئہ کی خبر ہے کہ:

کل وزیر اعظم برطانیہ کے پاس انگلستان کے پادریوں کا ایک وفد کنٹربری کے اسقف اعظم (Archbishop) کی صدارت میں حاضر ہوا کہ انگلستان میں جوے کی غیر معمولی اشاعت و ترویج کی روک تھام کی جائے۔ اسی طرح ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ انگلستان کے رومن کیتھولک فرقے کے اسقف اعظم نے زنا کی غیر معمولی زیادتی کے متعلق اپنے گرجا میں احتجاج کیا اور کہا کہ یہ جرائم ہماری سوسائٹی کو بالکل تباہ و برباد کر دیں گے۔"

روس کی حالت اس سے بھی ابتر ہے۔ وہاں سوسائٹی کے خلاف جرائم کی سزا موت ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں ایسے مجرموں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ رہی ہے۔ اور گو وہاں کی حکومت نہایت سفاکی سے لوگوں کو بے دریغ قتل کرتی رہتی ہے

اور اس کا نام اصلاحی باب (Pungee) رکھ کر لوگوں کی آنکھوں میں دھ
جھونکنا چاہتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہاں جرائم کی تعداد روزانہ بڑھ رہی ہے
اوپر ہم اخبارات کا حوالہ دے آئے ہیں۔

امریکہ (U.S.A) جو تہذیب انسانی کا علم بردار ہے۔ اس بارے میں س
سے آگے ہے۔ وہاں کی سوسائٹی کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ چنانچہ مسٹر
سابق صدر جمہوریہ امریکہ نے اپنے افتتاحی صدارتی خطبہ میں فرمایا تھا

"امریکہ سے زیادہ دنیا کے کسی اور خطے اور گوشہ میں انسانی جان انسانی مال اور انسانی عزت و حرمت اس قدر ارزاں نہیں ہیں اور جس قدر منظم جرائم (organised crime) کا ہمارے ہاں ارتکاب کیا جاتا ہے اسکی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اور سب سے بڑھ کر تعجب خیز اور ہمارے لیے باعث شرم امر یہ ہے کہ ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کا پتہ لگانے اور انھیں کیفر کردار تک پہنچانے میں حکومت بالکل عاجز ہے"

یہ حالت تو جنگ سے پہلے کی تھی۔

لیکن اب تو اخبار بین حضرات سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ان کی حا
اور بھی ابتر ہو چکی ہے — جرائم کی کثرت، طلاقوں کی بہتات اور خودکشیوں کی
بھرمار نے ان کی سوسائٹی کو بالکل جہنم کا نمونہ بنا دیا ہے۔ مال و جان اور
آبرو کی حرمت اٹھ چکی ہے۔ خانگی مسرت ایک ایسا لفظ ہے جو وہاں کبھی
معنی ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ دوستانہ تعلقات تک ہوس زر کی نذر ہو
فی الحقیقت مغربی دنیا کی حالت کا نقشہ کھینچنے کے لیے جہنم
لفظ استعمال ہو ہی نہیں سکتا۔

اگر آپ عبرت کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مغرب
پنے اعمال کی وجہ سے کس قدر سخت دردناک عذاب میں مبتلا ہے اور اس
ں یورپ اور امریکہ کے تمام ملک بلا استثنا مبتلا ہیں۔

روس بھی ویسا ہی آتشِ جہنم میں جل رہا ہے جیسا کہ فرانس، انگلستان
ر امریکہ اور یہ سب نتیجہ ہے ان کے غلط نظریہ زندگی کا۔ ان کی مادہ پرستی اور
ا فراموشی خود ان کے لیے وبالِ جان ثابت ہو رہی ہے۔ اور ان کا علم ان
ں دولت۔ ان کی عقل و خرد سب کی سب انھیں اس عذاب سے نجات دلانے
ں ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ اور قدرتِ خداوندی دنیا کو پھر وہی بھولا ہوا
بق یاد دلانا چاہتی ہے کہ کوئی بھی قوم خواہ وہ علم و دولت میں کتنی ہی
رقی کر جائے، ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو چھوڑ کر
حقیقی مسرت اور ابدی زندگی حاصل نہیں کر سکتی۔

یہاں اس امر پر بھی غور کیجیے کہ اللہ تعالے فرماتا ہے کہ حطمہ کیا
ہے؟۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے اور جو خاص ان لوگوں کے لیے
یار کی گئی ہے اور جو انھیں اسی طرح گھیری ہوئی ہے جس طرح کہ ایک شخص
یا پرندہ ایک کمرہ میں بند ہو اور اس کمرے میں کھوکھلے ستون ہوں اور
ان ستونوں میں آگ روشن ہو تو اس شخص یا پرندے کی موت کس طرح سخت
تکلیف میں گھل گھل کر واقع ہوگی۔ ہر لحظہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگا اور
فرار کی کوئی راہ اسے نظر نہ آئے گی۔

ان لوگوں نے دنیا کو جس طرح محکوم اقوام کے لیے ایک محبس اور قید
خانہ بنا دیا تھا اور اپنے جرائم کی کثرت سے جو آگ انھوں نے بھڑکائی تھی
وہ خود ان کے لیے ایک بلائے بے درماں بن چکی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کی

بھڑکائی ہوئی آگ سے یہی مراد ہے۔ وہ سب سے پہلے انہی کو اپنا تختۂ مشق بنائے گی اور ان کے دلوں کو بھسم کر دے گی۔ ان کا امن چین رخصت ہو جائے گا۔ طمانیتِ قلب رخصت ہو جائیگی اور ہر لحظہ اپنے اعمال کے جہنم میں جلیں گے۔ اور تڑپ تڑپ کر جان دیں گے۔ اور جس طرح وہ شخص یا پرندہ جس کی مثال ہم اوپر پیش کر آئے ہیں۔ تڑپ تڑپ کر اور گھل گھل کر سخت تکلیف میں اپنی جان دے گا۔ اسی طرح ان کی روحیں بھی بے اطمینانی، خانہ جنگی، حسد اور طمانیتِ قلب کے فقدان کی آتشِ سوزاں میں گھٹ رہی ہیں اور آہستہ آہستہ کڑھ کڑھ کر فنا ہو رہی ہیں۔

آج خدا کا جو عذاب موجودہ مہذب دنیا پر مسلّط ہے اس کی اس سے بہتر تصویر کا پیش کرنا ناممکن ہے۔ ذرا دیکھئے کہ خدا کو چھوڑ کر، خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوتے راستے سے بھٹک کر اقوام عالم کیونکر دنیا کو تباہ کر رہی ہیں۔ فہل من مدکر

عبرتے گیر از زمانہ اے جواں
تا نہ باشی در شمارِ ابلہاں

قصّہ مختصر سرمایہ داری کا فروغ محض عارضی ہے۔ اور مادہ پرستی و اشتراکیت کا زور بھی محض وقتی ہے۔ ابدی زندگی اور دائمی مسرت ان راستوں پر چلنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان دونوں کو اپنے قلب میں ڈھونڈھنا چاہیئے اور قلب کی اصلاح کا نسخہ وہی ہے جو سورۃ والعصر میں بیان ہوا۔ ان شیطانی جماعتوں کا فروغ اسی وقت تک ہے جب تک کہ مسلمانوں کی کوئی ہیئتِ اجتماعیہ جو سورۃ والعصر کے اصولوں پر بنائی گئی ہو معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ ورنہ جس طرح آفتاب کے طلوع ہوتے ہی شبنم فنا ہو جاتی ہے اسی طرح ایک صحیح اسلامی جماعت کے موجود

Marfat.com

ہوتے ہی یہ سب جماعتیں فنا ہو جائیں گی۔

وسیعلم الذین ظلموا اور عنقریب ظالموں کو معلوم ہو جائے
ای منقلب ینقلبون ۝ گا کہ ان کا کیا انجام ہونے والا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ
رب العالمین

Marfat.com

سُوْرَۃُ الْفِیْل

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝

(اے مخاطب) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ اس نے ان کی تمام (پُرمکر) تدبیروں کو بے کار اور بے نتیجہ نہیں کر دیا۔ ان پر جھُنڈ کے جھُنڈ جانور بھیجے جو ان پر اوپر سے کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے۔ پھر اللہ نے انہیں کھائے ہوئے بھس کی مانند (تباہ و برباد) کر ڈالا۔

جیسا کہ ہم پہلے بالتفصیل بیان کر چکے ہیں، سورہ العصر کے عمومی دعویٰ پر دو اعتراض ہوئے تھے۔ پہلا یہ کہ، بقائے دوام سرمایہ اور زر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب سورۃ الھمزہ میں گزر چکا ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب قوت ہی کا ظہور ہے۔ خود سرمایہ اور زر بھی قوت کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ انگریزی میں اسے (   ) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس نظریے کے معتقدین کا عمل "جس کی لاٹھی اسکی بھینس" کے اصول پر ہے۔ نیٹشے نے جرمن قوم کو اس کا درس دیا تھا۔ چنانچہ ہٹلر اور اس کے رفیقوں کا یہی دستور العمل تھا۔ جاپان بھی اسی حکمت عملی پر کاربند تھا۔ دیگر تمام مغربی اقوام اور امریکہ کا بھی اسی پر عمل ہے اور ایٹم بم کو راز سربستہ بنانے کی تہ میں یہی حکمت عملی پیرا ہے۔ کارل مارکس بھی یہی کہتا ہے کہ مزدور

Marfat.com

طبقہ کو بزور شمشیر بورژوا (سرمایہ دار طبقہ) کو تباہ کر کے اپنی حکومت قائم کرنی اور اپنا اقتصادی نظام رائج کرنا چاہیئے۔ گویا ان تمام غیر اسلامی نظاموں کا مآل ایک ہی ہے کہ دنیا میں فلاح وکامرانی صرف طاقت اور جبر سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس سورۃ میں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور ایک متفق علیہ واقعہ سے استشھاد کیا گیا ہے۔ جس کے دیکھنے والے سینکڑوں نہیں ہزاروں اس سورۃ کے نزول کے وقت موجود تھے۔

اس استدلال کی اہمیت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اس واقعہ کی تفصیلات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہم سیرۃ ابن ہشام اور تفسیر ابن کثیر سے اس واقعے کی جزئیات کو پیش کرتے ہیں۔ ان تفصیلات کا مطالعہ کرتے وقت قارئین کرام کو یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ سورت مشہور اقوال کے نزدیک اصحاب فیل کے واقعہ کے قریباً ۴۵ سال بعد نازل ہوئی اور اسکے نزول کے وقت بے شمار دوست و دشمن ایسے موجود تھے جو اس کے عینی شاہد تھے اور باقی ماندہ نے اس واقعہ کو عینی شاہدوں سے بیک وقت سنا تھا اور یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ابتدائے بعثت میں اہل مکہ آنحضرت صلعم کی تعلیمات کے کس قدر مخالف تھے۔ اس لیے اگر اس واقعہ میں ذرا بھی مبالغہ یا غلط بیانی سے کام لیا جاتا تو اقارب اس کی انتہائی تضحیک میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے اور جس طرح ان کی ہر قسم کی مخالفتیں اور لوچ سے لوچ اعتراضات ہم تک پہنچے ہیں۔ اس واقعہ کی تردید بھی ہم تک پہنچتی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ واقعہ من وعن اسی طرح ہوا جس طرح قرآن حکیم میں مذکور ہے اور جس کی تفصیلات تاریخ و سیر کی کتابوں میں اب تک محفوظ ہیں۔ اس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ امر تاریخی طور پر محقق ہو چکا ہے کہ دنیا کی سب سے پہلی عبادت گاہ خانۂ کعبہ ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (آل عمران۔ ع ۱۰)

اور بے شک سب سے پہلا گھر اللہ کی عبادت کے لیے (جو لوگوں نے بنایا) وہی ہے جو مکہ میں ہے (یعنی خانہ کعبہ) برکت والا اور تمام لوگوں کے لیے ہدایت (کا سرچشمہ)

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کے مقدس ہاتھوں نے خانہ کعبہ کی عمارت کی تعمیر کی۔ عین حالتِ تعمیر میں دونوں باپ بیٹوں کی زبان پر مختلف دعائیں جاری تھیں۔ جن میں منجملہ اور برکات کے نزول کی دعا کے یہ دُعا بھی تھی کہ،

یا خدا نبیِ آخر الزماں صلعم کو اسی اُمت (بنی اسمٰعیل) میں مبعوث فرما۔"
گویا خانۂ کعبہ کی تعمیر کا اصلی مقصد بھی یہی تھا کہ وہ نبی آخر الزماں صلعم کا قبلہ بنے گا اور تا قیامِ قیامت خدا کی عبادت کے لیے مخصوص رہے گا۔

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا

ازل سے مشیّت نے تھا جس کو تاکا
کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہُدیٰ کا

اس تقدس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اس کی خاص عظمت قائم ہو گئی تھی۔ اور قریش چونکہ خانہ کعبہ کے مجاور و متولی تھے۔ اس لیے تمام عرب میں معزز و ممتاز مانے جاتے تھے۔ ان کی حیثیت بالکل موجودہ زمانے کے سجادہ نشینوں کی سی تھی کہ وہ جہاں کہیں جاتے نہایت احترام سے ان کا سواگت کیا جاتا لیکن قریش بھی

ملت ابراہیمی اور توحید سے اسی طرح دور ہو چکے تھے جس طرح آج کل کے بت در نشین اسلام سے۔ اور خانہ کعبہ بتوں کا ایک بتر کدہ بن چکا تھا۔ اس میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت تھے۔ یہاں تک کہ خود حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بُت بھی تھے۔ مگر اس کے باوجود خانہ کعبہ کے تقدس میں کسی قسم کا فرق نہ آیا تھا اور یہ تمام عرب قبائل کی زیارت گاہ تھی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ کا حج مقرر فرمایا تھا جس کی وجہ سے حاجیوں کی سالانہ آمد و رفت اور ان کے قیام و طعام کے بندوبست اور مناسک حج کی تعلیم و نگرانی کی وجہ سے نہ صرف حج کا تیوہار ایک باقاعدہ ادارہ بن گیا تھا بلکہ اس کی وجہ سے لوگ قریش کی سیادت کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ اس لیے صدیوں سے عرب کسی بیرونی سلطنت کا محکوم نہ تھا۔ اس وقت ایران اور روم کی دو بڑی سلطنتیں تھیں اور ارد گرد کی تمام سلطنتیں ان دونوں میں سے کسی نہ کسی کی باج گزار تھیں۔ عرب پر بوجہ اس کی مرکزی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے دونوں حکومتوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مشرقی جانب سے ایرانی حکومت اور مغرب کی طرف سے رومی سلطنت کے باج گزار شاہ نجاشی بادشاہ ابی سینیا نے عرب کو مسخر کرنے کی کوششیں شروع کیں۔

آنحضرت صلعم کی ولادت مبارکہ سے چند سال قبل شاہ نجاشی نے یمن میں اپنی حکومت قائم کر لی اور ابرہہ کو یمن کا والی دگورنر مقرر کیا کسی لڑائی میں ابرہہ کی ناک کے کنارے کٹ گئے تھے۔ اسی لیے اہل عرب اسے ابرہۃ الاشرم (نکٹا ابرہہ) کہتے تھے۔

ابرہہ نے یمن میں اپنی حکومت مضبوط کر کے پُر امن تسخیر کا عمل (peace full penetration) شروع کیا تاکہ نہ صرف تمام ملک عرب اس کا حلقہ بگوش

ہو جائے بلکہ عیسائی مذہب بھی اختیار کرے۔ چنانچہ بہت سے عرب قبائل نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ مگر اس کے سیاسی اقتدار اور عیسائیت کی تبلیغ میں سب سے بڑا روڑا قریش کی سیادت اور خانۂ کعبہ کا احترام تھا اور اس کی انتہائی کوشش بھی اس سنگ گراں کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی۔ اب اس نے خانہ کعبہ کے احترام کو کم کرنے کی غرض سے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا تعمیر کر کے اسے شاہ نجاشی کے نام پر معنون (ڈیڈیکیش) کیا اور اس کا نام قلیس رکھا اور اس کی رسمِ افتتاح نہایت شان سے منائی۔ تمام سردارانِ عرب کی شاندار دعوت کی۔ اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"اے سردارانِ عرب! میرا ارادہ ہے کہ خانہ کعبہ کی بجائے قلیس کو تمھارا قبلہ بناؤں۔ خانۂ کعبہ کی عمارت بالکل حقیر اور فرسودہ ہے۔ اس کے مقابلے میں قلیس کی عمارت بڑی شاندار ہے۔ تم اس کا حج کیا کرو اور نذریں اور نذرانے وغیرہ یہیں لایا کرو۔"

عرب سرداروں نے پہلے تو نہایت صفائی سے انکار کیا، لیکن ابرہہ نے ترغیب کی بجائے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا اور نہایت غضب ناک ہو کر کہنے لگا:۔

"اگر تم سیدھی طرح سے میری بات نہیں مانتے تو میں بزور منواؤں گا۔ تمہارے خانہ کعبہ کو ڈھا دوں گا اور جبراً تم سے قلیس کی عبادت کرواؤں گا۔"

اس کے غصے کو دیکھتے ہوئے سردارانِ عرب جن میں بعض، قریشی سردار بھی تھے۔ دم بخود رہ گئے اور کہا کہ "ہم سوچ کر صبح جواب دیں گے۔"

رات کو کسی منچلے نے قلیس میں جا کر پاخانہ کر دیا۔ اور راتوں رات سبھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ گویا چلتے چلتے یہ پیغام دے گئے کہ تمہارا قلیس ہمارا قبلہ تو

Marfat.com

نہیں بن سکتا۔ سنڈاس رہبت الخلا، بننے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہے۔

صبح کے وقت جب گرجا کے محافظین اٹھے اور انھوں نے دیکھا کہ کس طرح ان کے گرجا کی توہین کی ہے تو وہ روتے ہوئے ابرہہ کے پاس گئے اور کہا کہ کسی گستاخ قریشی نے ہمارے گرجا کو ناپاک کردیا ہے۔ اس پر ابرہہ بہت غضبناک ہوگیا اور اس نے مریم عذرا کی تصویر کے سامنے حلف اٹھایا کہ جب تک میں تمام ملک عرب کو اس گستاخی کا مزا نہیں چکھا دوں اور خانہ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

چنانچہ اس نے ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا جس میں افریقہ کے کئی سو قوی الجثہ ہاتھی بھی تھے۔ ان ہاتھیوں کو انگریزی میں (man mouths) کہتے ہیں اور آج کل ان کی نسل ناپید ہے۔ یہ دراصل لفظ "محمود" کی بگڑی ہوئی صورت ہے جو ابرہہ کے ہاتھی کا نام تھا۔

غرض ابرہہ الاشرم اس خوفناک لشکر کے ساتھ یلغار کرتا ہوا نکلا۔ عربوں نے اس سے پہلے ہاتھیوں کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا اور نہ ان کی لڑائی کے طور طریق سے آشنا تھے۔ اس لیے کوئی قبیلہ ابرہہ کی مزاحمت نہ کرسکا۔ بہت سے قبائل نے مقابلے کی ناکام کوشش کی اور منہ کی کھائی اور ابرہہ بستیوں کو جلا کر خاک کرتا اور کھیتوں کو پامال کرتا ہوا اور اکثر قبائل عرب سے حلف اطاعت لیتا ہوا عین مکہ مکرمہ کے دروازے تک پہنچ گیا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ باہر کے نواح میں قریش مکہ کے اونٹ اور بھیڑ بکریاں بھی چر رہی تھیں۔ اس کے سپاہی سب لوٹ کر لشکر میں لے آئے ہمارے رسول کریم صلعم کے دادا سردار عبدالمطلب اس وقت کفار قریش کے رئیس اور سردار تھے۔ ان کے دو سو کے قریب اونٹ تھے جو باقی لوٹ کے ساتھ ابرہہ کے سپاہی پکڑ کر لے گئے۔ جب سردار عبدالمطلب کو معلوم ہوا کہ

اونٹ بھی پکڑے گئے ہیں۔ تو وہ ابرہۃ الاشرم سے ملنے گئے۔

ابرہۃ الاشرم کو جب معلوم ہوا کہ قریش کے سردار اس کی ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں، تو اس نے حکم دیا کہ ان کا بہت احترام سے استقبال کیا جائے اور بہت عزت سے دربار میں لایا جائے۔ چنانچہ جب وہ دربار میں پہنچے تو اس نے بہت عزت سے اپنے پاس جگہ دی اور مزاج پرسی کے بعد ان کی تشریف آوری کا مقصد پوچھا۔ انھوں نے ابرہہ کو جواب دیا کہ "بادشاہ کے سپاہی میرے اونٹ پکڑ کر لائے ہیں ان کی بازیابی کے لیے آیا ہوں، انھیں میرے حوالے کر دو"

ابرہۃ نے کہا کہ "جب تم یہاں آئے تھے تو تمہاری شکل وصورت دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہوا تھا۔ اور میں نے خیال کیا تھا کہ تم بہت شریف آدمی ہو اور اپنے خانہ کعبہ کو میرے حملے سے بچانے کی سفارش کرنے کے لیے آئے ہو۔ لیکن تمہاری درخواست سُن کر تمہاری تمام قدر ومنزلت میرے دل سے اُٹھ گئی۔ تم بہت ہی خودغرض آدمی ہو کہ میں تو تمہاری آبائی اور قومی عبادت گاہ کو ڈھانے کا عزم بالجزم کر کے آیا ہوں۔ اور تمھیں اپنے اونٹوں کی پڑی ہے۔ افسوس تمہاری غیرت وحمیت پر"

سردار عبدالمطلب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:۔

اَنَا رَبُّ الابل وانّ للبیت رباً سیمنعہٗ — میں تو اونٹوں کا مالک ہوں (اس لئے مجھے ان کا فکر ہے) اور یقیناً (اسی طرح اس بیت عتیق کا بھی آقا ومالک ہے۔ وہ خود اسے دشمنوں سے بچائے گا۔

ابرہۃ نے جل کر جواب دیا:"

"خانۂ کعبہ کا رب یقیناً اسے مجھ سے نہیں بچا سکے گا"

Marfat.com

سردار عبد المطلب نے جواب دیا، کہ تم جانو اور وہ۔ رب البیت تم سے خود نبٹ لے گا۔" یہ کہا اور اٹھ کر جانے لگے۔ ابرہہ نے ان کے اونٹوں کی واپسی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ وہ اپنے اونٹوں کو لے کر چلے آئے۔

مکہ پہنچ کر سردار عبد المطلب نے تمام رؤسائے قریش کو جمع کیا کہ "ہم ابرہۃ الاشرم کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ ہم مکہ خالی کر دیں اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لیں۔"

سب نے اس سے اتفاق کیا اور تمام اہل مکہ کو ہمراہ لے کر شہر خالی کرنا شروع کیا۔ عبد المطلب نے رخصت ہوتے ہوئے خانہ کعبہ کا پردہ پکڑ یہ دعا مانگی:۔

اللھم ان المرء یمنع اھلہ فامنع ہلالک رحلال۔ تزوی مقیم
اے اللہ ہر شخص اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہے۔ تو بھی اپنے گھر کی پناہ میں رہنے والوں کی حفاظت فرما۔

لا یغلبن صلیبہم ومحالھم ابداً محالک رمحال، تدبیر وتو شدید المحال،
ان کی صلیب اور ان کی تدبیر کبھی بھی تیری تدبیر پر غالب نہیں آسکتی

ان کنت تارکھم وکعبتنا فامر ما بدالک
اگر تو انہیں اور خانہ کعبہ کو چھوڑنے والا ہے کہ ان کا جو جی چاہے اسکے ساتھ کریں تو جو تیری مرضی ہے وہ پوری ہو۔

یا رب لا ارجو لہم سواکا یا رب فامنع منہم حماکا
اے میرے رب میں تیرے سوا اور کسی سے امید نہیں رکھتا۔ اے رب تو ان سے اپنے حرم کو محفوظ رکھ

Marfat.com

اس کے بعد مکۂ مکرمہ کو خالی کر کے خانۂ کعبہ کو حافظِ حقیقی کی حفاظت میں سونپ کر تمام قریش پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھنے لگے۔

دوسری صبح میدان خالی پا کر ابرہتہ الاشرم نے اپنا لشکر آراستہ کیا۔ اور بڑے طمطراق سے خانۂ کعبہ پر چڑھائی شروع کر دی۔ جونہی لشکر شہر کے قریب پہنچا۔ فضائے آسمانی پرندوں سے بھر گئی۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ لشکر پر منڈلانے لگے اور ہر ایک کے پنجوں اور چونچ میں کنکر اور پتھر تھے۔ ان سب پرندوں نے لشکر پر پتھر برسانا شروع کر دیئے ان کنکریوں میں ایسی سمیت تھی کہ جس شخص کو بھی لگ جاتی تھی وہ وہیں پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔ تمام لشکر تتر بتر ہو گیا۔ ہزاروں آدمی اور سینکڑوں ہاتھی تو وہیں ڈھیر ہو گئے۔ باقی جو بچے وہ بھی بُری طرح زخمی ہو گئے۔ کسی کی آنکھیں جاتی رہیں۔ کوئی ٹُنجا اور کوئی لنگڑا ہو گیا۔ خود ابرہتہ اپنے ہاتھی سمیت بھاگا۔ مگر راستے ہی میں دونوں ہلاک ہو گئے۔

مورخین کا بیان ہے کہ لشکر میں چیچک کی وبا پھیل گئی۔ جو عرب میں اس سے پہلے نامعلوم تھی۔

سرسید احمدؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام کہتے ہیں کہ:۔

طیراً ابابیل کے الفاظ کا استعمال محض استعارتاً استعمال ہوا ہے جس سے مراد چیچک کی وباء ہے اور کنکریوں سے مراد چیچک کے جراثیم سے ہے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ پرندوں نے کنکریاں تو واقعی پھینکی تھیں۔ اور چیچک کی وبا بھی انھیں کنکریوں سے پھیلی۔ اسی بناء پر سرسید احمدؒ جو معجزات کے سرے سے منکر ہیں اور ان کا دعوا ہے کہ قرآنِ حکیم میں کسی خرق عادت یا معجزے کا مذکور نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اس

Marfat.com

واقعے کی یہی توجیہہ تسلیم کرلی جائے۔ تو بھی اس کے خرقِ عادات اور معجزہ ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ عین اسی وقت جب وہ لشکر حملے کے لیے نکلا۔ اور اس میں چیچک کی وباء کا پھوٹ نکلنا اور قریش مکہ کا اس سے محفوظ رہنا فی نفسہٖ معجزہ اور خاص نشانِ الٰہی سے کم نہیں۔ دوسرا یہ کہ خانۂ کعبہ کا اس طرح دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہنا کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ کیونکہ خانۂ کعبہ تو بالکل بے یار و مددگار تھا۔ مکہ خالی ہوچکا تھا۔ اگر لشکر میں سے سو پچاس آدمی بھی چیچک سے محفوظ رہتے جو بالکل قرینِ قیاس ہے، تو بھی وہ ارادہ پورا کرسکتے تھے۔ اس لیے ان حالات میں بھی یہ واقعہ ایک حیرت انگیز معجزے سے کم نہیں۔

اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی تاریخی طور پر بالکل صاف ہے۔

قریشِ مکہ نے ابرہۃ الاشرم کے لشکر کی تباہی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور میدان خالی پاکر خوشی خوشی وہ اپنے گھروں کو لوٹ آئے تھے۔ بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ شعرائے نامدار نے معرکۃ الآراء قصائد لکھے جو آج تک محفوظ ہیں۔ ہم مثال کے طور پر صرف ایک شاعر کے قصیدے کا ایک شعر نقل کرتے ہیں جو سیرۃ ابنِ ہشام اور تفسیر ابنِ کثیر میں منقول ہے

اين المفرّ و الاله الطالبُ

وَالاَشرم المغلوب ليس الغالبُ

ترجمہ: جب خود خدا کسی کو پکڑنے لگے تو کون بھاگ کر جان بچا سکتا ہے۔ اور نکٹا بدبخت تو مغلوب ہی ہوا غالب نہ ہوسکا۔"

ان میں سے اکثر قصائد کلامِ جاہلیت میں محفوظ ہیں۔ غرض یہ واقعہ تاریخِ عرب میں اس قدر مشہور رہے کہ حدِ تواتر تک پہنچ چکا ہے۔ عربی ہجرت کی ابتداء اسی

واقعہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا نام ہی عام الفیل (ہاتھی کا سال) رکھدیا گیا۔
اور تمام واقعات سنیسی کا شمار اسی واقعہ سے ہونے لگا کہ فلاں واقعہ عام الفیل سے
اتنے سال بعد ہوا۔ بچوں کو اس کی لوریاں دی جاتی تھیں۔ عرب کے قومی میلوں میں
اس کے گیت گائے جاتے تھے۔ اور جس وقت یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی اس وقت بھی اس
کے ہزاروں عینی شاہد موجود تھے۔ اسلیے اگر کوئی واقعہ تاریخی اعتبار سے عین الیقین کے مرتبہ
تک پہنچ سکتا ہے تو یقیناً یہ واقعہ تھا۔

سیرۃ ابنِ اسحاق میں روایت ہے کہ:

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے بچپن مکہ کے
بازاروں میں ابرہۃ الاشرم کے محمود ہاتھی کے مہاوت اور سائیس دونوں کو بچشم خود
دیکھا کہ وہ اندھے لولے اور لنجے تھے اور بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ اسی طرح حضرت
اسماء بنت ابی بکر سے بھی مروی ہے۔

منکرینِ معجزات یا ہر معجزے کی عقلی دلیل کے متلاشی حضرات اس بات کو بھول
جاتے ہیں کہ چیچک کے حملے کی تعبیر پرندوں کے کنکر مارنے سے صرف اسی صورت میں
صحیح ہو سکتی ہے کہ جب قرآن مجید کے اولین مخاطب چیچک کے جراثیم کے نظریے
سے آشنا ہوں۔ لیکن چیچک کے جراثیم کا نظریہ بالکل جدید نظریہ ہے۔ جس کا
تصوّر بھی قریش کے ذہن نہیں آ سکتا تھا۔ چہ جائیکہ وہ اس استعارے سے
لذّت اندوز ہوں ۔ پھر ان کی یہ توجیہہ عقلاً بھی مستبعد ہے۔ کیونکہ چیچک کی وبا کے
پھوٹنے کے لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ کم از کم تین دن تک ہلکا ہلکا بخار،
پھر اس کا بڑھنا اور بدن پر دانوں کا نکلنا۔ سات دن کے بعد وہ پوری بھرتی
ہے۔ لیکن تمام کے تمام لشکر کا ایک ہی وقت میں اسی میں مبتلا ہو جانا اور بھی
مستبعد ہے۔

منکرِ معجزات ایک انگریز فلسفی نے کیا خوب کہا ہے: "معجزات کے بارے میں ہمیں یہ اعتراض نہیں کہ فلاں معجزہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ کیوں کہ قانونِ قدرت خود ایک موہوم امر ہے جو علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

ہمیں بائبل کے معجزات پر صرف یہ اعتراض ہے کہ ان کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں اگر کسی معجزے کی شہادت تاریخی اعتبار سے ناقابلِ انکار ہو۔"

اب اس واقعہ پر مزید غور کیجیے کہ مستند ترین روایات کے مطابق اس واقعہ کے قریباً ایک ماہ بعد ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تولد ہوئے اور چالیس سال کی عمر میں آپ پر وحی نازل ہوئی۔ یہ سورہ مبارکہ آپ کے عہدِ نبوت کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر آپ کی نبوت کے پانچویں سال بھی اس کا نزول تسلیم کر لیا جائے تو گویا اس واقعہ کے ۴۵ سال بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ اس لیے اس کے نزول کے وقت اس واقعہ کے عینی شاہد کثرت سے موجود تھے۔ اور ان میں سے اکثر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن اور آپ کی تعلیمات کے سخت ترین مخالف تھے۔ اس لیے اگر اس کی حکایت میں حقیقت سے جزئی اختلاف بھی ہوتا تو وہ فوراً آنحضرت صلعم پر اعتراض کرتے۔ جو لوگ بات بات پر آپ کو (معاذاللہ) مفتری، کذاب وغیرہ کہتے تھے اور بغیر کسی اعتراض گنجائش کے اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے تھے اور ان کے تمام اعتراضات ہم تک برابر پہنچے ہیں تو وہ اس صورت پر اعتراض کرتے کہ ہمیں آسمان کے پرندے نہ ملے اگر چیچک کی وبا کے چھوٹ پڑنے سے ابرہہ کا لشکر تباہ و برباد ہوا ہو تو کفار قریش کہتے کہ (معاذاللہ) محمد صلعم نے جھوٹ بولا ہے، پرندے کہاں تھے؟ اور انھوں نے کنکریاں کب ماری تھیں۔ کیونکہ جراثیم کا اور ان کے نام کا تصور بھی ان کے

فہم وادراک سے بالاتر تھا۔ اس لیے اس امر سے انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ اس واقعہ میں سرِ مو فرق نہ تھا۔

ہاں مورخین نے جو چیچک کا ذکر کیا ہے تو وہ بھی صحیح ہوگا۔ مگر اس میں تقدم و تاخر زماں کی غلطی ہے۔ کیونکہ جب لشکر میں مری پڑی تو چیچک کا پھوٹ پڑنا بالکل قرینِ قیاس ہے کیونکہ ایسے حوادث کے بعد کسی نہ کسی وبا کا پھوٹ پڑنا یقینی ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء ۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم کے بعد انفلوئنزا کی وبا پھوٹ پڑی اس لیے ہم تاریخی واقعہ کی صحت سے انکار نہیں کرتے۔ صرف اس کے تقدم زمانی سے انکار کرتے ہیں۔ عرب میں پہلے پہل چیچک اس واقعہ سے شروع ہوئی ہے۔

یہاں ایک اور شہادت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حج میں رمی جمار غالباً اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

گویا یہ واقعہ اللہ تعالےٰ کے عظیم الشان معجزات میں سے تھا۔ یہ ایک نہایت مہتم بالشان آیت الٰہی اور اللہ کی نصرت و تائید کی ایک روشن نشانی تھی۔ اور اس واقعہ کے عین اسی سال جس سال آپ صلعم کی ولادتِ باسعادت ہوئی واقع ہونے میں اس امر کی طرف صاف اشارہ تھا کہ خانۂ کعبہ کی حفاظت کا یہ اہتمام محض اس لیے تھا کہ ازل سے وہ نبی آخرالزماں کا قبلہ مقرر ہو چکا تھا اور خدا کے علم میں یہ مقدّر ہو چکا تھا کہ آخری چشمۂ ہدایت اسی گھر سے پھوٹے گا۔

تشریح الفاظ:۔

الم تر: اس کا روئے سخن یا تو خود آنحضرت صلعم کی طرف ہو سکتا ہے "کیا تو نے نہیں دیکھا" یعنی یہ واقعہ اس درجہ عین الیقین تک پہنچا ہوا ہے اور اخبار متواترہ اور آثار مسلمہ نے اسے ایسا یقینی بنا دیا ہے گویا آپ اسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر اس کا خطاب کفار قریش کی طرف ہو تو اس کے معنی یہ ہو

Marfat.com

ہو سکتے ہیں کہ۔ "اے مخاطب کیا تو نے نہیں دیکھا" یعنی اے معشرِ قریش! تم خود اس وقت موجود تھے۔ جب ہاتھی والوں کا لشکر کعبہ پر حملہ آور ہوا اور ان کا کیا حشر ہوا؟

کیفَ فَعَلَ رَبُّكَ۔ سے منصوب ہے نہ الم تر سے گویا اس کے معنی ہیں اَیَّ فِعْلٍ فَعَلَ رَبُّكَ۔ یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا؟ استعجاب فعل پر ہے اور زور بھی اسی پر ہے۔

کَیْدَھُمْ: ان کی تدبیر اور کوشش جو انھوں نے خانہ کعبہ کی تخریب کے لیے کی۔

تضلیل: ضائع کرنا۔ بالکل بے نتیجہ اور بے کار کر دینا۔ و منہ قولہ تعالیٰ۔

وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ — اور کافروں کی پکار تو بالکل بے اثر اور بے نتیجہ ہوتی ہے۔

اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا — جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں اکارت گئیں اور بے نتیجہ ہیں۔

(یہاں اصحاب فیل یعنی ابرہہ کی دو تدبیروں کی طرف اشارہ ہے)

اول۔ اس نے قلیس گرجا زرِ کثیر سے بنایا تھا کہ وہ عام و خاص کا مرجع بن سکے اور بیت اللہ کی بجائے قلیس حج کا مرکز بن سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسکے اس ناپاک ارادے پر نہ صرف پانی پھیر دیا بلکہ اسے نیست و نابود کر دیا۔ اور آج اس کا نام و نشان تک بھی نہیں ملتا۔

دوئم:۔ وہ کعبہ کو ڈھانے کے ارادے سے آیا تو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف خانہ کعبہ کو اس کی دست برد سے بچا لیا بلکہ خود اسکو اور اس کے لشکر کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ اور وہ حرم میں داخل بھی نہ ہونے پایا:۔

Marfat.com

اَبَابِیلَ :- پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔

بعض نحویوں کا خیال ہے کہ یہ شماطیط کی طرح اسم جمع ہے جس کا واحد نہیں ہوتا، لیکن بعض کے خیال میں یہ ابالۃ کی جمع ہے۔ ضرب المثل ہے۔

ضغث علی اِبَّالتہ :- مصیبت پر مصیبت جس سے انسان بالکل ہی ٹوٹ جائے۔ انگریزی میں اسے (last straw on the back of the camel) کہتے ہیں۔ وہ اس کا لفظی ترجمہ ہے۔

اِبَّالتہ :- لکڑیوں کے بہت بھاری گٹھے کو کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ اونٹ نہیں اٹھا سکتا۔ اور پرندوں کے جھنڈ کو بھی ابالتہ سے اس لیے تشبیہ دی جاتی ہے کہ وہ بھی اسی طرح اکٹھے ہوتے ہیں جس طرح لکڑیوں کا گٹھا۔

سِجِّیلٍ :- یہ سنگ وگل کا معرب ہے۔ یعنی پختہ مٹی کی کنکریاں۔ یا یوں کہیے کہ وہ ایسی کنکریاں تھیں جن میں مٹی اور پتھر دونوں شامل تھے۔

عَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ۔ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، لیکن مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔

ابن عباس کے نزدیک عصف دانے کے اوپر کے چھلکے کو کہتے ہیں۔ جیسے گیہوں کی بھوسی۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی ورق الزرع یعنی ہرا پتّہ کے ہیں ماکول۔ اے وقع فیہ الاکال۔ جسے کیڑا لگ گیا ہو۔ یعنی کھایا ہوا پتا۔

سورۃ الہمزہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مادی ساز و سامان کی کثرت انسان کو دائمی ترقی سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔ بلکہ مادّہ پرستی اور دنیا طلبی خسر کا علاج ہونے کے بجائے انسان کو تباہی کے گڑھے میں لے کر گرتے ہیں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس سورت میں تاریخی شہادت سے یہ ثابت کیا گیا ہے

Marfat.com

کہ مادی ساز و سامان اور مادہ پرستی کی طرح مذہبی قوت (   )
بھی انسان کو خسران سے نہیں بچا سکتی بلکہ الٹا تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ تاریخی
استقرار قرآنی اولیات میں سے ہے اور اپنے سے پہلے کی الہامی کتابوں کی
قرآن حکیم تاریخی قصص و واقعات کو محض افسانہ سرائی یا سنین وار تفصیل کے لیے
پیش نہیں کرتا بلکہ وہ تاریخی قصوں اور واقعات کو اس لیے پیش کرتا ہے کہ
انسان اپنے ماضی سے اپنے حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر میں مدد لے تاریخ
گزشتہ قوموں کے حالات کا ریکارڈ ہی نہیں۔ بلکہ وہ ایک آئینہ ہے جس میں ہر
قوم اپنے مستقبل کی تصویر دیکھ سکتی ہے۔

مشہور مقولہ ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" اس کا مطلب یہی
ہے کہ اگر کسی قوم کو خاص حالات سے گزرنے کے بعد خاص نتائج سے دوچار ہونا
پڑے۔ تو آج بھی اگر وہی حالات دوسری قوم کو پیش آئیں گے تو لازماً اسے بھی انہی
نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔

تاریخی استقراء کا ایک دوسرا اہم نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ میں کوئی واقعہ بھی اتفاقی
نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمام واقعات ایک تاریخی سلسلہ کی کڑیاں ہوتی ہیں جن میں اقتران
زمانی یا تقدم و تاخر زمانی محض اتفاقی نہیں ہوتا بلکہ اسباب و علل کا ایک مسلسل سلسلہ
انہیں جکڑے ہوئے ہوتا ہے۔

اب زیر نظر واقعہ پر غور کیجیے

ایک مغرور و متمرد بادشاہ جو کوس لمن الملک بجا رہا ہے اور حیوانی طاقت
کے نشے میں اس قدر سرشار ہے کہ اُس بیت اللہ کو جسے حضرت ابراہیم و حضرت
اسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں نے خدا کی عبادت کے لیے خاص طور پر
تعمیر کیا تھا، ڈھانے اور اس کی جگہ اپنے بنائے ہوئے گرجا کو قبلہ بنانے کے

ارادے سے نکل کھڑا ہوا اور خانۂ کعبہ کو بے یار و مددگار دیکھ کر فخر یہ چلا اٹھا کہ ربِ کعبہ بھی اسے میری ہلاکت آفریں ضرب سے نہیں بچا سکتا" کس طرح آناً فاناً بغیر مادی اسباب کے، محض تائیدِ الٰہی سے تباہ و برباد ہو گیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خانۂ کعبہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے نہیں بچایا تھا کہ کفارِ قریش کا دین نصاریٰ کے دین سے بہتر تھا۔ بلکہ اس کی حفاظت کی ایک وجہ یہی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ازل سے ہی اس کی قسمت میں یہ مقدر ہو چکا تھا کہ حق کا آخری سرچشمہ اسی مرکز سے پھوٹے گا۔ اور وہ نبی آخر الزماں کا قبلہ بنے گا۔ جب حق کے مرکز کی حفاظت کا اتنا اہتمام اللہ تعالیٰ کو منظور تھا تو خود حق کی حفاظت اور بقا کا کس قدر خیال اسے ہوگا جب خانہ کعبہ کو، جسے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مقدس ہاتھوں نے اللہ کے لیے معنون کیا تھا۔ اور جسے مشیتِ ایزدی نے اسلیے مخصوص کر دیا تھا کہ حق کی آواز یہیں سے بلند ہوگی اور خاتم النبین صلعم کی درس گاہ یہی قرار پائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت نے ایسے وقت میں باطل اور باطل کے دست بُرد سے بچا لیا جب ایک زبردست اور طاقتور دشمن سے مقابلے کی تاب نہ لاکر اس کے تمام محافظین اور زائرین اسے چھوڑ گئے تھے تو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کو بے یار و مددگار چھوڑ دے؟ نہیں یہ ممکن نہیں کہ باطل اور اس کا لشکر حق پر فتح پا سکیں۔ وہ ہمیشہ مغلوب ہی رہے گا۔

قصہ مختصر، دنیا میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is Right) کا قانون نافذ نہیں، بلکہ حق کی قوت بے پناہ ہے (Right is might) کا قانون جاری ہے۔

تاریخی واقعات محض اتفاقی حوادث نہیں ہیں۔ بلکہ جیسا کہ ہم اوپر تصریح

Marfat.com

کر آئے ہیں وہ سب مشیتِ الٰہی کی کارفرمائی کا مظہر ہوئے ہیں۔ گو کفار نے ہمیشہ ان واقعات کو اور اسی طرح حق کے مقابل باطل کی شکست کو اور کفار کے ہدایتِ ربانی سے انکار پر عذاب میں مبتلا ہونے کو محض اتفاقی قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ان کا اعتراض منقول ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ (الشعراء ع۷)

"یہ تو یونہی پہلوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہوگیا تھا۔ اور ہم تو عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے۔"

لیکن قرآن حکیم نے ان کے اس دعوے کی تردید کی ہے اور حق و باطل کی آویزش میں حق کی فتح کو یقیناً ایک ربانی نشانی قرار دیا ہے جس کے خلاف کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ (النساء ع)

کیا ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک نہیں کیا پھر دوسری قوموں کو ان کا جانشین بنایا اور ہم اسی طرح مجرموں کو ہلاک کرتے رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

اور ہم نے نبیوں کے بارے میں پہلے سے ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہماری تائید و نصرت ہمیشہ ان کے ساتھ ہی ہوگی۔ اور ہمارا لشکر ہمیشہ حق کے دشمنوں کے مقابلے میں غالب ہی رہے گا۔

گویا تمام تاریخ فی الحقیقت اسی سچائی کی تفسیر ہے کہ حق (right) خواہ کیسا ہی بے سروسامان ہو قوت (might) پر ہمیشہ ہی غالب آتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم حق کو [illegible]

Marfat.com

فید مغہ فاذا ھوزاھق ہیں۔ پس وہ باطل کا سر کچل کر رکھ دیتا ہے تو وہ آناً فاناً ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔
(الانبیاء)

قصہ مختصر، اس آیت میں آں حضرت صلعم کو اور آپ کے پیروؤں کو ایک زبردست بشارت دی گئی ہے کہ جب، خانہ کعبہ کو جو آپؐ کی تعلیمات کا مرکز بننے والا تھا، اللہ تعالےٰ نے تباہ نہیں ہونے دیا اور اسے تباہ کرنے کا ارادہ رکھنے والوں کو ہلاک کر دیا۔

تو اب جب کہ وہ سرچشمۂ ہدایت پھوٹ چکا ہے اور خدا کے آخری نبی حضرت محمد صلعم تشریف لا چکے ہیں جن کے لیے یہ تعمیر ہوا تھا۔ اور اللہ کا آخری فرمان ان کے ذریعے اللہ کے بندوں تک پہنچنا شروع ہو گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کیونکر اس نبی کو اور ان کی تعلیمات کو، اور ان کی جماعت کو کفّار کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے دے گا۔ جو مولا اینٹوں اور گارے کے مکان کی حفاظت پرندوں سے با جراثیم سے کروا سکتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے نبی اور اپنی آخری اور مکمل تعلیم اور اپنے خدّام کی حفاظت پر بھی قادر ہے۔ وہ ضرور حق کو باطل پر فتح دے گا۔ حق کی بے سر و سامانی اور باطل کا ساز و سامان اس لڑائی میں فیصلہ کُن نہیں۔ بلکہ فیصلہ کُن تو خدا کی تائید و نصرت ہے۔

اسی لیے یہ واقعہ اسی سال ظہور پذیر ہوا جس سال ہمارے نبی صلعم اس دنیا میں تشریف لائے۔ اسلیے یہ آنحضرت صلعم کا ایک زبردست اور باہر نشان ہے جس میں آپ کے دشمنوں کی کامل تباہی کی پیشین گوئی ہے اور نیز اس امر کی بشارت بھی ہے کہ تا قیام قیامت اسلام کے دشمن اسلام اور قرآن کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

تاریخی استقرار سے اس واقعہ سے بعض نہایت اہم نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

Marfat.com

۱ اوّل۔ دنیا میں ایک زبردست قانونِ قدرت کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ حق و باطل ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے ہیں اور اس آویزش کا نتیجہ ہمیشہ ایک ہی رہا۔ حق کی فتح اور باطل کی شکست۔ باطل ہمیشہ نئے نئے روپوں میں سر اٹھاتا ہے اور نت نئے حربے استعمال کرتا ہے اپنے ساز و سامان کی کثرت اور قوت پر گھمنڈ ہوتا ہے اور حق گو بظاہر اس کے مقابلے میں کمزور و ناتوان معلوم دیتا ہے۔ لیکن حق کی روحانی قوتیں ہمیشہ باطل کی قوتوں پر فتح پاتی ہیں۔ حق ایک چٹان ہے جس سے ٹکرا کر باطل پاش پاش ہو جاتا ہے۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ — حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل فنا ہونے والا ہے۔

(بنی اسرائیل۔ ع)

حق کے مقابلے میں باطل کی مساعی بے نتیجہ اور بے اثر رہتی ہیں

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ

(الصف)

یہ (کفار) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور اللہ تو [illegible] دین کو مکمل کرے (تمام دنیا میں پھیلا کر) [illegible] وہ اپنی [illegible] اللہ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین [illegible] کو دنیا کے تمام دوسرے دینوں پر غالب کرے۔ اور مشرکوں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔

(آیت ۸ - ۹)

دوئم:- دنیا میں انسانی ترقی، انسانی اخلاقِ فاضلہ اور انسانی تہذیب و تمدّن میں ہر قابلِ اعتناء اور پائیدار قدر (Values) صرف حق کی باطل پر فتح کا نتیجہ ہے۔ انہیں صرف کشاکش کا نتیجہ قرار دینا جیساکہ تاریخ کے مادی نظریے (material conception of history) کے قائلین کا دعوای ہے انسانی فطرت اور تاریخ سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ قرآن تمام تاریخی ارتقاء کو حق و باطل کی آویزش کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اس کو سنت اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور بقائے (نفع) اور بقائے (صلح) کے مُسلّمہ قانون کا ظہور قرار دیتا ہے۔

سوئم:- حدیث شریف میں آیا ہے کہ خدا کے نزدیک ایک مسلمان کی حُرمت خانہ کعبہ کی حُرمت سے بھی زیادہ ہے۔ تو جب خدا تعالےٰ نے خانۂ کعبہ کی حفاظت اس طرح فرمائی تو کیا دنیا میں اگر صحیح اور سچے مسلمانوں کی کوئی جماعت ہوگی تو کیا خدا اس کا ساتھ چھوڑ دے گا؟ نہیں، یہ ممکن ہی نہیں۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

چہادم:- اگر مسلمان رب کے سب اسلام کو چھوڑ دیں تو بھی قرآن کی تعلیم اور اسلام فنا نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان کا محافظ ہے۔

یا ایھا الذین امنوا من یرتد منکم	مسلمانو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے
عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم	پھر جائے گا۔ (تو وہ اللہ کے دین کو کسی قسم کا
یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی	ضعف نہیں پہنچا سکے گا کیونکہ) اللہ تعالےٰ اپنے
المؤمنین اعزۃ علی الکافرین	دین کی تائید کے لیے (عنقریب ایسے لوگوں
یجاھدون فی سبیل اللہ ولا	کو پیدا کرے گا جن سے اللہ محبت کرے گا

Marfat.com

يخافون لومة لائم ط ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله واسع عليم ٥ انما وليكم الله ورسوله والذين آمنوا الذين يقيمون الصلوٰة ويؤتون الزكوٰة وهم راكعون ٥ ومن يتول الله ورسوله والذين آمنوا فان حزب الله هم الغالبون ٥ (المائدہ ع ۸)

اور وہ اللہ سے محبت کریں گے مسلمانوں سے (یعنی آپس میں) نرم دلی اور محبت کا سلوک کریں۔ کافروں کے مقابلے میں بہت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ جسے چاہتا ہے (اللہ کے دین کی خدمت کی توفیق) عطا فرماتا ہے اور اللہ کشائش والا صاحب علم ہے۔ تمہارا رفیق تو وہی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کو دوست رکھتا ہے (تو وہ اللہ کی جماعت میں شامل ہو گیا) اور یقیناً اللہ کی جماعت ہی سب پر غالب ہے:

اس آیت میں اسلام کی ابدی بقا اور حفاظت کے متعلق ایک عظیم الشان پیشین گوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی غفلت اور اسلام دشمنی سے دین اسلام کو کسی قسم کا ضعف نہیں پہنچ سکتا وہ تو ضرور سر بلند اور ممتاز ہوگا۔ البتہ ان نام نہاد مسلمانوں کا حشر عیاذاً باللہ بہت عبرتناک ہوگا بشرطیکہ وہ وقت پر نہ سنبھلے۔ اس لیے اگر ایسے لوگ سب کے سب بھی اسلام سے منحرف ہو جائیں تب بھی وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی جگہ ایک ایسی قوم لے آئے گا جو اللہ کے عشق میں سرشار ہوگی اور اللہ ان سے محبت کریگا۔ وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان ہوں گے اور ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کا برتاؤ

Marfat.com

کریں گے اور دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور بالآخر ضرور ان پر غالب آ جائیں گے۔

اسلام کی تاریخ کے طالب علم کو معلوم ہے کہ یہ پیشین گوئی ہر قرن میں اور ہر حادثے کے بعد حرف بحرف پوری ہوتی رہی ہے۔ سب سے پہلے تو آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جب فتنۂ ارتد نے سر اٹھایا تو خدا تعالیٰ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ جیسا جری اور مخلص لیڈر مسلمانوں کو عطا فرمایا جن کی جرأتِ ایمانی اور مستقل مزاجی کی روشن مثال نے صحابۂ کرام کے ایمانوں کو تازہ کر دیا اور فتنۂ ارتداد کا سر کچل دیا گیا۔

اسی طرح جب مسلمانوں کی بداعمالیوں کی انتہا ہو گئی اور خدا کا عذاب ان پر ھلاکو خان کے حملے کی صورت میں نمودار ہوا اور ایک کروڑ سے زیادہ مسلمان اس کی تلوار کی گھاٹ اتار دیے گئے اور بظاہر اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تو خدا تعالےٰ نے امام ابن تیمیہؒ کو پیدا کیا جن کی مساعی سے نظامِ خلافت دوبارہ زندہ ہو گیا۔ ایک طرف تو ہلاکو خاں حلقہ بگوشِ اسلام ہوا اور اس کی نسل سے عثمانی تُرک پیدا ہوئے جو صدیوں تک اسلام کے لیے سینہ سپر رہے اور دوسری طرف صلیبی بھیڑیوں کے سیلاب کو روکنے کے لیے سلطان نور الدین اور سلطان صلاح الدین جیسے سرفروش مجاہدین تلوار کھینچ کر میدان میں نکل آئے اور صلیبی بھیڑیے منہ کی کھا کر یورپ کی طرف لوٹ گئے۔

آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام پر اسی طرح ہجوم کیا ہے جس طرح اس سے پہلے کئی دفعہ ہو چکا ہے۔ اور تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔ آج بھی ہجوم کرنے والے ایک طرف سے تو ہلاکو خان کے جانشین اشترا کی اور دوسری طرف

Marfat.com

ابرہت الاشرم اور صلیبی بیڑیوں کے جانشین عیسائی ہیں اور تیسری طرف سے اندرونی دشمن ہیں۔ اور مسلمان اس طرح اسلام کو چھوڑ کر الگ ہو رہے ہیں جس طرح قریش نے خانۂ کعبہ کو عیسائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ زمانے کے ننگ زمانہ مسلمانوں کا اخلاص فی التوحید سردار عبدالمطلب کے برابر بھی نہیں اور وہ اعتماد اور توکل میں کفارِ قریش سے بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ قرآن حکیم میں کفار قریش کے متعلق آیا ہے کہ سخت ترین مصیبت میں جب اسباب کا آسرا اٹھ جاتا تھا تو وہ ایک خدا کو پکارتے تھے:۔

دَعَوُا اللّٰہ مخلصین لہ الدین — "اللہ کو اس کی بندگی میں خالص ہو کر پکارنے

لئن انجیتنا لنکونن من الشاکرین — لگے کہ اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات

(یونس ع) — دی تو یقیناً ہم تیرے شکر گزار بندے بن

جائیں گے۔"

اور جیسا کہ ہم اوپر تفصیل سے لکھ آئے ہیں اور کتب سیر میں بھی سردار عبدالمطلب کے متعلق منقول ہے کہ اس نے بھی کہا تو یہی کہا کہ:

"اے ربِ کعبہ! ہم تیرے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اب تو خود ہی اس کی حفاظت کیجیو۔"

لیکن مسلمان ایسے نازک دور میں بھی غیر اللہ پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔

فطرت انسانی کا تقاضہ ہے کہ جب تمام آسرے اٹھ جاتے ہیں اور انسان ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو خدا کی طرف سچے دل سے رجوع کرتا ہے، لیکن ہمارے زمانے کے مدعیانِ اسلام کی فطرت اس درجہ مسخ ہو چکی ہے کہ ایسے وقت میں بھی خدا کو نہیں پکارتے۔ بلکہ کہتے ہیں تو یہی کہ یا علی مشکل کشائی کیجیو، یا پیر دستگیری کیجیو۔ یا خواجہ

Marfat.com

غریب نواز مدد! یہ حال تو عوام کالانعام کا ہے جو پیروں فقیروں اور قبروں کے طلسم میں اسیر ہیں ۔ علماء (الا ماشاءاللہ) طواغیت کے کرشموں کے مقیدہیں. کسی کی رائے میں آج مسلمانوں کی مشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ وہ عقائد میں تو خدا کی غلامی اختیار کریں مگر اسلام کے اقتصادی نظام کو فرسودہ سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک کر کارل مارکس، لینن اور اسٹالن کے مجوّزہ اقتصادی نظام کی زنجیر اپنے پاؤں میں ڈال لیں۔

بعض ارباب بصیرت کی رائے میں اسلام کی سربلندی اس میں ہے کہ وہ فرسودہ اسلامی رسوم کو چھوڑ کر مغرب کی سیاست، مغرب کی معاشرت اور مغربی طرزِ حکومت کو اختیار کرلیں۔ بعض ارباب حل وعقد کے خیال میں کتاب وسنت کے نصوص میں بھی ترمیم وتنسیخ کر کے مسلمانوں کو موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے مذہب کو ڈھال لینا چاہیئے۔ ان سب کے لیے سورۂ فیل تازیانۂ عبرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح خانۂ کعبہ کو دشمنوں کے ہاتھوں سے بچالیا تھا۔ اسی طرح آج بھی وہ اسلام کو بغیر ظاہری اسباب کے دشمنوں کے نرغے سے بچالے گا۔ کیونکہ اللہ کے دشمن اس کی گرفت اور اسکے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن ہمیں ڈر ہے موجودہ زمانے کے ننگِ اسلام کا حشر بھی کہیں یہود کا سا نہ ہو جنھوں نے اپنے پیغمبر سے کہا تھا:۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْن

جاؤ، تم اور تمہارا پروردگار دشمنوں سے لڑو۔ ہم تو یہاں بیٹھے تماشا دیکھیں گے

سورۃ الفیل مسلمانوں کو یہ درسِ عبرت دے رہی کہ تمہارے ارتداد سے، تمہاری اسلام دشمنی سے اور خدا اور رسول سے تمہاری بغاوت اسلام کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر تم نہیں سنبھلو گے تو تمہارا شمار بھی خدانخواستہ خدا اور رسول قرآن اور اس کی تعلیمات کے دشمنوں میں نہ ہو جائے۔

افافہموا وتدبروا ولا تکونو کالذین قالو سمعنا وھم لا یسمعون

Marfat.com

آج بھی دنیا کی نجات طاقت اور دولت کی پرستش میں نہیں ہے۔ جس کے پیچھے مادہ پرست بیرو دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں۔ بلکہ خدائے محمد صلعم کی غلامی اور بندگی میں ہے اور اس راستے پر گامزن ہونے میں ہے جو محمد صلعم نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور سورۃ العصر کا مجرّب نسخہ تمام گم گشتگانِ بادیۂ خلافت کو دعوت دے رہا ہے کہ مجھے آزماؤ، میں تمھیں دین و دنیا کی فلاح و نجات کی طرف لے جاؤں گا۔ فھل من مدّکر۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

Marfat.com

سُورَةُ الْقُرَیْش

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ہ اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ہ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ ہ الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ ہ

چونکہ قریش کی تالیف کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں جاڑے اور گرمی کے لیے سفروں کا خوگر بنا دیا۔ تو ان کو چاہیئے کہ (اس کے شکریے میں) اس گھر (خانۂ کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک کی شدت) میں (بغیر بوئے جوتے) کھانا دیا اور (ار دگرد کی لوٹ کھسوٹ اور بدامنی کے) خوف سے ان کو امن میں رکھا۔

اکثر مفسّرین کرام نے اس سورت کو پچھلی سورت کا ضمیمہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ پچھلی سورۃ میں اصحاب فیل کے حملے سے کعبے کو بچانے کا ذکر ہے اور اس سورت میں قریش پر ان احسانات کا ذکر ہے جو انہیں اہل حرم اور بیت اللہ کے خدام ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے فرمائے۔ یہاں تک کہ بعض نے تو لایلف میں لام کو سببیہ قرار دیا ہے اور اسے اہلاک اصحاب فیل سے متعلق کیا ہے۔ یعنی اصحاب فیل کو اللہ تعالیٰ نے قریش کی تالیف قلب کے لیے ہلاک کیا۔ لیکن ہماری ناقص رائے میں یہ صحیح نہیں بلکہ ایلاف رحلتہ سے متعلق ہے۔ اور اس سورت میں اسی سبق کو جو پچھلی سُورت سے مترتب ہوتا ہے ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے جب خانۂ کعبہ کو آباد کیا تو اس کی خدمت کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو (حضرت اسحٰقؑ ان کے

Marfat.com

بعد پیدا ہوئے تھے) اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو ایک بے آب و گیاہ بنجر زمین میں آباد کیا تو خدا کی جناب میں عرض کی:-

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ
غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ
رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم
مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝
(ابراہیم ع ۶)

اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو ایسے میدان میں جہاں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تیرے حرمت والے گھر کے پاس (محض اس لیے) بسایا ہے کہ، اے پروردگار! نماز قائم کریں۔ پس تو بعض لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں سے روزی دے شاید کہ وہ شکر کریں۔"

کعبہ ایک چٹیل میدان میں تعمیر ہوا جہاں لق و دق صحرا کے سوا کچھ نہ تھا۔ پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ سبزہ اور کھیتی ناپید تھے۔ اس لیے جب بیت اللہ کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے اپنے لختِ جگر حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو اس بے آب و گیاہ زمین میں چھوڑا تو ان کی ضروریاتِ زندگی کا بھی صحیح معنوں میں اسی ربِ کعبہ کو کفیل بنایا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں جگہ جگہ اس دعا کا جو کمالِ توکل کی تصویر ہے، ذکر ہے۔

چنانچہ سورۃ البقرہ میں ہے:-

رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا
وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ
مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ۔ (البقرۃ ع ۱۵)

اے میرے پروردگار! اس شہر (مکہ) کو امن کا شہر بنا، اور اس شہر کے باشندوں میں سے جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائے ان کو پھلوں سے روزی دے۔

یعنی اس شہر کے رہنے والوں کی روزی اور اطمینان کے لیے غیب سے ایسے

سامان پیدا کر دے کہ یہ لوگ اطمینانِ قلب کے ساتھ تیری عبادت کر سکیں
اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیلؑ کی دعا کو جس طرح شرفِ قبولیت بخشا وہ دنیا کی تاریخ
میں اپنی نظیر آپ ہے ۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کی پیاس
بجھانے کے لیے وہیں ایک چشمہ جاری کر دیا جو "زمزم" کے نام سے مشہور ہے۔
اس کے بعد قبیلۂ جرہم کے کچھ لوگ وہاں پہنچے ۔ اس چٹیل میدان میں ایسا چشمہ
اور اس کے گرد سبزہ دیکھ کر انھوں نے وہیں آباد ہونے کی حضرت ہاجرہ سے
درخواست کی ۔ چنانچہ وہ وہیں پر آباد ہو گئے اور اس طرح شہر مکہ بھی آباد ہوا۔
حضرت اسمٰعیل نے اس قبیلے میں شادی کر لی ۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو شروع
سے ہی مرجعِ خلائق بنا دیا اور ہزاروں آدمی بیت اللہ کی زیارت کے لیے ہر سال
وہاں پہنچنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہر قسم کا غلہ اور اناج ہی اس بے آب و
گیاہ وادی میں پہنچنے لگا بلکہ ہر قسم کے پھلوں کی اس کثرت سے درآمد ہونے لگی کہ
مکہ مکرمہ میں ہر اعلیٰ قسم کا پھل ملنے لگا اور آج بھی جبکہ ہزاروں سال ہو چکے
ہیں، اسی دعا کا یہ اثر ہے کہ ہر سال لاکھوں حاجی وہاں جاتے ہیں اور انھیں ہر
قسم کے پھل بافراط میسر آتے ہیں ۔ اور گو کہ مکہ مکرمہ اب خاصہ بڑا شہر ہو گیا ہے
لیکن اس میں بسنے والوں کو اسی طرح روزی اور امن میسر ہیں ۔

حضرت ابراہیمؑ بھی شام سے تشریف لایا کرتے اور اپنی بیوی اور بیٹے کے
کام کی (جو اللہ کی طرف سے ان کے لیے مقرر ہو چکا تھا) نگرانی فرماتے ۔ وہیں انھوں
نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کی عمارت تعمیر کی اور خدا سے دعا کی کہ
اسے مرجعِ خلائق بنا اور پیغمبرِ آخر الزماں کو بھی اسمٰعیل کی اولاد میں سے مبعوث
فرما ۔ چنانچہ تولیتِ کعبہ کا شرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں متوارث ہو گیا۔
آنحضرت صلعم کی بارہویں پشت میں ایک شخص تھا، نضر بن کنانہ ۔ اس نے اپنی

اولاد کے لیے قریش کا معزز لقب اختیار کیا۔ اس کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:۔

نضر بن کنانہ بن خزیمہ، بن مدرکہ بن الیاس بن مضر......... نضر کے بعد اسمٰعیل تک قریش خانہ کعبہ کے متولی ہوئے اور حاجیوں کی خدمت، ان کے قیام و طعام کا بندوبست، عرب قبیلوں کے جھگڑے چکانے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے اور سفارت وغیرہ کے سب کام ان کے حصے میں آئے۔ تمام ملکِ عرب میں انکی سیادت مسلّم ہو گئی اور خدامِ کعبہ کی حیثیت وہ ہر حصے میں نہایت معزز و محترم خیال کیے جاتے۔ اِس لیے قریش تمام ملکِ عرب میں خاص طور پر مامون تھے۔ اور باوجودیکہ عرب میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ آمد و رفت کے تمام ذرائع نہایت مخدوش تھے۔

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

راستے سخت غیر محفوظ تھے قتل و غارت گری عام تھی۔ ڈاکہ زنی عربوں کا قومی شعار تھی۔ اور انسانی جان بے حد ارزاں ہو چکی تھی۔ بات بات پر قتل اور اس پر انتقام معمولی سا شرارہ تمام ملک کے خرمنِ امن کو جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔

درحصل اسلام سے پہلے ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کا برتاؤ صرف قبائلی اور نسلی یا وطنی عصبیت پر مبنی تھا۔ اس لیے اکثر قبائل غیر قبائل میں اور اکثر اقوام غیر ممالک میں تجارتی سفر امن سے نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن قریش کے تجارتی قافلے گرمیوں میں شام کی طرف اور سردیوں میں یمن کی طرف بلا روک ٹوک جاتے تھے۔ یمن چونکہ گرم ملک تھا اس لیے اس طرف سردیوں میں اور شام سرد ملک تھا اس لیے اس طرف گرمیوں میں جاتے۔ اور خدامِ حرم ہونے کی وجہ سے کوئی ان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ وہ جہاں جاتے عزت و احترام کی

Marfat.com

نظروں سے دیکھے جاتے۔ یہی نہیں بلکہ جو قبیلہ بھی ان کے ساتھ سفر کرتا وہ بھی ہر قسم کی لوٹ مار سے محفوظ رہتا اور فی الحقیقت اگر حکمتِ الٰہی لوگوں کے دلوں میں قریش کی توقیر و حرمت قائم کر کے ان کی روزی کا اس طرح سامان نہ کرتی تو وہ بھوکوں مرجاتے اور مکہ مکرمہ جیسا غیر آباد دشت و بیابان جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پہلے تھا۔ ویسا ہی ویران اور اجڑا ہوا دیار ہو جاتا۔

ابرہۃ الاشرم نے قریش کے اس احترام کو چھیننا چاہا تھا۔ لیکن اس کا جو حشر ہوا وہ سورۃ الفیل میں تفصیل سے بیان کر دیا گیا۔ اور اس واقعہ نے قریش کی عزت و حرمت میں چار چاند لگا دیے اور لوگ اسے خاص انعامِ خداوندی خیال کرتے تھے۔ ابرہہ تو انھیں روزی اور امن سے محروم کرنا چاہتا تھا، مگر اللہ تعالےٰ نے انھیں زیادہ محترم بنا کر ان کی روزی اور امن دونوں بڑھا دیئے۔

اِس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے دوسرے لاتعداد اور ان گنت احسانات کو اگر تم فراموش بھی کر دو تو بھی اس احسانِ عظیم کو کیونکر فراموش کر سکتے ہو کہ میں نے محض اس لیے کہ تم میرے گھر کے خادم ہو۔ لوگوں تمھارا احترام قائم کر کے تمھارے لیے عرب جیسے پُرخطر ملک کو، مامون بنا دیا۔ اور تمھارے سفروں کو تمھارے لیے روزی بہم پہنچانے کا ذریعہ بنا کر تمہارے قیام و بقا کا انتظام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمھارا یہ احترام کسی بُت کی خدمت یا غیر اللہ کی نظر کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اللہ کے گھر کی خدمت کی وجہ سے ہے۔ اگر شرک و بُت پرستی سے تمھیں رزق و امن حاصل ہے تو پھر دوسرے قبائل کیوں ان سے محروم ہیں؟

بیت اللہ الحرام کے خدام کو خوف اور بھوک سے مامون رکھنے کی اصلی وجہ خود بیت اللہ کی حفاظت تھی تاکہ دعائے خلیلؑ پوری ہو اور نبی آخرالزماں تشریف لا کر نعمتِ الٰہی کی تکمیل کریں۔

ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم
یتلوا علیھم اٰیٰتک ویعلمھم
الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم
(البقرہ ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! ان میں (یعنی اولاد
اسمٰعیل میں) ایک رسول انہی میں سے بھیجیو
تیری آیتیں انھیں پڑھ کر سنائے اور انہیں
کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے۔

اس لیے جب قریش کو محض خانۂ کعبہ کی خدمت کی وجہ سے ایسا امن اور رزق کی فراوانی میسّر ہوئی اور وہ تمام عرب کے سردار بنا دیے گیے پیغمبر آخرالزماں کی خدمت کے صلے میں جس کے لیے خانۂ کعبہ بنایا گیا تھا انھیں کتنی عزت ملے گی۔

اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے اس احسان کو اور بھی کئی جگہ وضاحت سے بیان فرمایا ہے

اَوَلَم نمکن لھم حرمًا
اٰمنًا یجبیٰ الیہ ثمرات کلّ
شیءٍ رزقًا من لّدنا ولٰکنّ
اکثرھم لا یعلمونْ
(القصص۔ ع ۲)

کیا ہم نے انہیں امن والے حرم میں
جگہ نہیں دی۔ اس کی طرف ہر قسم کے پھل
کھنچے چلے آتے ہیں جو ہماری طرف سے
(ان کی) روزی ہے لیکن (افسوس ہے)
ان میں سے اکثر نہیں جانتے (یعنی دوسرا

عرب کی دشمنی سے محض اس لیے مامون ہیں کہ وہ اللہ کے حرم کی پناہ میں ہیں۔ ورنہ اگر حرم کا ادب مانع نہ ہوتا تو عرب والے ان پر راہ عافیت تنگ کر دیتے اور کبھی کے برباد ہو چکے ہوتے"

یعنی دعائے خلیل کی برکت اور حرم محترم کی خدمت کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے ان کے شرک وکفر کے باوجود انھیں پناہ دی اور ان کی روزی کا سامان بہم پہنچایا تو کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ نبی آخرالزماں صلعم پر ایمان لے آنے اور ایمان وتقویٰ کے زیور سے آراستہ ہونے پر اللہ تعالیٰ ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ نہیں۔ اگر

ان میں ذرا سی بھی سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ ان انعامات کا تصور کر سکتے جو ایمان و تقویٰ کا لازمی نتیجہ ہیں

اولم یروا انا جعلنا حرمًا امنًا و یتخطف الناس من حولھم افبالباطل یومنون و بنعمت اللہ یکفرون ٥ (العنکبوت ع ۷)

کیا یہ کفار قریش نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان کے لیے حرم کو امن کی جگہ بنایا۔ حالانکہ لوگ ان کے آس پاس سے اچک لیے جاتے ہیں (یعنی سارے ملک عرب میں فساد کا دور دورہ تھا اور لوٹ مار، کشت و خون کا بازار گرم تھا) کیا پھر بھی (یہ اللہ کا احسان نہ مان کر) جھوٹ (یعنی بتوں) پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کے انعام کی ناشکری کرتے ہیں (یعنی محسن حقیقی کے احسان کو فراموش کر کے جھوٹے خداؤں کو اپنا محسن خیال کر کے ان کی عبادت کرتے ہیں)

حلّ لغات :-

لِئِلٰفِ قُرَیْشٍ ۔ اس کا تعلق فلیعبدوا کے حکم سے ہے (کشاف) یعنی قریش کو ایلاف الرحلتین کی وجہ سے عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ ابن جریر کے نزدیک لام لام تعجب ہے ۔یعنی اعجبوا الایلاف قریش ۔یعنی قریش کی ایلاف کس قدر حیرت انگیز ہے۔

ایلافھم رحلۃ الشتاء والصیف۔ یہ بدل ہے لایلف سے۔

ایلاف اور الف کے ایک ہی معنی ہیں۔عرب بولتے ہیں۔

الِفتُ الشئَ الفًا و اَلفتہٗ ایلافًا فی معنے واحد۔ چنانچہ ذوفتہ کا شعر ہے۔

مِنَ المؤلِّفَاتِ الرمل ادماء حرّۃٌ
شعاعُ الضُّحٰی فی لَونِھا یتوضّح

وہ میری معشوقہ ان میں سے ہے جو ریگستان سے مانوس ہیں (الفت رکھتی

ہیں) اور جوگت دم گوں اور راصین ہے۔ آفتاب کی کرنیں اس کے رنگ سے ظاہر ہوتی ہیں یعنی اس کا چہرہ آفتاب کی طرح درخشاں ہے۔

مطرد ابن کعب الخزاعی کا شعر ہے:

المنعمین اذا النجوم تغیرت

والظاعنین لرحلۃ الایلاف

ترجمہ: "سخت مصیبت کے زمانے میں جب ستارے بھی اپنا رخ بدل لیتے ہیں، میرے ممدوح بخشش کرتے ہیں اور وہ سفر ایلاف کے لیے سفر کرنے والے یعنی قریش ہیں۔"

ایلاف کے لفظی معنی لزوم کے ہیں۔ چونکہ انسان جس کام کو لزوم سے کرتا ہے اس کا خوگر اور اس کا مانوس ہو جاتا ہے۔ اس لیے الفت کے معنی میں کسی کا خوگر ہونا یا اس سے مانوس ہو جانا بھی داخل ہیں۔

اس لیے ان آیات کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔

(۱) قریش کی دلبستگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سردی اور گرمی کے دو سفروں کا خوگر بنا دیا یا انھیں دو سفروں سے مانوس کر دیا ہے۔ اس لیے اس کے شکریے میں رب کعبہ کی عبادت کریں۔

(۲) قریش خوگر ہو گئے۔ یعنی سردی اور گرمی کے دو سفروں کے، اس لیے اس کے شکریے میں رب کعبہ کی عبادت کریں۔

مآل دونوں معنوں کا ایک ہی ہے۔

قریش کی وجہ تسمیہ کے متعلق تین اقوال ہیں:

(۱) من التقرش و ھو التکسب: یعنی تجارت کرنا۔

چونکہ قریش ابا عن جد تجارت کرتے چلے آتے تھے اس لیے قریش کہلائے اوپر تفصیل سے مذکور ہو چکا ہے کہ مکہ میں کھیتی باڑی ہو ہی نہیں سکتی تھی

اس لیے قریش کی روزی کا حصول محض تجارت پر منحصر تھا۔ زراعت بطور پیشہ ان کے ہاں بہت ذلیل سمجھی جاتی تھی۔

(۲) اس کے معنی تجمع کے ہیں۔ جس کے معنی "متحد" ہونا ہیں۔ چونکہ قصی سے پہلے یہ منتشر تھے۔ اس نے انھیں مجتمع کیا اور قریش کے نام سے موسوم کیا۔ قصی ہاشم کا دادا تھا اور نضر (ض) بن کنانہ کی چھٹی پشت میں تھا۔ ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔

۳۔ ایک دریائی جانور کا نام ہے جو سب پر غالب رہتا ہے۔ چونکہ قریش بھی قبائل عرب کے سردار تھے اس لیے قریش کہلائے۔

فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوعٍ وامنھم من خوف ط

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ لایلاف قریش فلیعبدوا کی علت ہے۔ اور اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف اس کی دلیل۔ یعنی چونکہ اس نے تمہارے لیے دونوں سفر آسان کر دیے ہیں اس لیے اس نعمت الٰہی کے شکرانے میں وہ بھی اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں۔ جس کے طفیل یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اور بتوں اور مظاہر فطرت کی پرستش ترک کر دیں۔ دنیا کا مسلّمہ اصول ہے۔

ھل جزاء الاحسان الّا الاحسان (الرحمٰن ع ۱)

"احسان کا بدلہ تو صرف احسان ہی ہو سکتا ہے"۔

اس لیے اگر وہ پروردگار کعبہ کی عبادت نہیں کرینگے تو سخت ترین ناشکری کے مرتکب ہوں گے اور اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ان اوثان و اصنام کی پرستش عبث بھی ہے۔ اس کی دلیل الذی اطعمہم من جوعٍ و آمنہم من خوف ہے۔ یعنی جو پروردگار براہِ راست تمھاری جسمانی ضروریات کی کفالت فرما کر تمہاری ربوبیت کا انتظام کر سکتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ براہِ راست تمھاری دعائیں بھی سنے اور

تمہاری روحانی ربوبیت اور نشوونما کا بھی انتظام فرمائے۔

اس ربِ عظیم کے متعلق جو بے جوتے بوئے ان کے لیے ہر قسم کے اجناس اور میوے مہیا فرماتا اور قتل و غارت گری سے محفوظ رکھتا ہے یہ خیال کرنا کہ دعاؤں کے سننے کے لیے اسے واسطوں اور وسیلوں کی ضرورت ہے۔ اس کی سخت ترین قدر ناشناسی اور ناشکری ہے۔

دراصل یہاں سورۃ العصر کی حقیقت کو ایک اور پیرائے میں بیان کر کے اس پر جن اعتراضات کا جواب سورۃ الہمزہ اور سورۃ الفیل میں دیا گیا تھا اسی کا ایک اور لطیف جواب دیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر بھی سلسلۂ ربوبیت ہے یہ صرف رحمتِ الٰہی کا فیضان ہے۔ بے شک ایک حد تک اس میں انسان کی سعی و عمل کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن انسانی مساعی کو نتیجہ خیز بنانا رحمتِ الٰہی کی ہی کرشمہ سازی ہے۔ جب انسان کی تمام مادی خوش حالی اور فارغ البالی تمام تر رحمتِ الٰہی کے فیضان کا نتیجہ ہے تو ظاہر ہے کہ ہر نعمتِ الٰہی کا شکریہ بھی ازدیادِ نعمت کا باعث ہوگا۔ اور اس کا انکار کفرانِ نعمت اور زوال کا موجب بنے گا۔

لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید "اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو میں اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔ میں اپنی نعمتوں سے تم کو محروم کر کے عذاب میں مبتلا کر دوں گا۔"

گویا دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ انقلاباتِ زمانہ۔ ترقی و تمدن کے مختلف دور، انسانی ارتقا سب ایک بہت ہی مکمل اور عظیم الشان اسکیم کی مختلف کڑیاں ہیں اور ان کے پیچھے

Marfat.com

مادی اور روحانی اسباب دونوں یکساں طور پر کارفرما ہیں۔ ایک نبی کی دعا اور ایک نبی کی بعثت میں بھی ایسے زبردست اسباب ہوتے ہیں کہ قدرت کا ہاتھ قوموں کی قسمتوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی غلطی بھی یہ رہی ہے کہ اس نے ان روحانی اسباب کو نظر انداز کر کے اپنی توجہ کا مرکز صرف مادی اور محسوس اسباب کو بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف وہ اللہ کی رحمت کے فیضان سے محروم ہو گیا بلکہ کائنات کا ایک خراب شدہ عضو بن کر کاٹ دیئے جانے کا مستحق ہو گیا۔

انسان اپنے علم کے گھمنڈ میں اور اپنی تہذیب و تمدّن اور اپنی مادی ترقی کے پُر فریب ساز و سامان پر اترا کر شیطان کا آلۂ کار بن جاتا ہے اور اپنی تباہی و بربادی کے سامان خود پیدا کرتا ہے۔

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (القصص-ع ۶)

اور کتنی ہی بستیوں کو جو اپنے سامان معیشت (یعنی زندگی کے ساز و سامان کی کثرت اپنی مادی ترقی کی معراج) پر اترا چکی تھیں، ہم نے غارت کر دیا۔ اب ان کے گھروں میں کھنڈر موجود ہیں۔ جن میں سے بہت تھوڑے دوبارہ آباد ہو سکے۔"

جیسا کہ ہم سورۃ العصر کی تفسیر کے ضمن میں تفصیل سے لکھ آئے ہیں کہ انسان کی تمام مساعی کا منتہا و مدعا یہی رہا ہے کہ کسی طرح وہ ایسی اکسیر کا سراغ لگا لے جس کی مدد سے وہ مرضِ خسران سے محفوظ رہ سکے۔ تہذیب و تمدّن کے ہر دور میں انسان ہمیشہ اسی آبِ حیات کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہا ہے جس سے وہ یقینی موت سے اپنی تہذیب و تمدن کو بچا سکے۔ اسی کی جستجو میں اس نے غیر ملکوں کو تباہی کے گھاٹ اتارا تاکہ اپنے ملک کو تباہی سے بچا سکے۔ اس نے غیر قوموں کو

غلام بنانے کی کوشش کی تاکہ ان کے خون سے اپنی قوم کی کھیتی کی آبیاری کر سکے اور اپنی قوم کو لازوال ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے۔ اس نے غیروں کے امن پر ڈاکے ڈالے تاکہ کسی طرح اپنے امن کو محفوظ رکھ سکے لیکن افسوس کہ تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ اس کی ہر سعی کا انجام یہی ہوا کہ وہ خود ہی تباہ و برباد ہو گیا۔

پچھلی جنگِ عظیم میں بھی یہی ڈرامہ کھیلا گیا۔ اتحادیوں نے جرمن اور جاپان کے آئیڈیلز ([illegible]) کو بنی نوع انسان کی سلامتی کے لیے ایک عظیم خطرے سے تعبیر کر کے بھولی بھالی انسانیت کو مکر و فریب سے پُر اعلانات کے ذریعے اس دھوکے میں مبتلا کیا کہ اتحادیوں کے فتح ہی ([illegible]) طلسمان ہے جس سے انسانیت کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور بقول پریذیڈنٹ روزویلٹ انسان چاروں آزادیاں حاصل کر سکے گا یعنی آزادیٔ تحریر و تقریر۔ فاقے سے نجات، غیر ملکی تسلط سے نجات۔ لامحدود ترقی کے لیے آزادی اور جنگ سے ہمیشہ کے لیے نجات۔ لینن نے بھی انقلابِ روس کے متعلق یہی کہی تھی کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام بنی نوع انسان کو ([illegible]) امن، پیٹ بھر کر کھانا اور آزادی ([illegible] 5758) نصیب ہوگی۔

لیکن روسی انقلاب بھی کامیاب ہو گیا اور اتحادی بھی کامیاب ہو گئے مگر گوہرِ مقصود ابھی تک آنکھوں سے بدستور غائب ہے اور بنی نوع انسان اسی طرح بلکہ پہلے سے بھی زیادہ حیران و سرگرداں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے وہ سراب کو پانی سمجھ کر اس کے پیچھے دوڑتے رہے۔ اور آج بنی نوع انسان پر یہ افسوسناک حقیقت واضح ہو رہی ہے ان کی بیماری کی جڑ وہ ان کے رنگ اور

بڑھاتی ہے اور رنج والم کو راحت و مسرت میں تبدیل کرنے کی ہر کوشش انہیں اور زیادہ مبتلائے آلام کرتی ہے۔

آج مشرق و مغرب دونوں ایک ہی آگ میں جل کر بھسم ہو رہے ہیں۔ انسان نے بڑی بڑی سلطنتوں کو تہ و بالا کر ڈالا اور اس راہ میں مردانگی کے وہ وہ جوہر دکھلائے اور علم کی وہ وہ پروازیں کیں کہ خود اس کی عقل حیران رہ گئی۔ لیکن افسوس کہ وہ انسانیت کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے نہ بچا سکا۔ اس تباہی و بربادی کی تمام تر ذمہ داری انسان کے غلط تخیل اور باطل نظریوں پر ہے جنھیں خود فریب انسان نے خود اپنی نجات کے لیے بنایا اور انھیں حق سمجھ کر انکی تکمیل میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

ہر ہلاک اُمت پیشیں کہ بُود
زاں کہ بر جبندل گماں بردند عود

انسان نے باوجود علم کی روشنی کے ہر زہر کو تریاق اور ہر حنظل کو شہد تصور کیا۔ وہ بھوک میں روٹی اور مچھلی کے بجائے پتھر اور ہڈی کو چوڑتا رہا کہ شاید اسی سے اس کی شکم سیری ہو جائے۔ اس خود فریبی میں اس نے کہیں تو (material conception of History) تاریخ کا مادی نقطۂ نظر ایجاد کیا اور کہا کہ مذہبی اور اخلاقی اقدار بھی انسان کی مادی ضروریات و مقتضیات کا نتیجہ ہیں اور یہی سبق سورۃ القریش انسان کو دنیا چاہتی ہے کہ دنیا میں جس قدر معاشی سہولتیں انسان کو ملتی ہیں اور سامانِ معیشت کی فراوانی سب ایک روحانی نظام کے تحت میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہیں۔ اگر وہ آسائش کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر خدا کو بھول جائے تو اس کی آسائش مصیبت سے بدل جاتی ہے اور خود اس کا دنیوی ساز و سامان ہی اس کے لیے ہر درد کا دروازہ کھولتا اور نت نئی

Marfat.com

مصیبت کا دروازہ کھولتا ہے۔

چنانچہ یہاں پہلے یہ بتلا دیا گیا تھا کہ قریش پر یہ احسانِ عظیم صرف حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا کا نتیجہ تھا۔ تاکہ خدا کے آخری نبی کا قبیلہ محفوظ رہے اور حق وصداقت کی آخری اور کامل ترین آواز اس درسگاہ سے بلند ہو۔ لیکن اگر وہ خدا کے انعام کو بھول جائیں گے تو انکی راحت و مسرت، رنج و غم سے بدل جائے گی۔

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً قَرْیَۃً کَانَتْ مُطْمَئِنَّۃً یَّاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ

اور اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان فرمائی ہے جس کی بسر اوقات نہایت امن اور چین سے ہو رہی تھی اسے ہر طرف سے روزی بفراغت پہنچتی رہتی تھی۔ (از خود چلی آتی تھی)۔ پھر اس نے اللہ کے احسانوں کی ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی بدکرداری کی وجہ سے بھوک اور خوف یعنی قحط اور جنگ اور بدامنی کو ان پر مسلط کر دیا۔"

یہ مثال جیسی اہلِ مکہ اور قریش پر صادق آتی ہے ویسی ہی اب موجودہ متمدن دنیا پر صادق آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موجودہ متمدن انسان کو معاشی انعامات سے اس قدر نوازا کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں مادی ساز و سامان کی وہ کثرت ہوئی کہ انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ لیکن نیا دنیا کا متمدن انسان اپنے منعمِ حقیقی کو بھول کر اپنی تمام ترقی کو اپنے زورِ بازو، علم اور سائنس پر محمول کرنے لگا اور اس اتراہٹ اور فخر و پندار میں اپنے حقیقی مقصد کو بھول کر اپنے اللہ تعالیٰ سے باغی ہو گیا اور لگا رہا اٹھا کہ سائنس کی شعاعوں نے انسانی دماغ کی تمام تاریکیوں کو منور کر دیا ہے۔ اور اب اسے خدا کی مشعل کی روشنی کی ضرورت نہیں۔ وحی والہام کا استہزا فیشن میں داخل ہو گیا۔ اخلاقی اور روحانی اقدار سے انکار روشنی طبع کی کسوٹی قرار پا گیا۔ یہاں تک کہ سائنس دان

دعوے کرنے لگے کہ حیاتِ انسانی کی تخلیق کیمیائی معمل (Chemical laboratories) ہو سکے گی اور انسان کی موت اگلے وقتوں کی کہانیوں کی طرح خود اپنی طبعی موت مر جائے گی۔

مگر افسوس کہ بہت جلد خدا تعالیٰ نے انھیں ان کی ناشکری اور کفرانِ نعمت کی سزا میں پکڑ لیا اور ان کا امن وچین، طمانیتِ قلب، راحت وسکون، سب ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے۔ قحط اور تجارتی کساد بازاری نے انہیں ایسا گھیرا کہ دنیا نے یہ المناک نظارہ بھی دیکھا کہ ایک طرف تو سامانِ رزق کی یہ فراوانی کہ اناج انجنوں اور بائلروں میں جلایا جا رہا ہے اور دوسری طرف لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا بھوک سے جاں بحق ہو رہے تھے۔ اور ان کے دلوں میں ایک ایسا روگ پیدا ہو گیا کہ بھائی کو بھائی بھیڑیے کی طرح چیر پھاڑ کر کھانے لگا انسانیت دفن ہو گئی۔ ہمدردی اور رحم ومحبت کی داستانیں تقویمِ پارینہ ہو گئیں لیکن اس پر بھی غفلت شعار انسان کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ اب بھی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کا ناخنِ تدبیر اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی تمنائے خام ہے ؎

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

زمانۂ حاضر کی بے بصری یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بجائے اس کے کہ وہ یہ سوچیں کہ:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ	خشکی اور تری میں لوگوں کی بدکرداری کے باعث خرابی پھیل گئی ہے۔ تاکہ وہ غفلت شعار انسان اپنے کردار کے نتیجہ کا مزہ چکھے

Marfat.com

يَرْجِعُوْنَ ۝ | اور ممکن ہے کہ اس کا ضمیر بیدار ہو اور

وہ راہِ راست کی طرف لوٹ آئے۔"

نہیں۔ وہ آزادی، حریت، روشن خیالی کے بلند بانگ دعاوی میں ابھی تک گم ہے اور اخلاق فاضلہ سے اور سچی روحانیت سے اور زیادہ دور ہوتا جا رہا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

اور یقیناً ان کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا۔ تو انھوں نے اسے جھٹلایا۔ اس پر وہ عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اور وہ خدا کے قانون کو توڑنے والے ظالم تھے۔"

اس لیے سورۃ القریش نہ صرف کفار قریش کو یہ سبق یاد دلاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کما حقہٗ شکریہ ادا کریں اور اللہ کی بندگی کو اپنا معمولِ زندگی بنائیں۔ بلکہ موجودہ دور کے سرمایہ اور دہریہ انسان کو بھی اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ کہ اسے اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور خدا کی بندگی کا طوق اپنے گلے میں ڈال کر اپنے مقصدِ تخلیق کی تکمیل کرنی چاہیئے اور اسی طرح اپنے موجودہ دور کو ختم کر کے انسانیت کو حقیقی بہشت کی طرف لے جانا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح اللہ کے یہ وعدے قریش کے حق میں پورے ہوئے۔ اسی طرح آج بھی بنی نوع انسان کے حق میں پورے ہوں گے۔ بشرطیکہ وہ خدا کے رسول کی اطاعت کا عہد کر کے اس کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن ہوں۔ قریش پر جب ابرہۃ الاشرم کا حملہ ہوا تو گو وہ ناکام ہوا لیکن قریش کے حواس ختم ہو گئے تھے اور عام الفیل میں قریش سخت قحط کا شکار ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ مردار کھانے اور ہڈیاں چچوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے تو آنحضرت صلعم کی ولادت باسعادت کے یُمن و برکت کی وجہ سے سوڈانی غلہ وغیرہ اجناس وغیرہ دے کر بہت پہنچ گئے اور قحط دور ہو گیا۔ اس لیے ابو طالب نے نعت سرور عالم صلعم

کی مدح کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار کہے:۔

وَ اَبْیَض یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ
ثِمَالُ الْیَتَامٰی عِصْمَةٌ لِلْاَرَامِلِ

"وہ ایسے روشن چہرے والا ہے کہ اس کے چہرے کی وجہ سے گھٹائیں برستی ہیں۔ ورنہ اے قریش تمہارے اعمال تو اس قابل نہ تھے وہ یتیموں کا پشت پناہ اور بیواؤں کی عصمت کا محافظ ہے"

یَلُوْذُ بِهِ الْهُلَّاكُ مِنْ اٰلِ هَاشِمٍ
فَهُمْ عِنْدَهٗ فِیْ رَحْمَةٍ وَّ فَوَاضِلِ

"آل ہاشم کے تمام پناہ لینے والے اس کے ہاں پناہ لیتے ہیں۔ پس اس کے پاس آتے ہی طرح طرح کے انعامات اور بخششوں سے سرفراز ہو کر اخلاق بہیمی کی جگہ اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہو کر انسانِ کامل بن جاتے ہیں"

پھر ایک دفعہ آپ صلعم کی نبوت کے زمانے میں مکہ میں ایسا قحط پڑا کہ قریش مُردار کھانے پر مجبور ہو گئے تو سب رؤسائے قریش آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ "محمدؐ تم صلۂ رحمی کی تعلیم دیتے ہو۔ اب اس کا وقت ہے۔ تم ہمارے لیے دُعا کرو" سورۂ دخان میں اسی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ آپ صلعم کی دعا سے وہ قحط دور ہُوا۔ حضرت حسان بن ثابت رض قریش کو مُردار کھانے کا طعنہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

جَاءَتْ سَخِیْنَةُ کَیْ تُغَالِبَ رَبَّهَا
فَلَیُغْلَبَنَّ مُغَالِبُ الْغَلَّابِ

"مُردار کھانے والے قریش مسلمانوں پر یورش کرکے گویا غالب آنے والے اللہ پر چڑھ آئے ہیں۔ ہاں یہ یقیناً اللہ پر جو سب پر غالب آنے والوں پر غالب ہے۔ ضرور

Marfat.com

غالب آئیں گے"؟ یہ استہزاء اور طنز ہے۔

قصہ مختصر، دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ صرف مادی اسباب یا مادی مقتضیات کا رہین منت نہیں بلکہ مادی اسباب اور مادی داعیوں سے کہیں زیادہ قوی محرکات۔ روحانی اسباب اور داعیے ہوتے ہیں جنھیں نظر انداز کر کے خود فراموش انسان باوجود علمی اور ذہنی ترقیوں اور معیشت کے ساز و سامان کی کثرت اور بے پناہ مادی قوت کے اپنے تئیں ہلاک کرتا ہے بلکہ تمام نوع انسان کو خودکشی اور بربادی کی طرف دھکیل کرے جاتا ہے۔

روحانی اسباب کی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے ذرا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا پر غور کیجئے جس کا ذکر ہم سورۃ کی شروع میں تفصیل سے کر آئے ہیں۔ اس دعا کے دو حصے ہیں۔

اول:۔ جسمانی غذا کی فراوانی

دوئم:۔ روحانی غذا کی تکمیل میں بعثت خاتم النبیین

قریش اس امر کا زندہ ثبوت موجود تھے کہ اس دعا کا پہلا حصہ لفظاً قبول ہوا اور کیونکر شدید ترین قحط میں خود خدا ان تک پہنچ گئی۔ چنانچہ جوع اور خوف کی تنکیران کی عظمت کے لیے ہے یعنی سخت ترین بھوک اور شدید ترین خوف۔ گویا سخت ترین بھوک میں خدا نے خود ان کی غذا کے سامان بہم پہنچائے اور شدید ترین خوف یعنی ابرہۃ الاشرم کے حملے سے بھی خود خدا تعالٰی نے انھیں محفوظ رکھا۔

پس کیا ممکن ہو سکتا ہے کہ دعا کا دوسرا حصہ پورا نہ ہوا اور حضرت ختم المرسلین صلعم مبعوث نہ ہو۔ اس لیے اب اس کی تکمیل ہو رہی ہے اور وہ خاتم النبیین صلعم

Marfat.com

اللہ کا آخری پیغام ہے کہ تمہارے پاس آگیا ہے تو تم اس کا انکار کر کے اللہ کی ناشکری نہ کرو۔

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف ہ فلیعبدوا کی دلیل ہے۔ یعنی جو رب العالمین تمہیں کھانا کھلاتا اور خطرے سے محفوظ رکھتا ہے وہی عبادت کا مستحق بھی ہے۔ تم نے جو واسطے اور وسیلے بنا رکھے ہیں۔ اور بات بات میں ان کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہو۔ وہ بالکل بے کار ہیں اور ہر گز ہر گز عبادت کے مستحق نہیں۔ تمہارا ان کی طرف رجوع خدا کی ربوبیت سے انکار کے مترادف ہے۔ ہم یہاں عبادت کی حقیقت پر مفصل بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ اس کی تشریح انشاءاللہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں آئے گی یہاں مطلب کی وضاحت کے لیے صرف چند اہم امور کی طرف اشارہ کافی ہے۔

عبادت دراصل اس ذہنی اور قلبی کیفیت کا نام ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے تعلق کے اظہار کے لیے اس کے بندوں پر طاری ہوتی ہے اور کامل انقیاد اور اطاعت کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کا خارجی اظہار مختلف جسمانی حرکات سے ہوتا ہے۔ مثلاً دست بستہ قیام، قعود، رکوع و سجود وغیرہ۔ یہ جسمانی حرکات درحقیقت انسان کی قلبی کیفیات کی آئینہ دار ہوتی ہیں جو انسان پر بہ حیثیت اپنے مولا و خالق کا بندہ ہونے کے طاری ہونی چاہیئے۔ اس لیے دعا، خشیت و انابت، خشوع خضوع، نذر و نیاز، صدقات و قربانی اور اسی قسم کے تمام اعمال جو قلب صمیم سے صرف خدا کے لیے کیے جائیں سب داخلِ عبادت ہیں۔ گویا اللہ کی عبادت ایک فطری اور طبعی جذبہ ہے جس کے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی خالق حقیقی کی عبادت ہے۔ کما قال اللہ تعالے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ہ (الذاریات ۵۶) اور میں نے

Marfat.com

جن اور انسان کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔"

یہ حقیقت ہے اور چنداں محتاجِ تشریح نہیں۔ اگر ہم مخلوقات کے مقصدِ تخلیق پر غور کریں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ۔ ان میں سے ہر ایک انسان کی کسی نہ کسی ضرورت کو پورا کرنے میں مصروف ہے۔ یا بالفاظِ دیگر اگر وہ پیدا نہ ہوتی ہوتی تو حضرت انسان کی زندگی دشوار ہو جاتی۔ مثلاً سورج، ہوا، پانی۔ کہ انسان کی زندگی انہی پر منحصر ہے۔ علیٰ ہذالقیاس حیوانات، نباتات، جمادات بھی انسان کے کسی نہ کسی کام آتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ - ۲۹) — اللہ نے، جو کچھ زمین میں ہے، تمہارے فائدے کے لیے سب کا سب پیدا کیا۔"

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

لیکن حضرت انسان کا وجود دنیا سے ناپید ہو جائے تو کسی مخلوق کو ایک ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ بلکہ دنیا سے فتنہ و فساد، جور و ظلم نابود ہو جائیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ تمام اشیاء انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ انسان ان کی خدمت کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ اس لیے انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے علاوہ ہونا چاہیے۔ ورنہ انسان کی تخلیق عبث ٹھہرے گی۔ اس لیے لامحالہ اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے پیدا کرنے والے کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔ کیونکہ اگر ہم فرض کرلیں کہ انسان کی پیدائش عبث اور بے کار ہے تو اس سے ایک حکیم

علی الاطلاق پر بے ہودہ اور عبث کام کرنے کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرے خود انسان جو اشرف المخلوقات ہے اور جسے عقل وخرد اور قلب ونظر کے امتیازی اوصاف عطا ہوئے ہیں نکما ٹھہرتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں بداہتاً باطل ہیں۔ کیونکہ جب ہم اپنی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بغیر کسی مقصد کے نہیں ہوتا اور اس میں ہماری محدود عقل کی بساط کے موافق کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے تو ہمارا یہ خالق جس نے ہمیں یہ سمجھ بوجھ عطا کی ہے، کیونکر حکمت اور تدبیر سے اس قدر معرا ہو جانے گا کہ اشرف المخلوقات کو محض بے مقصد اور بے کار بنا دے۔

انسان کا اشرف المخلوقات ہونا بھی کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ کیونکہ جس طرح ایک خوبصورت انسان کا شرف بدصورت پر، عقلمند کا شرف بے وقوف پر۔ ذہین کا شرف غبی پر ظاہر ہے اور محتاجِ دلیل نہیں۔ اسی طرح انسان بوجہ علم اور اکتساب کمالات کے باقی تمام مخلوقات پر افضل واشرف ہے۔ اس لیے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، انسان ضرور کسی اعلیٰ مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ اپنے خالق کی عبادت یا اطاعت ہے۔ گویا جس طرح سورج کا کام روشنی اور حرارت پہنچانا۔ آنکھ کا کام دیکھنا۔ کان کا کام سننا، زبان کا کام بولنا ہے۔ اسی طرح انسان کا کام خدا کی عبادت ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس میں خود انسان ہی کی بھلائی ہے۔ اور جب بھی وہ اپنے اس مقصد سے انحراف کرے گا۔ خودکشی کا ارتکاب کریگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۝

"اے بنی نوع انسان اگر تم، اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کے سب اللہ سے انکار کر دو تو تم اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے۔ اپنا نقصان آپ کرو گے۔"

Marfat.com

اس لیے انسان صحیح کمال حاصل ہی نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے اس مقصد میں پوری کوشش نہ کرے۔ اس لیے غفلت شعار انسان کی توجہ بار بار اس حقیقت کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے کہ یقینی تباہی سے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنے اصلی مقصد کی طرف متوجہ ہو۔

اگر ایک انسان اعلیٰ درجے کے فرنیچر یا گھر کے سامان کو جلا کر کمرہ گرم کرے یا قمیص اور کوٹ جلا کر جائے کا پانی گرم کرنا شروع کر دے یا دودھ سے استنجا کرے تو اسے کون شخص عقل مند کہہ سکتا ہے لیکن افسوس کہ موجودہ زمانے کا تعلیم یافتہ اور متمدن انسان اپنی ساری زندگی کو اس مقصد سے ہٹا کر بالکل غلط مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اور ایک منٹ کے لیے بھی اسے اپنی حماقت پر افسوس نہیں ہوتا مغربی تہذیب اپنے مفکرین کی اسی غلطی کی وجہ سے جہنم میں گرفتار ہے اور مشرقی اقوام بھی مغرب کی اندھی تقلید میں انسانی شرف و عزیمت کو خیر باد کہہ کر سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ جس درجہ انسان کو اپنے حقیقی مقصد سے بعد ہوتا ہے اسی درجہ اس کی تباہی و بربادی بھی عبرت ناک ہوتی ہے۔

قصہ مختصر، دنیا میں انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد عبادت و اطاعت الٰہی ہے۔ اور انسان اپنی مادی ترقی کے زعم میں اس کو بھول جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت خود غرض بھیڑیا بن جاتا ہے۔ کفار قریش بھی اسی مقصد کو بھول چکے تھے۔ اس لیے اسی صورت میں انہیں تنبیہ کی جاتی ہے اور اس ضمن میں ہر ذاہل فراموش قوم کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ خدا کو بھول کر تم ہمیشہ سرگرداں و حیران ہی ہو گے اور تمہاری زندگی کی شب تاریک کبھی بھی صبح کی روشنی سے منور نہیں ہو سکے گی۔

لیکن یہاں کفار قریش کی خدا فراموشی پر غور کر لینا چاہیے تاکہ اس آئینے میں ہم اپنا عکس بھی دیکھ سکیں۔

قرآن حکیم کے مُطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

اوّل: قریش خدا کی وحدانیت کے قائل تھے۔ اور مانتے تھے کہ خدا ایک ہے اور تمام سلسلۂ کائنات کا وہی خالق ہے۔ موت وحیات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے:۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝

"اے پیغمبر! ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین سے کون تمھارا رزق پیدا کرتا ہے۔ سماعت و بینائی کس کے قبضۂ قدرت میں ہے؟ اور کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ اور کون اس تمام کارخانۂ عالم کو چلانے والا ہے* تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے "اللہ" پس ان سے پوچھو کہ اس اعتقاد کے بعد بھی تم تو بہ نہیں کرو گے۔ اللہ سے نہیں ڈرو گے اور اس کی حاکمیت کا اقرار نہیں کرو گے"۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ۔ (العنکبوت ع)

اور (اے پیغمبر) اگر تم ان (کفار قریش) سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے اپنا تابع فرمان بنایا ہے تو وہ کہیں گے اللہ نے"۔

دوئم: مصیبت میں جب اسباب کا آسرا اٹھ جاتا تھا تو نہایت اخلاص سے صرف اللہ سے دعا کرتے تھے۔

حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا

یہاں تک کہ جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں موافق ہوا چل رہی ہوتی ہے اور ان کے دل مسرّت سے لبریز ہوتے ہیں تو اچانک

Marfat.com

بِهَا جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَ
هُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوا
اَنَّهُمْ اُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ
مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا
مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ
(یونس ع ۳)

تیز و تند ہوا چلنے لگتی ہے اور موجیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ بس اب کوئی دم میں فنا ہوا چاہتے ہیں تو اس وقت اللہ سے نہایت خلوص سے اس کی بندگی کا اقرار کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ بارِ الٰہا! اگر تو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائے گا تو ہم تیرے شکرگزار بندے بن کر رہیں گے۔

گویا کفار قریش خدا کے سرے سے منکر نہ تھے اور وہ اس کی عبادت بھی کرتے تھے۔

پچھلی سورت میں ہم سیرت ابن ہشام سے نقل کر آئے ہیں کہ سردار عبدالمطلب نے کیسا خدا پرستانہ جواب ابرہہ کو دیا اور پھر مکہ چھوڑتے وقت بھی خانہ کعبہ کا پردہ تھام کر اللہ سے جو دعا مانگی تھی وہ اوپر والی آیت کی تفسیر ہے اور یہ امر بدیہی ہے کہ کفار قریش سردار عبدالمطلب کے عقیدے میں ان کے ہم خیال تھے۔ گویا کفار قریش خدا کی وحدانیت کے قائل تھے۔ اور اس کی عبادت بھی کرتے تھے لیکن پھر بھی خداتعالیٰ نے فَلْيَعْبُدُوا کہہ کر اس طرح خطاب فرمایا۔ گویا کہ وہ خدا کی بندگی و عبادت سے گریز کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ توحید ربوبیت یا توحید الوہیت کے لیے اللہ تعالیٰ کو خالق ارض و سما، رازق حقیقی، قادر مطلق اور معبود سمجھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ جب تک انسان کی ساری زندگی اس عقیدے کی عملی تصویر نہ بن جائے اس وقت تک وہ خالص موحد نہیں کہلا سکتا تھا۔

گویا ایک شخص جو مندرجہ بالا عقیدہ رکھتے ہوئے بھی خدا کے واسطے اور وسیلے بنا لیتا ہے، وہ درحقیقت توحید ربوبیت اور توحید الوہیت دونوں سے انکار کرتا ہے۔

Marfat.com

چنانچہ کفارِ قریش کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ "اور یہ لوگ اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں"۔

لیکن وہ ان شریکوں کو مقصود بالذات نہیں خیال کرتے تھے۔ صرف یہی کہتے تھے کہ:۔

مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی۔ ہم تو ان شرکاء کی عبادت صرف اسلیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں، کیونکہ اس کی بارگاہ عالی تک واسطوں اور وسیلوں کے بغیر پہنچنا مشکل ہے"۔

ھٰؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ "یہ اللہ کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں"۔

گویا محض اس لیے کفارِ عرب دوسروں کو اللہ کے ہاں سفارشی خیال کرتے تھے اور اللہ کو دنیاوی بادشاہوں پر قیاس کرکے اس کے لیے واسطے اور وسیلے تلاش کرتے تھے۔ اور اپنی زندگی کو براہِ راست اللہ کے تابع فرمان نہیں بناتے تھے۔ انھیں پروردگارِ عالم کی عبادت کا منکر قرار دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ صرف ربِ کعبہ کی عبادت کریں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت غیور ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنی طاعات میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنا حصہ بھی مسترد کر دیتا ہے۔ اوکما قال۔ یعنی اپنی نذر و نیاز میں یا عبادت میں غیر اللہ کو بھی شریک کر لیتا ہے تو اس کی تمام طاعت مردود ہو جاتی ہے۔

بنی نوعِ انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہی رہی ہے کہ اس نے اللہ کی حاکمیت میں دوسروں کو شریک کر رکھا ہے اور خدا کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے ان پر جو فرض دنیا میں خدا کی بادشاہت کے قیام کا عائد ہوتا تھا اسے اپنی بساط کے موافق پورا کرنے کی کوشش کرتے اور تمام بخشش و کرم کو اور ہر قسم کی مادی خوشحالی کو رب العالمین کی

Marfat.com

رحمت کا فیضان سمجھ کر اس کے قانون کو دنیا میں رائج کرتے۔ اس کے بجائے انھوں نے ہر ترقی کو اپنے علم اور زورِ بازو کا نتیجہ خیال کر کے یا تو سرے سے خدا کی حاکمیت کا انکار کر کے دنیا میں اپنا قانون نافذ و جاری کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی یا پھر خدا کی حاکمیت میں دوسروں کو شریک کر کے آدھا تیتر آدھا بٹیر نظام دنیا میں جاری کیا۔ عیسائی تہذیب نے تو سرے سے ہی خدا کا یہ حق چھین لیا کہ وہ ان کے نظامِ زندگی پر کارفرمائی کرے۔ مذہب کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی سیاسیاتِ حاضرہ میں اخلاق کا کوئی عمل دخل ہے۔ مغرب میں جو لوگ خدا کے قائل ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ وہ صرف اس کی روحانی سیادت کے قائل ہیں دعا اور نمازیں ہی اسے یاد کر لینا ہی ان کے خیال میں انسان کی موجودہ گم گشتگی کا علاج ہے۔ باقی رہا سیاسی امور میں، تجارتی تعلقات میں، بین الاقوامی معاملات میں، جنگ و صلح جیسے امور میں خدا کو خواہ مخواہ دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ مشرقی ممالک اپنے امام و پیشوا مغرب سے بھی اس معاملے میں زیادہ پست ذہنیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو تو اپنی حالت پر غور کرنا چاہیئے کہ ان کا توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت کا عقیدہ بھی محض لفظی ہے یا ان کے عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

عمل و عقیدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی تین جماعتیں ہو گئی ہیں۔

پہلی قسم کی وہ جماعت ہے جو سرے سے مذہب سے بے گانہ اور اس کی ضرورت کی منکر ہے۔ اس کے نزدیک مسلمان ایک سیاسی اصطلاح ہے جو مردم شماری کی خانہ پُری کرنے، کونسلوں اور اسمبلیوں اور میونسپل کمیٹیوں میں مخصوص نشستیں حاصل کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ نہ ان کا امتیازی وصف تو ان کی اپنی زندگیوں میں نمایاں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی ضرورت خیال کرتے ہیں۔

Marfat.com

[illegible]

[illegible] شرک سے بھی زیادہ [illegible]

[illegible] مصیبت [illegible] حالت میں تو خدا ہی [illegible]

[illegible] رکھتے تھے لیکن ہمارے سادہ لوح مسلمان اور ان کے

[illegible] وقت بھی خدا کو یاد نہیں کرتے بلکہ علی مشکل کشا کی دہائی دیتے

ہیں [illegible] دستگیر، خواجہ غریب نواز اور داتا گنج بخش وغیرہم کے پاس دوڑتے ہیں۔

Marfat.com

مومن است و پیشۂ او آذری است
دین و عرفانش سراپا کافری است

ایسے ایمان پر کفر و شرک کو بھی عار آتی ہے۔

بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖ إِيمَانُكُمْ — بہت ہی بُرا ہے جس کا تمہیں۔ تمہارا ایمان حکم
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۔ البقرہ۔ ع — دیتا ہے۔ اگر تم مومن ہو۔"

ہم نے مارشل لاء کے زمانے میں خود اس امر کا بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ جب کوئی ہندو گرفتار ہوتا تھا تو اس کی ماں بہنیں روتی ہوئی کہتی تھیں کہ: "جا تجھے پرمیشر کو سونپا۔ تجھے رام کو سپرد کیا، تجھے پرمیشور خیریت سے لائے"!

لیکن افسوس کہ جب ہمارا کوئی بھائی گرفتار ہوتا تھا تو اس کی بدبخت ماں بہنیں اس وقت بھی خدا کو یاد نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ یہ کہتی تھیں کہ "تمہیں گیارہویں والے دی رکھاں (یعنی گیارہویں والا تجھے ہر آفت سے محفوظ رکھے) پیر دستگیر تیری دستگیری کرے"۔ "تمھیں پانچوں پیروں دی رکھاں"۔ "علی مشکل کشا تیری مدد کرے اور خیریت سے لائے"۔ وغیرہ ذالک۔

اسی طرح ہم نے اکثر انگریزی تعلیم یافتوں کو دیکھا ہے جو دینی تعلیم سے کورے ہوتے ہیں مگر بدقسمتی سے جنہیں مذہبی رجحان سے حظ ملا ہے کہ جہاں ان کو کوئی مصیبت آن پڑی تو وہ جھٹ کسی مزار پر مراقبہ کرنے لگتے ہیں اور خواجہ نظام الدین یا حضرت باقی باللہ، یا داتا گنج بخشؒ یا بلھے شاہؒ کے مزاروں پر جا کر جبین نیاز خم کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں یہ اصحاب قبور خدا کے ہاں ہماری سفارش کرتے ہیں۔ اب اگر خدا ان کی حاجت براری کر دیتا ہے تو اسے اصحاب قبور کے روحانی فیض کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

مولانا حالی کیا خوب فرماتے ہیں ؎

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ ایمان بگڑے نہ اسلام جائے

کفارِ قریش بتوں کے سامنے سربسجود ہوتے۔ وہ بت بھی بزرگ لوگوں کے بت تھے۔ جب ان کی قبریں امتدادِ زمانہ سے مٹ گئیں تو لوگوں نے ان کے بُت بنا لیے۔ بت بھی اینٹ پتھر کے بنائے جاتے تھے اور قبر بھی اینٹ پتھر کی ہوتی ہے۔ اس لیے عقلاً اور شرعاً بتوں کے سامنے مراقبہ کرنے اور قبروں پر مراقبہ کرنے میں کیا فرق ہے۔ خدا کی حاکمیت سے کفار قریش بھی انکار کرتے تھے اور یہ مسلمان بھی۔ دونوں کے دونوں خدا کا حلقۂ عبودیت اپنی گردنوں سے اُتار چکے ہیں۔ اس لیے دونوں قعرِ مذلّت میں گر گئے۔ افسوس آج کل مذہبیت کا انحصار ہی ان باتوں پر ہو گیا ہے کہ پیر کے پاؤں چوم لیے۔ قبروں پر منتیں اور چڑھاوے چڑھا دیئے مزاروں کے عرسوں اور صندلوں میں ذوق و شوق سے شرکت کر لی۔ سید عبدالقادر جیلانی رح کی گیارہویں اور اماموں کی نیازیں دے دیں۔ شیخ سدّو کا مرغا اور میراں جی کا بکرا ذبح کر دیا اور محرم کے موقع پر علموں اور تعزیوں کے جلوس میں شرکت کر کے ان پر پھول چڑھا دیے اور ان کے سامنے لنگوروں کی سی حرکتیں کریں اور سمجھے کہ بس اب ہم پکے مومن ہو گئے اور جنّت کے وارث۔ ہماری میں

دکھ درد میں ۔ تجارتی خسارے کی صورت میں ۔ اولاد نہ ہونے کی حالت میں غرض ہر درد کے درماں کی تلاش میں ان کی دوڑ گونگے بتاں تک ہی ہوتی ہے ۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٦﴾	اور ان میں سے اکثر خدا پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ شرک بھی کرتے رہتے ہیں ۔

(یوسف ۔ ع ۱۲)

یعنی اکثر لوگ جو ایمان کا دعوے کرتے ہیں درحقیقت شرک میں گرفتار ہیں اور اللہ کی بخششوں کو پیروں، پیغمبروں، اماموں، فرشتوں اور جنات اور پریوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اپنے بیٹوں کے نام عبدالنبی، نبی بخش علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، پیراں دتا، غلام محی الدین وغیرہ رکھتے ہیں اور جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا کہ اللہ کی طرف سے ان میاں بیوی کو جو بیٹا عطا ہوا تھا اس میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں کہ یہ فلاں کی بخشش ہے ۔

اس لیے پیدا ہوتے ہی اسے کوئی پیر کی منتی، کسی کی بدھی اور کسی کا کرتا پہناتا ہے یا کسی کے نام کی چوٹی رکھ دیتا ہے ۔ وغیر ذالک ۔

غرض مسلمانوں کی تمام زندگی معدودے چند مستثنیات کو چھوڑ کر ساری کی ساری غیر اللہ کے لیے وقف ہو چکی ہے اور سورۃ القریش انہیں وہی سبق یاد دلاتی ہے جو ہم اسو سال پہلے دہرایا گیا تھا کہ، اللہ کی عبادت کی طرف لوٹو اور سورہ العصر کے نسخہ کو حرز جان بناؤ ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو دین و دنیا کی تمام نعمتوں کے مستوجب ٹھہرو گے ورنہ خدا کے دشمنوں کی طرح تم بھی ہلاک کر دیئے جاؤ گے ۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

Marfat.com

سُورَۃُ الْمَاعُوْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵
اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ
فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۵
وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ
فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۵ الَّذِیْنَ هُمْ
عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ ۵
الَّذِیْنَ هُمْ یُرَاءُوْنَ ۵ وَ
یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۵

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ (اے پیغمبر!) کیا تم نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یعنی عملاً اس کی تکذیب کرتا ہے سو وہی شخص یتیم کو دھتکارتا ہے اور (خود کھانا کھلانا تو درکنار لوگوں کو بھی) مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پس ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں کو بھلا دیتے ہیں۔ (یا ان سے غفلت برتتے ہیں) جو لوگ ریا کاری کرتے ہیں (یعنی نیک عمل لوگوں کے دکھاوے اور نمائش کی خاطر کرتے ہیں) اور چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی چیزوں کے دینے میں بھی بخل کرتے ہیں (چہ جائیکہ صدقات و زکوٰۃ دیں)“

ربط: پچھلی سورت سے ربط:۔

جب یہ مسئلہ حل ہوگیا کہ انسان کو خسران سے نہ اسبابِ معیشت کی فراوانی اور نہ ہی بھی طاقت ہی بچا سکتی ہے۔ بلکہ دنیا میں خود اسبابِ معیشت کی فراوانی خدا کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے کہ انسان اپنے منعمِ حقیقی کو یاد رکھتا ہے یا بھول جاتا ہے اور انسان خدا کو بھول کر ہمیشہ تباہی کے گڑھے میں گر جاتا ہے تو یہ امر اب خود بخود واضح ہوگیا کہ سورہ العصر میں جو نسخہ خسران سے نجات کا

بتلایا گیا تھا۔ وہ حکمی اور بے خطا ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، اور یہ سوال آج کل زبان زدِ خاص وعام ہے کہ خود وہ لوگ جو اپنے تئیں مسلمان کہتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کے پابند ہیں، کیوں ایک عرصے سے مرضِ خسران میں مبتلا ہیں بلکہ دن بہ دن ان کی حالت ابتر ہی ہوتی چلی جارہی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور اسی ضمن میں بہت سے اہم اور اصولی حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مرضِ خسران کے آثار اور علامتوں کی تشریح فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ انسان ایک غلط قدم اٹھا کر خود بخود نہایت آہستہ آہستہ خسران کی طرف کھنچنا شروع ہو جاتا ہے۔

اس جواب کی اہمیت کو کما حقہٗ ذہن نشین کرنے کے لیے اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جس کے متعلق سورہ العصر کی تفسیر میں ہم شرح وبسط سے بحث کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم نے قوموں کی موت وحیات کے جو اصول پیش کیے ہیں وہ ابدی اصول ہیں مسلم اور کافر جو بھی جس حد تک ان اصولوں پر عمل پیرا ہوگا اسی حد تک وہ کامیاب وکامران ہوگا۔ اور اسی حد تک مرضِ خسران سے محفوظ رہیگا۔ اسی لیے جو جماعت حقہ، ان چہارگانہ اوصاف سے جو سورہ العصر میں مذکور ہو چکے ہیں، کما حقہٗ متصف ہوگی۔ تو اس کی قوت بے پناہ ہو جائے گی۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اسے پامال یا مغلوب نہیں کر سکتی اور درحقیقت یہی وہ خصائص ہیں جنھیں مجبوراً بنی نوع انسان کو اختیار کرنی پڑیں گی۔ ورنہ اس کی تباہی یقینی ہے۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطون

یہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ انفرادی نیکی کو فی نفسہ

Marfat.com

بہت مستحسن امر ہے، لیکن جب تک کوئی جماعت من حیث الجماعت ان نیکیوں کا جن کا ذکر سورۂ العصر میں گزر چکا ہے۔ اپنا شعار نہ بنائے گی اس وقت تک وہ خسران کی دلدل سے نہیں نکل سکتی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس امر کی کیا پہچان ہے کہ فلاں جماعت من حیث الجماعت ان چاروں اوصاف میں سے سب پر یا بعض پر عمل پیرا ہے۔ اس کا جواب اس سورت میں دیا گیا ہے اور ایک کسوٹی قومی اعمال کو پرکھنے کی دی گئی ہے۔ جس سے ہمیں فوراً اندازہ ہو سکتا ہے کہ فلاں قوم کے قومی خصائص کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس کی قومی وحدت کا شیرازہ منتشر ہونے کو ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں اپنے ہی مقاصد کے لیے جانی اور مالی قربانی کرنے کی روح فنا ہو جاتی ہے اور وہ باوجود اپنے بعض افراد کی نیکیوں کے آج نہیں تو کل ڈوبے گی۔

حل لغات:

اَرَءَیْتَ یعنی اَرَءَیْتَ یا محمد والمعنی بل عرفت۔ اے محمدؐ! کیا تم اس شخص کے حال سے واقف ہو۔ یہاں رویت بمعنی معرفت اور بصیرت کے ہے۔ یعنی اس کی کیا شناخت ہے۔

الَّذِی یُکَذِّبُ بِالدِّیْن ۔ الدین ہو المعاد والجزاء والثواب۔ یعنی جو شخص جزا و سزائے اعمال کا منکر ہے، عذاب و ثواب کا قائل ہی نہیں۔

فَذٰلِکَ الَّذِی یَدُعُّ الْیَتِیْم ۔ فذالک میں فا یا تو مشروط مقدر کا جواب ہے۔ یعنی اگر تم غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ منکرِ جزا وہ شخص ہے جو یتیم کو دھتکارتا ہے۔ یا الذی یکذب پر عطف ہے۔

اَلَّذِی یَدُعُّ الْیَتِیْم ۔ اَلَّذِی یقھر یعنی جو یتیم پر قہر کرتا ہے اور اس کے حقوق

الیتیم و یظلمہ حقہ ولا یطعمہ — زور وظلم سے پامال کرتا ہے اور نہ تو اسے کھانا
ولا یحسن الیہ (ابن کثیر) — کھلاتا ہے اور نہ ہی اس پر کسی قسم کا احسان
روا رکھتا ہے۔"

دَعٌّ: جھڑکی سے دھتکارنا، اپنے سے پرے ہٹانا، نفرت وحقارت سے کسی کو جھڑک دینا۔ چنانچہ صاحب کشاف لکھتے ہیں:۔

ای یدفعہ دفعاً عنیفاً بجفوۃ واذیً ویردہ رداً قبیحاً بزجر وخشونۃ۔ یعنی کسی کو بُری طرح سے جھڑکنا۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ یوم یُدَعُّونَ اِلٰی نارِ جہنم دَعًّا۔ یہ دراصل اکرام کی ضد ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

کَلَّا بَل لَّا تُکْرِمُوْنَ الیتیم (الفجر) — ہرگز نہیں۔ نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں نہیں کرتے۔

لَا یَحُضُّ۔ ای لا یحث نفسہ ولا اہلہ ولا غیرہ تکذیبا للجزاء
یعنی نہ تو وہ اپنے تئیں نہ اپنے اہل وعیال کو نہ دوسروں کو ترغیب دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جزاء وسزا کی عملاً تکذیب کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:۔

وَلَا تَحَاضُّوْنَ علٰی طعام المسکین (الفجر) — اور تم مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے۔

یعنی اگر جزا وسزائے اعمال پر اسے یقین ہوتا۔ تو وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا تو ایسا نہ کرتا۔ جب اس نے ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ جزا وسزائے اعمال کا منکر سرے سے منکر ہے۔ گو زبان سے وہ کتنے ہی دعوے کرتا ہو کہ میں جزا وسزائے اعمال کا قائل ہوں۔

یہاں یحض فرمایا۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے:۔

الدال علی الخیر کفاعلہ — نیکی کی ترغیب دینے والے کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس کے

کرنے والے کو "

وقال صلعم اِشفعُوْ افلتوجروا ۔ نیکی کے لیے کسی کی سفارش کرو اور اللہ کے ہاں سے اجر پاؤ "

فَوَیلٌ للمصلّین ۔ ویل کی تشریح سورۃ الھمزہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ پس ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے "

اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلٰوتِھِمْ سَاھُون — جو لوگ اپنی نماز بھولے ہوئے ہیں ان سے سہو کئی طرح پر ہو سکتی ہے "

اوّل :۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ ان کی نماز محض دکھاوے کی ہوتی ہے۔ لوگوں کے سامنے تو خوب لمبی لمبی نمازیں پڑھتے ہیں اور تنہائی میں یا تو سرے سے پڑھتے ہی نہیں یا اگر پڑھتے ہیں تو روا روی اور جلدی جلدی ٹکریں مار رہے ہیں۔

دوئم :۔ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت گزر جاتا ہے یا گزرنے کے قریب ہو جاتا ہے تو اٹھ کر جلدی جلدی نماز پڑھ لی یعنی ہمیشہ بالکل آخری وقت میں نماز پڑھتے ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں مذکور ہے۔

اَنَّ رَسُوْلَ اللہ صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم	رسول صلعم نے فرمایا " یہ منافق کی نماز ہے
قَالَ تلک صلوٰۃ المنافق	یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے
تلک صلوٰۃ المنافق، تلک صلوٰۃ	بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے۔ جونہی
المنافق، یجلس یرقب الشمس	سورج غروب ہونے لگا۔ اٹھ کر جلدی
حتی اذا کان بین قرنی الشیطان	جلدی مرغوں کی طرح ٹھونگیں مار مار کر
قام منقرا ربعًا لا یذکر اللہ	چار رکعتیں پڑھ لیتا ہے۔ اللہ کو بہت ہی
فیھا اِلّا قلیلاً ہ	تھوڑا یاد کرتا ہے "

Marfat.com

یہاں صرف صلوٰۃ الوسطیٰ یعنی صلوٰۃ العصر کا ذکر فرمایا۔ ورنہ اس کا اطلاق تمام نمازوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً صبح کی نماز کے وقت ادھر سورج کی ٹکیہ نکلنی شروع ہوئی۔ ادھر اس نے نماز کی نیت باندھی اور جلدی جلدی مرغی کی طرح ٹھونگیں مار مار کر دو رکعتیں ختم کر لیں۔

سوئم: جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین نماز ادا کرتے تھے۔ اس طرح نماز ادا نہیں کرتے۔ یعنی نہ خشوع وخضوع نہ تعدیل ارکان نہ توجہ الی اللہ نہ یکسوئی۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کا اصلی مقصد حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

گویا مومن اور منافق کے درمیان نماز ایک حد فاصل ہے۔ مومن کی نماز صرف اللہ کے واسطے ہوتی ہے۔ وہ اسی طرح نماز ادا کرتا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین ادا کرتے تھے۔ اور وقت نماز ادا کرتا ہے۔ وہ نہایت خشوع وخضوع سے اللہ کے حضور میں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔

فاعبد وربک کانک تراہ فان — اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم
لم تکن تراہ فانہ یراک (حدیث) — دیکھ رہے ہو اور اس کے حضور میں کھڑے ہو
اگر ایسا نہیں تو اس طرح کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

کی تصویر ہوتا ہے۔ منافق کی نماز میں مندرجہ بالا تینوں صفات میں سے اول تو کوئی موجود ہوتی ہے اور جس کی نماز میں یہ تینوں صفات موجود ہیں اس کی نماز بالکل اکارت گئی۔ وہ ان لوگوں کے زمرے میں آتا ہے جن لوگوں کے بارے حدیث میں آتا ہے کہ:-

Marfat.com

کم من مصلی وصلوٰتہ یلعنہٗ　　　بہت سے نمازی ایسے ہوتے ہیں کہ انکی نماز ان پر لعنت کرتی ہے:-

بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ عن صلوٰتھم ساھون ارشاد فرمایا فی صلوٰتھم ساھون نہیں فرمایا کیونکہ صلوٰتھم ساہون کا مطلب جیسا کہ اوپر ہم بیان کر آئے ہیں۔ یہ ہے نماز سے غفلت برتنا اور اس کی طرف پوری توجہ نہ دینا اور اسے کماحقہ ادا نہ کرنا۔ اور یہ منافقین کے ساتھ مخصوص ہے۔

لیکن فی صلوٰتھم ساہُونَ کا مطلب یہ ہے کہ دورانِ نماز میں کبھی بھول جانا یا وسوسۂ شیطان کا دل میں آجانا اور اس سے مسلم خالی نہیں ہوسکتا۔ پہلا وصف صرف منافق کا ہے اور دوسرے سے مسلمان کبھی بری نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ خود حضرت سرورِ عالمؐ سے بھی نماز میں سہو ثابت ہے اور آپؐ نے سجدہ سہو ادا کیا۔ اس لیے حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ الحمد للہ علی ان لم یقل فی صلوٰتھم "خدا کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فی صلوٰتھم نہ فرمایا" اسی طرح ابن کثیر رحؒ نے حضرت عطا بن دینار کا قول نقل کیا ہے:-

الحمد للہ الذی قال عن صلوٰتھم ساھون ولم یقل فی صلوٰتھم ساھون ٥

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے عن صلوٰتھم ساہون فرمایا اور فی صلوٰتھم ساہون نہ فرمایا

ان دونوں اقوال میں اسی باریک فرق کی طرف اشارہ ہے۔

الذین ھم یراءون - یراؤن باب مفاعلہ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دکھانا اور اصل اسکا ریا ہے۔ کیونکہ ریاکار اپنا عمل لوگوں کو دکھانے

Marfat.com

کی خاطر کرتا ہے اور وہ اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے کام کی تعریف کرتے اور اظہارِ تعجب کرتے ہیں۔ یہاں اس امر کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ریا میں خالص نیّت کو دخل ہے۔ ورنہ انسان کے اکثر اعمال صالح لوگوں کے سامنے ہی کیے جاتے ہیں۔ مثلاً فرائض کی ادائیگی، نماز با جماعت۔ زکوٰۃ و صدقات کا بیت المال میں ادا کرنا۔ امانت میں خیانت نہ کرنا۔ پاسِ عہد وغیر ذالک

اس لیے حدیث شریف میں آیا ہے :-

وَلَا تُخْفِ فی فرائض الاسلام — اسلام کے فرائض کو چھپا کر مت ادا کرو۔

کیونکہ فرائض سے غفلت یا ان کی ادائی میں سستی اللہ تعالیٰ سے ناراضگی کا باعث ہے اور لوگوں میں بدنامی اور ذم کا موجب ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ "یا حضرت ایک شخص نہایت خشوع و خضوع سے نماز ادا کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں تو کیا وہ ریا میں داخل ہو گیا؟" آپ نے فرمایا کہ "نہیں، ایسی صورت میں تمہیں دو اجر ملیں گے۔ ایک تو اچھی طرح نماز ادا کرنے دوسرے، لوگوں کے لیے مثال قائم کرنے کا۔ اوکما قال۔

گو یا ریا کا اصل تعلق نیّت سے ہے۔ اگر ایک شخص لوگوں کو دکھلانے کے لیے نیکی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کوئی اجر نہیں۔ لیکن کوئی شخص اگر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے تو اس کی تعریف دنیا میں بھی ضرور ہوگی لیکن اس کے لیے اللہ کے ہاں پورا پورا اجر ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :-

ان تبدوا الصدقات فنعما ھی و	اگر تم علانیہ خیرات کرو تو وہ بھی اچھا ہے لیکن
ان تخفوھا و تؤتوھا الفقراء	اگر تم خفیہ طور پر حاجت مندوں کو دو تو وہ

فهو خیر لکم ۔ (البقرہ ع ۳۰) تمہارے لیے اور بھی بہتر ہے ۔"

ویمنعون الماعون ۔ ماعون کے معنی بعض اکابر نے توز کوٰۃ کے کئے ہیں اور بعض نے چھوٹی چھوٹی برتنے کی چیزیں مراد لی ہیں ۔

چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعود کا قول ہے کہ ماعون وہ ہے کہ جسے لوگ عاریتہً لے لیتے ہیں ۔ مثلاً ڈول ، ہنڈیا ، توا ، برتن وغیرہ ۔

چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی "تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ " اکثر مفسرین اسی طرف گئے ہیں کہ " ماعون " سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کے عاریتہً دینے میں عادتاً اعتراض نہیں کیا جاتا اور جس کے مانگنے میں فقیر اور امیر دونوں عار نہیں محسوس کرتے اور جن کے انکار سے انسان بد خلق اور بخیل طبیعت مشہور ہو جاتا ہے اور ان کی فہرست ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہے ۔ ہمارے دیہاتوں میں کلہاڑی ، لسبولا ، ہنڈیا ، ڈول ، چمچہ ، چھاج ، چھلنی وغیرہ ۔ شہروں میں آگ ، دیا سلائی ، استعمال کے برتن ، چمچے ، چارپائی وغیرہ ۔ اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہ رض سے منقول ہے کہ پانی ، نمک اور آگ بھی اسی فہرست میں داخل ہیں ۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے :

ثلثۃ لا یحل منعھا الماء والنار والملح تین چیزوں کا ، طلب کرنے پر نہ دینا روا نہیں ۔ پانی ، آگ اور نمک ۔

ایک اور روایت میں ہے :۔

ان یلتمس جارک ان یخبز تنورک او لیضع متاعہ عندک یوم او نصف یوم فلا تمنعہ ۔ اوکما قال اگر تمہارا ہمسایہ تمہارے تنور میں روٹی پکانی چاہیے یا تمہارے پاس ایک آدھ دن کے لیے سامان رکھنا چاہیے تو اسے مت منع کرو ۔"

استدلال :- اب اس سورت کے استدلال اور اس کے اہم نتائج پر غور کرنا چاہیئے:

قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ انسان کے اعمال اُس کے عقائد کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ایک انسان کے قول و فعل میں تضاد ہے اور اُس کے اعمال اسکے عقائد کا عکس اگر نہیں ہیں تو وہ یقیناً اپنے معتقدات میں جھوٹا ہے۔ محض زبان سے چند مقررہ الفاظ کا دُہرانا ایمان نہیں۔ اگر محض الفاظ کے دُہرانے سے ایمان متحقق ہو سکتا تو گراموفون ریکارڈ سب سے بڑے مومن ہوتے۔ قرآن حکیم نے ان دونوں حالتوں میں حد فاصل قائم کی ہے اور ایک کو مومن اور دوسرے کو منافق کا خطاب دیا ہے۔ منافق بھی دو قسم کے ہیں۔

ایک تو وہ ہیں جو محض دکھاوے کی خاطر ایمان لاتے ہیں اور اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر مسلمانوں کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے اور ان کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوئے۔ وہ تو سرے سے کافر ہوتے اور فی زمانہ ان کا تعین مشکل ہے۔

دوسری قسم کے منافق ہر زمانے میں کثرت سے رہے ہیں اور اب بھی بکثرت ہیں۔ وہ لوگ عملی منافق ہیں۔ یعنی وہ زبان سے تو اسلام اور قرآن کو مانتے ہیں۔ اور ظاہری رسوم و عبادات کے بھی پابند ہیں لیکن وہ اسلامی تعلیمات کی اصل روح سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ اسلام ان کے لیے چند بے جان رسموں اور تقلیدات رواجوں کا مجموعہ بن جاتا ہے اور وہ ظواہر کی پابندی بغیر کسی قلبی داعیہ کے محض رسماً کرتے ہیں۔ ایسے منافقین کا سب سے بڑا روگ اُن کے قول و عمل کا تضاد ہے۔ ۱

اس کے برعکس مومن کا قول اور عمل ایک ہوتا ہے۔ یہی اسلامی روح اسی میں

جاری رساری ہوتی ہیں۔ اس کا ہر عمل اس کے معتقدات کی تصویر ہوتا ہے۔ اس کی موت و حیات سب اللہ کے لیے ہو جاتی ہے۔

مومن و منافق میں کیا مابہ الامتیاز ہے؟ معاملات اور اخلاق۔ اسی لیے اس سورہ مبارکہ میں تمہید کے بطور اس حقیقت کبریٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ۔۔۔ روزِ جزا کا اصل منکر کون ہے؟ ۔۔۔ روزِ جزا کا اصل منکر وہ ہے زبان سے اقرار کرنے کے باوجود یتیم کو جھڑکتا اور دھتکارتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے سے پہلو تہی کرتا ہے اور نماز اور دیگر اعمالِ صالحہ میں ریاکاری برتتا ہے سہ

گوئیا باور نمی دارند روز داوری
ایں قدر قلب و دغل دکار داور می کنند

گویا یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ انسانیت اور ایمان کی کسوٹی اخلاقِ حسنہ ہیں۔ معتقدات و عبادات کا اصل مقصد انسان کو اخلاقِ حسنہ کے زیور سے آراستہ کرکے بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لیے تیار کرنا ہے۔ اس لیے اگر اس کے معتقدات اور عبادات سے اس کے اخلاق کی اصلاح نہیں ہوتی اور اس میں سچی پرہیزگاری پیدا نہیں ہوتی اور وہ خدمتِ خلق کے لیے اپنے تئیں وقف نہیں کر دیتا تو وہ یقیناً اپنے معتقدات میں جھوٹا اور اس کی عبادت منافقانہ ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ۔ (العنکبوت ع ۵) — نماز بے شک بے حیائی اور بری بات سے روکتی ہے۔"

یعنی نماز اگر بجمیع لوازم ادا کی جائے تو نمازی میں ایسی روحانی

Marfat.com

قوت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ خود بخود ہر قسم کی بری باتوں اور بے حیائیوں سے رک جاتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ۔ ایک دوا ایک مرض کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے لیکن اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ وہ دوا باقاعدہ جس طرح سے استعمال کرنا چاہیے اسی طرح استعمال کی جائے۔ اور پھر تمام مضر اور مرض بڑھانے والی چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔ اگر کوئی شخص نہ تو دوا باقاعدہ کھاتا ہے اور نہ پرہیز کرتا ہے تو اسے شفا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس لیے جب ہم دیکھیں گے کہ دوا کا اثر ٹھیک نہیں ہو رہا ہے تو معلوم کریں گے کہ یا تو دوا باقاعدہ استعمال نہیں ہوئی یا پرہیز میں کوتاہی ہوئی ہے۔ اسی طرح اگر نمازی سچے دل سے بارگاہ خداوندی میں اپنی اطاعت، فرماں برداری اور عبودیت کا اقرار کرتا ہے تو کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ مسجد سے باہر نکلتے ہی وہ دنیاوی معاملات میں بدعہدی، بے ایمانی، حلف دروغی اور وعدہ خلافی شروع کر دے۔ اس لیے اگر ایک نمازی مسجد سے نکلتے ہی ہر قسم کے گناہ اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو صاف ثابت ہوا کہ اس کا سجدہ محض ریائی سجدہ تھا۔ اس کی نماز اللہ کے لیے نہیں تھی بلکہ شیطان کے لیے تھی

کبھی قبلہ رُخ جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اسی طرح روزے کے بارے میں فرمایا:۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ)۔ "تاکہ تم پرہیزگار بنو۔"

قربانی کے بارے میں فرمایا کہ:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی

اللہ کو نہ ہی قربانی کا گوشت اور نہ ہی خون لیکن اسے پہنچتی ہے تو تمہاری پرہیزگاری

مِنْكُمْ (الحج ع ۵) اور خوف" یعنی "خلوص نیت سے تم نے وہ قربانی کی ہے۔ اللہ اسے دیکھتا ہے۔"

یعنی اگر تمہارے دلوں میں قربانی کی روح پیدا نہیں اور اللہ کے لیے تم اپنا تن من، دھن قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو جانوروں کا خون بہانا عبث ہے۔ وہ ہرگز مقبول نہیں ہوگا۔

بالجملہ اگر انسان کی نماز اور اس کا روزہ اور اس کی قربانی اسے حقیقی معنیٰ میں خداپرستی کا معیار کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان اخلاقِ فاضلہ سے متصف ہو کر سچا خادمِ خلق ہو جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:۔

خَيْرُ النَّاسِ مَن ينفع الناس "بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسرے انسانوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔"

گویا قرآن حکیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر انسان کو اپنے اعمال کے صدق و ریا کے پرکھنے اور ایمان و نفاق میں تمیز کرنے کی ایک بے خطا کسوٹی بتلادی اور وہ ہے خدمتِ خلق۔ خدمتِ خلق میں سے یہاں مثال کے طور پر تین اعمال کا ذکر فرمایا:۔

(۱) یتیم کی خدمت (۲) مسکین کو کھانا کھلانا اور (۳) ماعون کا دوسروں کو دینا۔ گویا اس کسوٹی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سچے مذہب کے قائل کے دل و دماغ پر کہاں تک اس کی حقیقی رُوح مُسلّط ہو چکی ہے۔

قرآن حکیم نے بھی سب سے پہلے اخلاقِ فاضلہ کی طرف توجہ دی اور انفرادی اور اجتماعی دونوں اخلاقوں کی اصلاح کو مذہب کا حقیقی مقصد قرار دیا چنانچہ آں حضرت صلعم فرماتے ہیں:۔

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق "میں اسلیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ اخلاقِ انسانی کی تکمیل کردوں۔"

Marfat.com

الخلق عيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الى عياله (بيهقى)

مخلوقات اللہ کا کنبہ ہیں۔ پس اللہ کا محبوب ترین بندہ وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بہترین سلوک کرے۔

من قضى لاحد من امتى حاجةً يريد ان يسره بها فقد سرنى ومن سرنى فقد سر الله ومن سر الله ادخله الجنة (بيهقى)

جس نے میرے کسی امتی کی حاجت پوری کی اور اس سے اس کی خواہش اسکو خوش کرنے کی ہو تو اس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا تو وہ اسے جنت میں داخل کر دے گا۔

عن ابى هريرة قال يا رسول الله (صلى الله عليه وسلم) انّ فلانة تذكر من كثرت صلاتها وصدقتها غيرَ انّها تؤذى جيرانها بلسانها قال هى فى النار قال يا رسول الله (صلعم) فانّ فلانةً تذكر قلة صيامها وصدقتها وصلوتها وانّها تصدّق بالاثوار من الاقط ولا تؤذى بلسانها قال هى فى الجنّة (رواه البيهقى)

حضرت ابو ہریرہ رض سے روایت ہے کہ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ فلاں عورت اپنی نماز روزے اور صدقات کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے۔ لیکن وہ اپنی بد زبانی سے اپنے ہمسایوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ دوزخی ہے۔ پھر کسی نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں عرض کیا کہ فلاں عورت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ نماز روزہ اور صدقات میں کمی کرتی ہے اور صرف فرائض ادا کرتی ہے اور وہ پنیر کے ٹکڑے کی ٹکیاں دیتی رہتی ہے اور اپنے ہمسایوں کو اپنی بد زبانی سے ایذا نہیں پہنچاتی۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔

عن ابى موسى الاشعرى. قال

صحیحین میں حضرت ابو موسی اشعری سے

Marfat.com

قَالَ رسول اللّٰہ صلعم علیٰ کلّ مسلمٍ صَدَقَۃٌ۔ قالوا وان لَمْ یجد قال فلیعمل بیدیہ فینفع نفسَہٗ وَ یتصدّق قالوا وان لم یستطع او لَمْ یفعل قال فیعین ذا الحاجَۃِ الملھوف قالوا وان لم یفعل قال فیأمُر بالخَیْرِ قالوا فان لم یفعل قال فیُمسِكُ عَنِ الشّرِ فَاِنّہٗ لَہٗ صَدَقَۃٌ۔ متفق علیہ۔

روایت ہے کہ جناب رسولِ خدا صلعم نے فرمایا کہ ہر مسلم پر صدقہ خیرات فرض ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اگر اس کے پاس صدقہ کے لیے کچھ نہ ہو (تو کیا کرے) آپؐ نے فرمایا کہ دونوں ہاتھوں سے محنت کر کے کچھ کما کر لاتے۔ اور اس میں سے اپنی ضرورت بھی پوری کرے اور صدقہ بھی دے صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر محنت کی استطاعت نہ ہو یا نہ کر سکے تو کیا کرے۔ رسول کریم نے فرمایا کہ سخت حاجت مند کی حاجت کرے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے تو کیا کرے آپؐ نے فرمایا کہ وہ نیکی کا حکم دے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر ایسا نہ بھی کر سکے تو؟ آپ نے فرمایا کہ وہ شر سے باز رہے۔ یعنی کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ وہی اس کے حق میں صدقہ ہو گا۔"

اب یہ امر محتاجِ ثبوت نہیں کہ اگر کوئی شخص جزا و سزائے اعمال پر پختہ یقین رکھتا ہے تو وہ آخروی فائدے کو فوری فائدے پر اور ملّی ضرورتوں کو ذاتی ضرورتوں پر ترجیح دے گا۔ معاصی کے ارتکاب سے مجتنب رہے اور محاسن کے اقدام میں وہ سبقت کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے اعمال خالصتہً للہ ہوں۔ پس اگر اس کا عمل اس کے برعکس ہے اور وہ معاصی کے ارتکاب پر دلیری دکھاتا اور نیکی سے احتراز کرتا ہے۔ اور اگر نیکی کرتا بھی ہے تو محض نام و نمود کی خاطر تو ایسا شخص یقیناً جزا و سزائے اعمال کا منکر ہے گو وہ زبان سے کتنے ہی بلند بانگ دعوے کیوں نہ کرے اور جب اس کا ایمان ہی راسخ نہیں بلکہ محض منافقانہ ہے تو اس سے ایمان کے ثمرات کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ کوئی شخص کانٹے بو کر گلاب نہیں کاٹ سکتا۔

گندم از گندم بروید، جو زِ جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو!

اب اس کے نفاق کو ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کے اعمال سے سورۃ العصر کے مطابق صحیح ثمرات کے قریب ہونے میں خود ہی قصوروار ہے چند عمل بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں۔

اول :- وہ یتیم کو دُھتکارتا ہے۔

اسلام نے یتیم پر سختی کرنے کو روک دیا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں جگہ جگہ ایسے احکام ہیں۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (والضحیٰ) یتیم کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس پر قہر یعنی غصے کا اظہار نہ کرو۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ، میں اور یتیم کا کفیل جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے اور آپؐ نے انگشت سبابہ اور درمیانی انگلی کو جوڑ کر دکھلایا۔ یہ فرمایا کہ، " دنیا میں بہترین گھر وہ ہے جہاں ایک یتیم بچہ ہو اور وہ خوش ہو اور بد ترین گھر وہ ہے جہاں یتیم بچہ ہو اور ناخوش ہو۔ او کما قال۔

قرآن حکیم میں یتیموں کو اپنے بچوں کی طرح پرورش کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس تاکید کے کئی وجوہ ہیں۔

اوّلاً :- یتیم بچے قوم کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں اور چونکہ مشیت ایزدی انھیں بعض مصالح کی بنا پر سایۂ پدری سے محروم کر دیتی ہے۔ اس لیے رحمت الٰہی اس امر کی متقاضی ہوتی کہ یتیموں کی پرورش بھی خود ہی کرے۔ اسی لیے مومن کے لیے جو دنیا والوں کے لیے رحمت الٰہی کا پیغام ہے۔ یتیموں کی پرورش کو بہترین نیکی قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی قومی اور انسانی خدمت ہے۔ یہ بچے

قسم کی خیرات ہے، کیونکہ یتیم بچے بالعموم ہمارے احسان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتے اور بہترین خیرات وہ ہے جو کسی معاوضے یا احسان کی نیت کے بغیر کی جائے۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر ۹)

ہم تو صرف تمھیں اللہ کی رضامندی کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں۔ تم سے کسی قسم کے معاوضے یا شکریے کے طالب نہیں۔

گویا یہ وہ نیکی ہے جس کے اجر کی توقع خالصتہً اللہ سے ہوتی ہے یعنی وہ شخص یتیموں کی اعانت صحیح معنوں میں کر سکتا ہے جسے یہ یقین ہو کہ مجھے ایک دن اللہ کے حضور میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جو شخص زبان سے تو روز جزا کا اقرار کرتا ہے مگر یتیم کو زجر و توبیخ کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ عملاً روز جزا کا منکر ہے۔ اس کا ایمان کسی طرح بھی مقبول نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ متوقع ثمرات لا سکتا ہے۔ اس سے آپ ان ان لوگوں کے حال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو یتیموں سے بھیک منگواتے یا انھیں حصولِ زر کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یا اگر گھروں میں رکھتے ہیں تو محض اس لیے کہ ایک بلا تنخواہ ملازم ہاتھ آیا اور اس پر طرح طرح کے ظلم روا رکھتے ہیں۔ کاش کہ مسلمان یتیم خانوں کے متولی اس مضمون پر غور کریں۔

دوئم:۔ اس کے بعد دوسری نیکی جو خالص بالخیر اللہ کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ اطعام المسکین ہے۔ چنانچہ اس کی بھی قرآن حکیم میں بار بار تاکید آئی ہے۔ کفار جب دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو وہ حسرت سے کہیں گے:۔

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (المدثر ۴۴)

اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلایا کرتے تھے۔"

مومنین کی تعریف میں فرمایا:-

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدہر ع)

اور وہ لوگ خدا کی محبت سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

مسکین اسے کہتے ہیں جس کے پاس اپنی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لیے کچھ نہ ہو یا ہو تو اتنا قلیل کہ اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو (ابن کثیر) ظاہر ہے کہ اس نیکی کا تعلق بھی خالصتہً عقیدۂ جزا و سزائے اعمال سے ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانا بھی دراصل بہترین قومی اور انسانی خدمت ہے۔

یہاں اس غلط فہمی کا رفع کرنا ضروری ہے۔ جو ہمارے یہاں عام ہے اور وہ یہ کہ عام بھیک منگوں کو اور گداگروں کو باسی یا بچے ہوئے ٹکڑے دیدینا خیرات ہے اور اطعام المسکین میں داخل ہے۔ اطعام المسکین تو درحقیقت گداگروں اور بھیک منگوں کی لعنت سے قوم کو پاک کرنے کا اور غریب کو امیر کے ہم پہلو بٹھلانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

اطعام المسکین کے معنی یہ ہیں کہ عزت سے کسی غریب کو اپنے پاس بٹھلا کر اپنے دسترخوان میں شریک کرنا۔ اور یہ قومی اُخوت پیدا کرنے کا بہترین طریق ہے۔ اس سے قوم کے مستطیع اصحاب میں وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو ان کے دل میں دردمندوں کے درد کا صحیح احساس پیدا کر دیتا ہے۔ اور قوم کے وسائل کی تقسیم پر انھیں اس طرح مجبور کر دیتا ہے کہ قوم میں کوئی حاجتمند باقی نہ رہنے پائے۔ لیکن یہ نیکی بھی خالص قومی نیکی ہے اور اس کی جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں اسے مشکل گھاٹی سے تعبیر کیا گیا۔ (سورۃ البلد) یہ قربانی اور ایثار بھی نالصتاً امید فردا کے بھروسے پر کیے جاتے ہیں لیکن جو شخص زبان سے تو روزِ جزا کا اقرار کرتا ہے اور عمل اس کا یہ ہے کہ مسکین کو خود کھانا کھلانا تو درکنار وہ اپنے اہل و عیال یا کسی

Marfat.com

دوسرے شخص کو بھی اس کی ترغیب نہیں دیتا تو وہ یقیناً عملاً روزِ جزا کی تکذیب کر رہا ہے۔ اس لیے کس قدر مقامِ تعجب و افسوس ہے کہ وہ شخص جو اپنے تئیں مسلم کہتا ہے، عملاً روزِ جزا کی تکذیب کرے اور صحیح نیکی کی روح سے اس قدر دور ہو جائے کہ یتیم کو دھتکارنے لگے اور مسکین کو کھانا کھلانے میں بخل کرے

ظاہر ہے کہ اس میں اب ایسے قومی خصائل پیدا ہو گئے ہیں جو اس قوم کو تباہی کی طرف لے جائیں گے۔ قومی کیریکٹر اور خصوصیات کے بارے میں دو مختلف نظریے ہیں ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) اور اس کے ہم خیال فلاسفہ کا خیال ہے کہ قومی خصوصیات اور کیریکٹر افراد کی خصوصیات اور کیریکٹر کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ لیکن موسیولینی (Mussolini) اور ان کے متبعین کا یہ خیال ہے کہ، ایسا نہیں ہے۔ قومی خصوصیات بذاتِ خود کسی قوم کی تعمیر میں نمایاں ہو جاتی ہیں اور ان کا تعلق افراد کے کیریکٹر سے نہیں ہوتا۔ گو انفرادی کیریکٹر اور سیرت کا اثر ان پر پڑتا ضرور ہے، ہمیں ان دونوں نظریوں کی صحت یا عدمِ صحت سے بحث نہیں لیکن ہم دونوں نظریوں میں سے جس نظریے کو بھی اپنے غور و فکر بنیاد قرار دیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ بعض قومی خصائص ایسے ہیں جن میں اضمحلال پیدا ہو جانے سے افراد کی ذاتی نیکیاں قوموں کو تنزل سے بچانے میں بے اثر ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح بعض انفرادی نیکیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم میں ترقی کی رُوح پیدا ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا دونوں نیکیوں کا تعلق اسی آخر الذکر کیٹیگری (category) سے ہے۔ کیونکہ یہ دونوں تبلیغِ حق کا بہترین ذریعہ ہیں۔ آج مشنری تبلیغ کا راز انہی دو باتوں پر منحصر ہے۔ اور ان کے مذہب کی اشاعت کا راز ان کے خدمتِ خلق کے جذبے میں مضمر ہے

یتیم خانے، بیوہ آشرم، ہسپتال، مدرسے اور کالج سب انہیں روحِ حسنات کے مظہر ہیں۔ اسی لیے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قوم میں صحیح اجتماعی نیکی کی روح کمزور ہو رہی ہے تو ہم فوراً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ قوم خسران کی طرف جا رہی ہے۔ اس کے برعکس جب کسی قوم میں تنزل کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں تو ان کے اجتماعی افعال و مشاعرہ میں بھی اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مذہبی اور قومی اعمال کی بجا آوری میں شوق اور انہماک اور جوش و خروش سے کام لینے کے بجائے بہت سست ہو جاتے ہیں۔ جو اعمال پہلے ان کے نزدیک ایک زندہ محرک اور ولولہ انگیز محرک کا کام دیتے تھے وہ اب محض رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔ انہی قومی اعمال میں سب سے اہم اور معیاری عمل نماز کا نظام ہے۔ گویا نماز اور قومی اعمال میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کسی قوم کا نماز کا نظام درست ہے اور وہ صحیح طور پر اور صحیح اوقات میں نماز ادا کرتے ہیں تو ان کے دوسرے قومی اعمال بھی صحیح اور درست رہتے ہیں اور اگر ان کا نماز کا نظام برباد ہو گیا اور ان کی نماز محض رسمی رہ گئی تو ان کا سارا قومی نظام مختل اور ان کی اجتماعی نیکیاں روح سے خالی ہیں

اسلام نے نماز کے قیام پر بے انتہا زور دیا ہے۔ اس کی اصلی وجہ یہ معلوم دیتی ہے کہ وہ اسلامی جماعت کے کیریکٹر کے لیے بمنزلہ امیٹر کا کام دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں ارشاد ہوتا ہے۔

الصلوٰۃ عماد الدین من اقامھا	نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے
فقد اقام الدین ومن ھدمھا	قائم کیا اس نے دین کو استوار کیا۔
فقد ھدم الدین۔	اور جس نے اس کو گرا دیا اس نے دین کو گرا دیا۔

بخاری کی حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت میں حساب کتاب کے

Marfat.com

وقت سب سے پہلے نماز کی پرسش ہوگی۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بُوَد
اَوّلیں پرسشِ نماز بُوَد

اِس لیے قرآن شریف میں اقام الصلوٰۃ کا ہی حکم آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو ایک نظام کے ماتحت ادا کرنا۔ باجماعت تعدیل ارکان اور خشوع وخضوع کے ساتھ اول وقت میں ادا کرنا۔ اس کے مطالب پر غور کرنے سے انسان میں سچی نیکی کی رُوح اور صحیح قوتِ عمل اور عزیمت پیدا ہوتی ہیں۔ گویا جہاں نماز ایک قوم کو زندہ کرتی ہے۔ وہاں قوم کے اعمال کی کسوٹی کا کام بھی دیتی ہے۔ جس قوم کی نماز محض بے جان رسم ہو کر رہ گئی ہو اور نام ونمود اور ریا کاری کے سِوا اس میں کچھ باقی نہ رہا ہو اُس قوم کے تمام اعمال وخصائص ایک ایک کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں یتیم کے ساتھ نیک سلوک اور مسکین کو کھانا کھلانے تک کا جذبہ بھی فنا ہوجاتا ہے اور وہ عملاً روزِ جزا کا منکر ہوجاتا ہے۔
اِسی لیے حدیث شریف نے مومن ومنافق کے مابین نماز کو ہی مابہ الامتیاز بتایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اثقل الصلوٰۃ علی المنافقین العشاء والفجر۔ رواہ البخاری
عشاء اور فجر کی نمازیں منافقوں پر بہت زیادہ بھاری ہوتی ہیں۔

اوپر ہم ایک مفصل حدیث نقل کر آئے ہیں کہ ہذا صلوٰۃ المنافق جس میں منافق کی نماز کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور ارشاد ہوا ہے کہ اس کی نماز مرغی کی ٹھونگوں کی طرح ہے اور لا یذکر اللہ فیہا الا قلیلاً۔ اسی لیے ایک اور حدیث میں منافق کی نماز کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:

لم یزد بھا من اللہ الا بعداً۔ "وہ انسان کو خدا سے اور زیادہ

دور کرتی ہے اور اسی کی نماز اس کے منہ پر ماری جاتی ہے۔

اب آپ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی نماز پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہمارے اسلام اور ایمان کا صحیح بیرومیٹر ہیں۔ اولاً تو نوے میں سے نوے جانتے ہی نہیں کہ نماز کیا ہے؟ آپ کسی مسجد میں چلے جایئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نہ صفیں سیدھی، نہ لوگ شانہ بشانہ کھڑے ہیں بلکہ تین تین، چار چار صفیں غیر مکمل۔ کوئی شخص حوض کے پاس ہی اکیلا کھڑا امام کی اقتدا کر رہا ہے۔ تو کوئی دروازے کے پاس کھڑا جماعت کے ساتھ اکیلا نماز ادا کر رہا ہے۔ حالاں کہ صحیح حدیث میں ہے کہ:-

سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف اقامۃ الصلوٰۃ — اپنی صفیں سیدھی کرو۔ کیونکہ صفوں کا سیدھا کرنا اقامت صلوٰۃ کا جز ہے۔

دراصل نماز مسلمان کی روحانی ڈرل ہے، جو انھیں دنیا کی سیادت کے لیے تیار کرتی ہے۔ اس لیے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا اس درجہ اہتمام تھا۔ آپ ملٹری ڈرل کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیوں نماز میں صفوں کو سیدھا کرنے، اکیلا کھڑا نہ ہونے اور شانہ سے شانہ جوڑنے اور ٹخنے کو ٹخنے سے ملانے کا حکم ہے۔ اسی طرح نماز میں وقت کی پابندی بھی اسی لیے ضروری قرار دی گئی کہ نماز اول وقت ادا کرو۔

رامپور میں میرے گھر کے پاس بڑی مسجد تھی جو اپنے حلقہ کی مسجد جامع تھی شروع شروع میں جب مسجد میں صبح کی اذان ہوتی تو میں وضو کر کے مسجد میں چلا جاتا۔ نہ وہاں کوئی نمازی نہ امام۔ آدھا آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد جب نماز کا وقت تنگ ہونے لگتا تو میں نماز پڑھ کر چلا آتا۔ کئی دن تک یہی ہوتا رہا۔ بالآخر ایک دن میں نے اذان کے شروع ہوتے ہی مسجد کا رخ کیا اور مؤذن کو جا پکڑا۔

Marfat.com

اس سے پوچھا کہ ، میاں معاملہ کیا ہے ؟ تم اذان کے بعد کہاں غائب ہو جاتے ہو ؟"
اس نے کہا کہ حضور ، نماز ایک گھنٹہ بعد ہوگی۔"

اب میں نے دیکھا کہ نماز کا وقت بالکل تنگ ہو گیا اور سورج کے نکلنے میں صرف چند منٹ رہ گئے تو امام صاحب تشریف لائے اور چند مقتدی جمع ہو گئے اور انھوں نے نہایت جلدی جلدی دو چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر نماز ختم کر دی۔ جب میں گھر پہنچا تو سورج کی ٹکیہ باہر نکل رہی تھی۔ اس وقت مجھے اوپر کی حدیث یاد آئی

"ھذا صلوٰۃ المنافق"

اور یہ کچھ رام پور ہی پر موقوف نہیں، آپ کو اپنے شہر میں اس کی بکثرت مثالیں مل سکتی ہیں۔ یہی حالت نماز عصر کی ہے کہ اسے نہایت تنگ وقت میں ادا کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس منافقانہ نماز کو حضرت امام ابو حنیفہ رح کی طرف منسوب کر کے ایسے عظیم المرتبت بزرگ کو بدنام کیا جاتا ہے۔ قیام نہایت مختصر۔ قرأت اتنی جلدی کہ شاید ہی کوئی سمجھ سکے کہ امام کیا پڑھ رہا ہے ؟ رکوع میں جاتے ہی سجدے میں گر پڑنا اور دونوں سجدوں کو ملا دینا موجودہ زمانے میں عام ہو چکا ہے۔ یہاں تک کوئی آہستہ سے نماز پڑھے تو اسے وہابی کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم تفسیر سورۃ الکوثر میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ انشاء اللہ) نماز دراصل ہماری اجتماعی زندگی کا مکمل نقشہ ہے۔ جس طرح ڈرل (پریڈ) فوج کو میدان جنگ کے لیے تیار کرتی ہے اسی طرح نماز مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کا طریق سکھلاتی ہے۔ اس لیے جب جماعتِ مسلمہ کی نماز فوت ہو گئی۔ تو یقین کیجئے کہ اس کی ہیئت اجتماعی فوت ہو گئی۔ وہ جماعت نہیں۔ ایک انبوہ ہے۔ آدمیوں کی ایک بھیڑ ہے یا جانوروں کا ایک گلہ جو ہر ہنکانے والے کے ساتھ ہو جائے گا۔ گویا جب ہر جماعتِ اسلامی کی نماز منافقانہ نماز ہو گئی تو وہ جماعت خسران

میں مبتلا ہو جائے گی اور اب وہ باطل کے سامنے سرنگوں ہو جائے گی۔ بشرطیکہ باطل کے پاس نظم اور قوت ہو۔

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہوگئیں

اور سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ یک فی صد شخص بھی مشکل یہ سمجھتا ہے کہ وہ نماز میں کیا پڑھ رہا ہے۔ جو کچھ طوطے کی طرح اس نے رٹ رکھا ہے جلدی جلدی پڑھ کر چل دیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ میں نے اللہ کی بندگی کا فریضہ ادا کر دیا۔ اکثر فقہا نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ جو آدمی کہ نماز کے معنی نہیں جانتا اور کم از کم اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔ سرے سے اس کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن یہ بات تو بداہۃً ثابت ہو جاتی ہے کہ ایسی نماز کا کوئی اثر پڑھنے والے کے دل و دماغ پر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کے خسران میں نماز کا قصور نہیں بلکہ خود نمازی کا ہے۔

نماز کے بے اثر رہنے کے بعد ایک اور موذی و مہلک مرض کا ذکر کیا ہے جو انسان کی نیکیوں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ اور جو اثرات نارمل حالات سے ان سے مترتب ہونے چاہئیں وہ مترتب نہیں ہو سکتے۔ وہ مرض ریا ہے۔ اور اس کا ذکر اس لیے آیا کہ ان کی نماز بے اثر و نتیجہ رہنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ نماز سرتاسر ریاکاری اور نمائش کی نماز تھی۔ گویا نماز جیسا ربانی عمل ریاکاری سے بالکل برباد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ریا۔ نیک عمل کو برباد اور بے نتیجہ بنا دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر تصریح کر آئے ہیں۔ ریا میں نمائش اور دکھلاوے کا مطلب غالب ہے۔ یعنی عمل سے اس کی نیت یہ ہو کہ وہ اپنے عمل کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرے اور لوگ اس کی تعریف کریں لیکن اس میں وہ دکھاوا شامل نہیں جو لوجہ اللہ ہو اور

Marfat.com

اس سے اس کا مقصد ترغیب ہو۔ ریا کا اصلی مقصد یہی ہے کہ اعمال خالصۃً لوجہ اللہ کرنے کے بجائے لوجہ الناس کیے جائیں اسی لیے قرآن حکیم میں ریا کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا — اور وہ اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا۔"
(الکہف ع ۱۲)

حدیث شریف میں اس کی تفسیر میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ ریا ہے۔ کیونکہ جس شخص نے بھی عبادت میں ریاکاری برتی اس نے وہ عبادت لوگوں کے لیے کی۔ گویا اس نے لوگوں کو ان عبادات میں خدا کا شریک کر لیا۔ عبادات سے اصل مقصود اللہ کی رضامندی کا حصول ہے۔ پس جب اس میں لوگوں کی تحسین و رضامندی بھی شامل ہو جائے تو اس نے لوگوں کو خدا کا شریک ٹھیرا لیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کو شرکِ جلی کے بعد ریاکاری سب سے زیادہ مبغوض ہے۔ اور حقیقت الامر بھی یہی ہے کہ ریا سے زیادہ کوئی چیز نیکی کے لیے بربادکن نہیں۔ چنانچہ کتبِ احادیث میں ایک طویل حدیث مروی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن تین آدمیوں کو دوزخ میں بھیجا جائے گا۔

(۱) پہلا کہے گا "خدایا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور سینکڑوں زخم کھا کر شہید ہوا"۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ "کیا تو اس لیے نہیں لڑا کہ لوگوں میں تیری بہادری کا چرچا ہو؟"

وہ عرض کرے گا کہ "ہاں"۔

حکم ہوگا کہ "لے جاؤ اسے دوزخ میں، اس نے اپنا اجر پا لیا۔ اب ہمارے یہاں اس کے لیے کوئی اجر نہیں"۔ اسی طرح عالم اور مخیر بھی ریا کی بدولت دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

تمام مذاہب نے ریاکاری کو مذموم قرار دیا ہے۔ لیکن جیسی تشریح اسلام نے اس کی کی ہے ویسی کسی مذہب نے نہیں کی۔ اسلام نے اعمال کی صحت و درستی کے لیے خلوص نیت کو ضروری قرار دیا۔ یہاں تک کوئی عمل جس کی بنیاد صحتِ نیت پر نہ ہو مقبول نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ حدیث متواتر ہے:۔

انما الاعمال بالنیات

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے:۔

ایک اور حدیث میں ہے

الرّیاءُ اخفیٰ مِن دَبیب النَّملَۃِ فِی اللَّیلَۃِ المُظلِمَۃِ۔ او کما قال

"اندھیری رات میں چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ نامعلوم طریق پر ریا انسان کے قلب پر مسلط ہو جاتا ہے۔"

اور آں حضرت صلعم نے فرمایا:۔

انّ اخوف ما اخاف علیکم الشرک الخفی قالو یا رسول اللہ وما الشرک الخفی قال الرّیا:۔

"مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ ڈر شرک خفی میں مبتلا ہو جانے کا ہے۔"

صحابہؓ نے عرض کیا کہ "شرک خفی کیا ہے؟"

آپؐ نے ارشاد فرمایا "وہ ریا ہے۔"

گویا جب کسی قوم کے اعمال کا اصلی محرک محض نام و نمود و نمائش ہو وہ قوم آج نہ ڈوبی تو کل ضرور ڈوبے گی۔ یعنی جب کسی قوم کے افراد میں یہ مرض عام ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم کی قومی رُوح فنا ہو رہی ہے۔ اور وہ قوم تباہی کے کنارے پر کھڑی ہے۔ اب اس کا اسلام محض رسمی ہے اور اس کے

Marfat.com

اعمالِ صالحہ محض نمائشی ہیں۔ اس لیے ان سے یہ توقع وابستہ کرنا کہ وہ نتائجِ متوقع پیدا کریں گے، عبث ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ریا صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے اللہ اور جزاء و سزائے اعمال کا سرے سے یقین نہ ہو۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔

کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یومن باللہ والیوم الاخر الایۃ (البقرۃ - ع ۳۶) اس شخص کی طرح اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو جو اپنا مال و دولت لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر ایمان نہیں رکھتا اور نہ ہی آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہے۔"

اب قوموں کی ریاکاری کی شناخت کے لیے ایک کسوٹی مقرر فرمائی۔ یعنی وہ قوم کے لیے ادنیٰ سی قربانی بھی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قومیں فنا نہیں ہوتیں وہ وہ ہمیشہ خودکشی کیا کرتی ہیں۔ جس قوم کے افراد میں ایثار، محبتِ جماعت، فدویت و قربانی کی روح فنا ہو گئی۔ وہ قوم ضرور ہلاک ہو کر رہے گی۔ اسی لیے یہاں فرمایا یمنعون الماعون۔ یعنی جماعتی مقاصد کے لیے کسی بڑی قربانی کا تو کیا مذکور ہے وہ اپنے کسی حاجت مند بھائی کے لیے حقیر سے حقیر چیز بھی خیرات کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ بخل کی انتہا یہ ہے کہ انسان اپنے ہمسایوں کو روزمرہ کے استعمال کی چیزیں جو غریب ہمسائے اپنے سے زیادہ خوشحال ہمسایوں سے عاریتہً لے لیتے ہیں، بھی نہ دیں۔ ایسے لوگوں سے زکوٰۃ اور صدقات کی باقاعدہ ادائیگی کی توقع ہی فضول ہے۔ ایسے لوگ اللہ کے ساتھ اخلاص اور اس کی مخلوق سے ہمدردی رکھ ہی نہیں سکتے۔ اس لیے ان کے دل میں قومی خدمت کا ولولہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان سے جانی و مالی قربانی کی امید رکھنا عبث ہے۔

درحقیقت یہ آیت حقوقِ ہمسایہ کی ادائیگی کا مُرقع پیش کرتی ہے۔ اگر ایک

Marfat.com

شخص حقوق ہمسایہ کما حقہٗ ادا کرتا ہے تو وہ اپنے محتاج ہمسایوں کو بلا تکلف، نمک آگ، پانی، کلہاڑی، بسولہ، دیگچی، توا، دیا سلائی، برتن وغیرہ عاریۃً دینے میں تامل نہیں کرے گا اور اس طرح سے درجہ بدرجہ وہ بڑی چیزوں کو اپنے ہمسایوں کی راحت و آسائش کے لیے قربان کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرے گا۔ اور اسلامی اخوت میں یہ دوسری کڑی ہے جسے ہم مختصراً بیان کریں گے۔

ہمسایوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔ یہاں تک کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص پیٹ بھر کر کھانا کھا کر سو جاتا ہے اور اس کا ہمسایہ بھوکا سوتا ہے تو ہم میں سے نہیں ہے۔ او کما قال۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن اسلام کی برادری کی یہ نہایت اہم کڑی ہے۔ پہلی کڑی تو اقرباء کے حقوق سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہمسائے اس میں آ داخل ہوتے ہیں۔ بعد ازاں ساری قوم یا اُمت اس رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ ایثار و قربانی کی تدریجی تعلیم ہے۔ جس قوم نے اسے بھلا دیا اس نے اسلام کے قربانی کے سبق اور دعوتِ جہاد کو بھلا دیا۔ گویا جس قوم کے افراد ویمنعون الماعون کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ قوم جہاد کے میدان میں ہمیشہ شکست کھا رہے گی۔ اس لیے اس کے "اعمال صالحہ" بالکل ریا اور نمائش کا نتیجہ ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ خسران کے عمل میں مبتلا ہو جائے گی۔

اب اس تمام استدلال کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن حکیم کا ارشاد درست ہے۔ مسلمان قومیں خسران کے دلدل میں اس وقت مبتلا ہو جاتی ہیں جب ان کے اعمال حقیقت سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ ان کی عبادات محض رسمی۔ ان کے صدقات محض نمائشی ان کی تمام نیکیاں محض رواجی اور ریاکاری کا نتیجہ۔ کوئی داعیہ یا جذبہ ان کے دلوں میں سوائے نام و نمود کے نہیں پایا جاتا۔ وہ تمام اعمال یا تو محض عادتاً بجا لاتے ہیں

یا بطور نمائش کے۔ جسدِ بے روح کبھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اعمال بغیر خلوص اور صحتِ نیّت کے بالکل بے نتیجہ اور عبث ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمان باوجود ایمان و عمل صالح کے تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ نہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ ایمان اور عملِ صالح کی حقیقی روح کو فنا کرنے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں یا بالفاظِ دیگر ان میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر معدوم ہو چکے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیئے کہ کونین اور چونے میں ظاہری مماثلت ہے۔ دونوں سفید ہوتے ہیں اور دونوں سفوف کی صورت میں بکتے ہیں۔ اب اگر کوئی احمق ملیریا میں بجائے کونین کھانے کے چونا کھانا شروع کر دے اور پھر اسے نقصان ہو تو وہ اس خرابی کا سارا الزام ڈاکٹروں پر اور کونین پر رکھے تو وہ خود فاترالعقل ہے۔

فان کنت لا تدری فتلك مصيبة	"اگر تو نہیں جانتا تو یہ ایک مصیبت ہے
وان کنتَ تدری فالمصیبة اعظم	لیکن اگر تو جانتا ہے اور تجاہلِ عارفانہ

برتتا ہے تو مصیبت بہت بڑی ہے۔"

مولانا حالیؒ نے مسدّس میں بندروں کی مثال دی ہے کہ انھیں رات کو سردی لگی تو انھیں آگ کی تلاش ہوئی اور وہ ایک جگنو کو آگ کا شرارہ سمجھ کر لے آئے اور اس کے اردگرد تنکے جمع کر کے تمام رات پھونکتے رہے۔ وہ گرم تو نہ ہوئے البتہ اکڑ ضرور گئے۔ یہی حال اس قوم کا ہے جن میں ریاکاری اور منافقت کے مہلک امراض پیدا ہو جاتے ہیں اور ان میں نیکیوں کی روح فنا ہو جاتی ہے اور صرف قشر ہی قشر باقی رہ جاتا ہے اس لیے اس کی نیکیاں کبھی مثمر ثمراتِ حسنہ نہیں ہو سکیں۔ مسلمانوں کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے اعمال کا محاسبہ لینا چاہیئے کہ کہیں وہ بھی چونے کو کونین اور جگنو کو آگ کا شرارہ تو نہیں سمجھ رہے۔ لیکن

افسوس ان کی گمراہی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنا محاسبہ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ ان کے نزدیک

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

بالجملہ یہ سورت ایک قومی بیرامیٹر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم تباہی کی طرف جارہی ہے یا اس کا قدم تباہی کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس سے یہ صاف نتیجہ نکلا کہ جس قوم میں بھی یہ خاصیتیں جن کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے پیدا ہو جائیں گی۔ تو اس کا ایمان اور اسلام اس کے کسی کام نہ آسکے گا اور وہ ان کفار کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکے گی جنھیں اپنے باطل عقیدے پر راسخ اعتقاد ہوگا اور اس کے لیے سچی قربانی کا ولولہ ان میں موجود ہوگا۔ مولانا روم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کفر گیرد کاملے ملت شود　　ہر چہ گیرد علّتی علت شود

وَاٰخِرُ دعوانا اَنِ الحمد للہ ربّ العالمین

Marfat.com

سُورَةُ الكَوثَر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

(اے محمدؐ) بے شک ہم نے تمہیں کوثر عطا فرمایا ہے۔ (پس اس کے شکریے میں) تمام معبودانِ باطل سے بے نیاز ہو کر اپنی نماز اور قربانی کو صرف اپنے پروردگارِ حقیقی کے لیے مخصوص کر دو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) یقیناً تمہارا دشمن ہی ابتر (دم کٹا) ہو جائے گا۔

پچھلی سورت سے ربط: قرآنِ حکیم کے مطالب کے لحاظ سے یہ سورت جوامعُ الکلم میں سے ہے۔ پچھلی آیتوں میں بتلایا گیا تھا کہ اُمّتِ مسلمہ کے مرضِ خسران میں مبتلا ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ اور جب ان کی اسلامی خصوصیات کو گھُن لگ جاتا ہے تو وہ کفار کے مقابلے میں جن میں وہی خصوصیات موجود ہوں مغلوب ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے اعمال محض ظاہری رسم و رواج پر مبنی ہو جائیں اور نیکی بجائے مرضاتِ الٰہی کے حصول کے ذریعہ ہونے کے محض ریاکاری اور منافقانہ تقویٰ و تقدس کا نتیجہ ہو۔ عبادات کی روح فنا ہو کر صرف صورت پرستی رہ جائے۔ حیلوں کی گرم بازاری ہو۔ فہم و بصیرت کی بجائے تقلیدِ جامد ان کا شعار بن جائے۔ قربانی کا جذبہ سرد پڑ جائے اور نماز کی روح فوت ہو کر نام و نمود اور بخل ان کا شعار بن جائیں۔ تو وہ ضرور کفار

Marfat.com

کے مقابلے میں خاسر و ناکام ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت اس وقت کفار انھیں مغلوب نہیں کرتے۔ بلکہ وہ خودکشی کرتے ہیں۔ اور ان کی قومی بدکرداری انہیں تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ۔ (الرعد)

"واقعی اللہ تعالٰی کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اپنی مہربانی اور نظر عنایت سے نوازتا ہے تو ان نوازشوں سے اس وقت تک اس قوم کو محروم نہیں فرماتا۔ جب تک کہ وہ اپنی روش اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہ بدلیں۔ جب ان کی روش بدلی تو پھر ساری کی ساری قوم پر آفت آجاتی ہے جو کسی کے روکے سے نہ رک سکتی ہے نہ کسی کے ٹالے ٹل سکتی ہے۔ گویا قوموں کے عروج و زوال کا قانون ہی یہ ہے کہ جب ان کے اعمال کے محرکات خلوص اور للّٰہیت پر مبنی نہ ہوں تو ان کا تباہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ ارشاد فرمایا:۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى

اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتا (یعنی چھینتا نہیں) جب تک وہی لوگ اپنے اعمال نہ بدل ڈالیں۔

یعنی لوگ جب بدکاری اور خدا کے قانون کی نافرمانی سے اپنی فطرتی صلاحیتوں کو مسخ کر دیتے اور خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو ان کے صحیح مصرف پر کام میں لانے کے بجائے ان کا غلط استعمال شروع کر دیتے ہیں اور انہیں اللہ کے احکام کے خلاف کام میں لانا شروع کر دیتے ہیں تو حق تعالیٰ اپنی نعمتیں چھین

لیتا ہے۔ اور اس کی نوازش انتقام کی صورت میں بدل جاتی ہے اور وہ قوم بالآخر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب موضح الفرقان میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نیت اور اعتقاد جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی۔"

اس لیے ما بانفسہم کے الفاظ استعمال کیے جن سے خاص نیت اور اعتقاد مراد ہے۔

یعنی جب امت مسلمہ خلوصِ نیّت اور صحت اعتقاد سے عاری ہو جائے اور اسکے اعمال ایسے ہو جائیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ امتِ مسلمہ مرضِ خسران میں مبتلا ہو چکی ہے اور خدا کے وعدے جو قرآنِ حکیم میں مومنوں سے کیے گئے ہیں متحقق الوقوع نہیں ہوں گے۔ اس وقت حقیقی اُمتِ مسلمہ اور اس مزعور امت مسلمہ میں سوائے نام کے اشتراک کے اور کوئی مماثلت باقی نہیں جس طرح شیرِ قالین اور شیرِ نیستاں میں اشتراک لفظی کے سوا کوئی مماثلت نہیں۔

شیرِ قالین اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

اب اس سورت میں سورۃ العصر کے تتمہ کے طور پر یہ تبلایا گیا ہے کہ ایسی صورت میں جب مسلمانوں میں مرض خسران کے جراثیم پیدا ہو جائیں تو ان کے لیے صحیح راہ عمل کیا ہے۔ اس کے لیے ایک نہایت لطیف پیرایہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں جملہ جزیہ کی سورت میں اس حقیقتِ ثانیہ اور دینِ اسلام کے اصولِ موضوعہ کی تلقین کی گئی ہے کہ حضرتِ سرورِ عالم صلعم کی بعثت کے بعد دنیا میں بقائے دوام صرف آنحضرت صلعم کے اتباع میں مضمر ہے۔ اب دنیا میں صرف ایک ہی ترقی کی راہ ہے اور وہ راہ

صراطِ مستقیم ہے جسے قرآن حکیم نے پیش کیا اور جس کی عملی تصویر اسوۂ حسنہ نبوی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ کے دشمن خاسر نا کام رہیں گے، ابتر اور بے نام و نشان ہو جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل "رہتی دنیا" تک رہے گا۔ اور دنیا کی سیادت آپؐ کے اور آپؐ کے سچے متبعین کے لیے مخصوص رہے گی۔ دنیا میں ہر قسم کی روحانی اور دنیوی ترقی کے دروازے صرف آپؐ کے اتباع ہی سے کھل سکیں گے اور جو شخص رسول عربی صلعم کا دشمن اور مخالف ہوگا وہ فنا کی گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اور جو قوم جس حد تک آنحضرت صلعم کا اتباع کریگی۔ عام اس سے کہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ ہندو ہو یا عیسائی۔ یہودی ہو یا مجوسی جس امر میں بھی وہ آنحضرت صلعم کی تعلیم اور آپکے مقرر کردہ اصولوں کی پیروی کریگی اس حد تک اور اس امر میں وہ کامیاب ہو گی

بہ ہر دورے کہ در آمد انتہا انجاست (نظیری)

اور جو قوم آپ کی مخالفت کرے گی خواہ وہ نام نہاد مسلم ہی کیوں نہ ہو تباہ اور برباد ہو جائے گی

یہ سورت قرآن حکیم کی سب سے چھوٹی سورت ہے۔ لیکن معانی کے اعتبار سے بڑی بڑی سورتوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ اسی لیے یہ جوامع الکلم میں داخل ہے۔ اس سورت میں کوزے میں دریا بند کر کے ایسے ایسے سبق اُمت مرحومہ کو دیئے گئے ہیں کہ اگر وہ ان پر کاربند ہو تو یہی سورت مسلمانوں کی فلاح دارین کے لیے کافی ہے۔

قصہ مختصر یہ سورت قرآن حکیم کے زندہ معجزوں میں سے ایک معجزہ اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ سورۃ الماعون میں جن جراثیم کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی موجودگی اس امر کا پتا دیتی ہے کہ مسلمان من حیث القوم مرض خسران پیدا ہو چکا ہے۔ ان جراثیم کا کیوں کر قلع قمع ہو سکتا ہے مرض خسران سے نجات حاصل کر کے اور نامرادی اور ناکامی کو کامیابی اور کامرانی میں

Marfat.com

بدلنے کے لیے سب سے پہلے مسلمانوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی جاتی ہے کہ انھیں خدا کی طرف سے ایک کامل و مکمل قانون عطا ہوا ہے، اور وہی ان کی جماعتی زندگی کا سنگِ بنیاد اور انکے ہر مرض کی دوا دینا اور ہر مشکل میں ان کا رہنما ہے۔ اس کے بعد بتلایا گیا ہے کہ جماعتی تشکیل اور نشاۃِ ثانیہ انہی اصولوں پر ہونی چاہیے جن پر پہلے اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔ یعنی صلوٰۃ کو نفاق و ریا سے پاک کر کے اسے خالصتاً اللہ کے لیے قائم کر کے اس کی صحیح سپرٹ پیدا کرنا۔ صلوٰۃ کی ہیئت اور شکل نہایت اہم سیاسی نتائج کو متضمن ہے۔ یہ جماعت بندی اخوت و محبت اور مساوات اور اجتماعی روح ( ) کے پیدا کرنے کا بہترین درس ہے۔

بالجملہ تمام وہ خصائص جو ایک صحیح ہیئتِ اجتماعیہ کے لوازم میں سے ہیں اسی ایک الصلوٰۃ کی صحت اور اسے کما حقہٗ ایک نظام کے ساتھ قائم کرنے سے حاصل ہوتے ہیں لیکن جہاں نماز خلوص سے خالی ہوتی اور للہ نہ ہوتی تو وہ محض بے کار محض ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

جب جماعتِ حقّہ تیار ہو گئی اور اس کے سب افراد حق کے نشے میں سرشار ہو گئے تو انھیں اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ:۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو اسلام کے اجتماعی اغراض و مقاصد پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہی قربانی کی اصلی روح ہے کہ وہ درحقیقت اسلام کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا سکھلاتی ہے۔

قصہ مختصر نماز تو انسان کو زندگی کے آئین سکھلاتی ہے اور قربانی انسان کو موت کا گُر از بر کراتی ہے۔

جنھیں مرنا نہیں آتا انھیں جینا نہیں آتا

جب ایک جماعت کی جماعت ایسی ہو کہ اس کا جینا، اس کا مرنا سب اللہ کے لیے مخصوص ہو جائے تو نا ممکن ہے کہ وہ مرضِ خسران میں مبتلا رہے اور فنا ہو۔ نہیں، بلکہ وہ اپنے دشمنوں پر ضرور فتح پائے گی۔

الا ان حزب اللہ ھم المفلحون (المجادلہ۔ ع ۳) "سن لو! اللہ کا گروہ یقیناً وہی کامیاب و کامران ہوں گے۔"

شانِ نزول:- اس سورۂ مبارکہ کی ایک خاص شانِ نزول ہے۔ شانِ نزول کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ واقعہ اس سورت یا آیت کے معانی کی تحدید یا تخصیص کر دیتا ہے۔ بلکہ ہر سورت یا آیت کا مدلول ومنطوق ہمیشہ عمومی ہوتا ہے تا وقتیکہ کوئی دوسرا قرینہ اس کے مخصوص یا محدود کرنے کا قرآن حکیم ہی میں نہ پایا جاتا ہو۔ شانِ نزول صرف اس کی ایک مثال ہے۔ جو اس کے مطالب کی وضاحت کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ اسی طرح یہ سورت بھی بلحاظ دعاوی کہ اب بھی ویسی ہی ناطق ہے جیسی اپنے نزول کے وقت تھی۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جب سرورِ عالم کے بڑے صاحبزادے کی وفات ہوئی اور آپ کے کوئی اولادِ نرینہ نہ رہی تو رؤسائے قریش مثلاً عاص بن وائل، کعب بن اشرف، عقبہ بن ابی معیط، ابولہب وغیرہ نے بہت اظہار خوشنودی کیا۔ اور کہا کہ آپ (معاذ اللہ) ابتر ہیں۔" کیونکہ اس کے نام لیوا تو کوئی ہے نہیں۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ اس کی حیاتِ مستعار کا چراغ گل ہونے کے ساتھ

Marfat.com

ہی اس کا نام بھی فنا ہو جائے گا۔ جیسا کہ آج کل ہندو بھی یقین کرتے ہیں۔ اسی طرح عربوں کے نزدیک بھی اولاد نرینہ کا نہ ہونا بڑی بدقسمتی اور عیب کی بات تھی۔ اس لیے کفارِ قریش مسلمانوں کو بھی طعنہ دیتے کہ۔ تم ایسے شخص کا اتباع کر رہے ہو جس کا کوئی بیٹا نہیں کہ اس کی نسل کو قائم اور اس کے نام کو زندہ رکھ سکے۔ یہ شخص معاذ اللہ، مرنے کے بعد بالکل بے نام و نشان ہو جائیگا اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کی قلتِ تعداد، ضعفِ قوت اور فقر و فاقہ مستی کی ہنسی اُڑاتے کہ یہ ٹکڑ گدے دنیا کو ہدایت کا پیغام دینے آتے ہیں۔ اگر ان کا دین برحق ہوتا تو بالضرور دولت و ثروت ان کے ہمرکاب ہوتی اور قوت و سطوت ان کی عنان تھامے ہوئے ہوتیں۔ ایسے فاقہ مستوں کی بے سروسامانی اور افلاس ہی ان کی ہلاکت کا پیغام بن جائے گا۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خیال کچھ کفارِ قریش کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا بلکہ ہر زمانے اور ہر عہد اور ہر قوم میں انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسی خیال کی مؤید رہی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ مادی اسباب کا ظہور ہے اور سیم و زر اور مال و اولاد کی قلت و کثرت ہی انسان کی ذلت یا عظمت کا فیصلہ کر سکتی ہے اور ہر اصلاحی تحریک چونکہ انتہائی غربت و بے کسی کی حالت میں شروع ہوتی ہے اس لیے اس کا تمسخر اُڑایا گیا۔

چنانچہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ کفار کا نظریہ پیش کر کے اس کے معتقدین کی حماقت پر روشنی ڈالی ہے:۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ	پھر نوح کی قوم کے جو سردار کافر تھے
قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا	نوح سے کہنے لگے کہ ہم کو تو تم ہماری ہی طرح
وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ	کے ایک آدمی دکھائی دیتے ہو اور ہم تو یہی
هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ	دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی وہی لوگ

Marfat.com

وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ م بَلْ نَظُنُّکُمْ کَاذِبِیْنَ ۝ (ھود ع۳)

کر رہے ہیں۔ جو ہم میں سے ظاہر ظہور رذیل اور کمینے ہیں اور ہم تم لوگوں کو اپنے سے کچھ بڑا نہیں پاتے یعنی تم لوگ دولت وثروت اور ظاہری شان وشوکت میں ہم سے بڑھے ہوئے نہیں ہو۔ بلکہ ہمارے خیال میں تو تم سراسر جھوٹے ہو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ (السبا۔ ع)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا۔ مگر وہاں کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو ان احکام اور تعلیمات کے منکر ہیں جو تمہیں خدا کی طرف سے دی گئی ہیں اور انہیں نے یہ بھی کہا کہ وہ مال اور اولاد کی کثرت میں تم سے بہت بڑھے ہوئے ہیں اور ہمیں کبھی بھی عذاب نہیں ہوگا۔

لیکن بنی نوع انسان کی عقلی بوالعجبیوں کا بھی عجیب حال ہے کہ جس درجہ یہ خیال غلط ہے کہ انسان کا نام اس کی اولادِ نرینہ کی وجہ سے باقی رہتا ہے یا مادی ساز وسامان اس کی شہرت اور بقائے دوام کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اسی درجہ انسان اور بظاہر عقلمند اور خوش حال انسان کو اس کی صحت پر اصرار رہا ہے۔ حالاں کہ عقلِ سلیم اور مشاہدہ دونوں اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ انسان کی کم علمی اور تنگ نظری، کوتاہ بینی اور مادہ پرستی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ انسان اگر واقعاتِ عالم کا بنظرِ غائر مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس خاکدانِ ارضی کا چپہ چپہ اور انسانی تاریخ کا ورق ورق انسانی تمدن کی ناپائیداری اور دنیاوی اسباب کی بے بسی کا کھلا کھلا اعتراف واعلان کر رہا ہے۔ اور اگر انسان خداداد بصیرت سے کام لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں انسان کی عزت اور اس کا احترام ہمیشہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ کہ اپنی اولاد کی کثرت یا مادی اسباب کی

افراط کی وجہ سے۔ انبیاے کرام کو چھوڑیے کہ ان کی بزرگی اور عظمت کا راز اور ہی ہے جس کی تشریح آگے آئے گی۔ دنیا کے بڑے بڑے انسانوں پر نظر ڈالو، بقراط، سقراط، افلاطون، ارسطو، ہنی بال، اقلیدس، حاتم طائی، نوشیروان، ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوحنیفہؒ، مالکؒ، احمد حنبلؒ، شافعیؒ، بخاریؒ، بوعلی سینا، رومی، نیوٹن، ڈے کارٹ، کانٹ، لائبنز، نپولین وغیرہم کو لیجیے، ان سب کا نام تاریخِ انسانی کے صفحات میں ابدیت کے قلم سے کندہ ہے۔ ان میں سے کون شخص اپنی اولاد کی وجہ سے دنیا میں مشہور ہوا ہے یا اس کے دنیاوی ساز و سامان یا مال و دولت کی کثرت اس کی عزت و بقائے دوام کا سبب بنے۔ کیا کوئی شخص اس بداہت سے انکار کر سکتا ہے کہ دنیا کے یہ اکابر اور اُفقِ انسانیت کے یہ درخشاں ستارے محض اپنے کارناموں یعنی اپنے ذاتی کمالات کی وجہ سے دنیا میں مشہور رہیں:۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اولاد کی قلت و کثرت پر انسان کے نام کے فنا و بقا کو منحصر کرنا تاریخ کی تردید اور حقائقِ مُسلّمہ کی تکذیب کے مترادف ہے۔

دنیا میں کوئی عظیم الشان ہیرو ایسا نہیں گزرا جس کا نام اس کی اولاد کی وجہ سے روشن ہوا ہو۔ بلکہ انسان کی حقیقی اولاد اس کے کارنامے ہیں۔ اس کی خدماتِ خلق اور اس کے فیوضاتِ علمی و روحانی ہیں۔ جو ان کے نام کو ابدی اور غیر فانی کرتے ہیں۔

قرآن حکیم نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ کے ان دشمنوں کو یہ جواب دیا کہ جس شخص کو اللہ تعالےٰ خیر کثیر یعنے قرآن حکیم جیسی روشن کتابِ ہدایت عنایت فرمادے اس کا نام ابدالاباد تک روشن رہے گا۔ ایسے شخص کو ابتر کہنا انتہا درجے کی بے بصری اور حماقت ہے۔ نہیں بلکہ یہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ سوائے محمد رسول اللہ صلعم کے اتباع کے فوز و فلاح

Marfat.com

کی ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں اور آپ کے دشمنوں اور آپ سے بغض رکھنے والوں کی قسمت میں ابتری اور تباہی مقدر ہو چکی ہے۔ گویا اس سورت میں صرف آنحضرت صلعم کے ہمعصر دشمنوں ہی کو جواب نہیں دیا گیا بلکہ ابد الآباد تک کے لیے انسانی فوز و فلاح کے واحد راستے اور قوموں کی تباہی کے اصلی راز کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے اسے سورۃ الماعون کے بعد رکھا گیا ہے تاکہ مسلمان جو راہِ حق سے بھٹکنے لگیں۔ انھیں اپنے خسران کا واحد علاج بتلایا جائے۔ اسیلئے اسمیں سورۃ العصر کی طرح ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایک ایسی ہستی کا ذکر کر دیا گیا جو ہدایت کا روشن چراغ بنی نوع انسان کا امام و پیشوا اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی میزان ہے۔ اور بتلایا گیا کہ کامیابی و کامرانی اس کے متبعین کے حصے میں ہے اور تباہی و نامرادی اس کے دشمنوں اور مخالفوں کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

حلّ لغات:۔

انا اعطینک الکوثر: کوثر، کثرت سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی "خیر کثیر" کے ہیں۔ یعنی بہت بڑی بھلائی اور بہتری۔ گویا اس میں تمام وہ روحانی اور جسمانی نعمتیں اور دینی اور دنیوی برکتیں۔ دنیوی اور اخروی انعامات اور رحمتوں کی بارش شامل ہے جو آنحضرت صلعم کو اور آپ کے طفیل آپؐ کی امت مرحومہ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی تھیں۔ اور جو آپؐ سے پہلے کسی نبی کو اور کسی نبی کی امت کو مرحمت نہیں ہوئیں۔

مفسرین کرام نے "خیر کثیر" کی تعیین میں مختلف قول نقل کیے ہیں۔ لیکن

اصح القول یہی ہے کہ ان نعمتوں کی سرتاج اور اصل واساس دنیا میں قرآنِ حکیم ہی ہے اور آخرت میں "نہر کوثر" یا "حوضِ کوثر" ہے جس کے پانی سے آپ روزِ محشر میں اور جنت میں اپنی اُمت کے جنتی افراد کو شادکام وسیراب فرمائیں گے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مذکور ہے:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ہ (البقرہ۔ ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انھیں (گناہوں کی آلائشوں سے) پاک کر دے بے شک تو ہی بہت زبردست بڑا حکیم ہے۔"

پھر فرمایا کہ:۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ہ

اور جسے اللہ کی طرف سے حکمت عطا ہوئی اسے خیرِ کثیر یعنے سب سے بڑی بھلائی اور نعمت عطا ہوئی۔"

پھر پیغمبر صاحب صلعم پر خدا تعالیٰ اپنا احسان جتاتا ہے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ہ

"اور (اے پیغمبر) اللہ نے تمہیں وہ سب کچھ پڑھایا، جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا احسان تم پر بہت ہی بڑا ہے۔"

نیشاپوری لکھتے ہیں:۔

وقیل الکوثر ھو القرآن لان لہ فوائد عدیدۃ الحصلی۔

اور کہا جاتا ہے کہ الکوثر سے مُراد قرآن ہی۔ کیونکہ اسکے فوائد بے شمار ہیں۔

Marfat.com

احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:-

عن عکرمۃ فی قول اللہ تعالیٰ عزوجل انا اعطینٰک الکوثر قال الخیر الکثیر القرآن والحکمۃ (رواہ ابن جریر)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد "انا اعطینٰک الکوثر" کی تفسیر کے بارے میں ابن جریر نے حضرت عکرمہ سے روایت کی ہے کہ کوثر خیر کثیر قرآن اور حکمت ہے:-

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما انہ قال الکوثر الخیر الذی اعطاہ اللہ تعالیٰ ایاہ قال ابو بشر فقلت لسعید فان ناسا یزعمون انہ نہر فی الجنۃ قال النہر الذی فی الجنۃ من الخیر الذی اعطاہ اللہ عزوجل ایاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ الکوثر سے مراد وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلعم کو عطا فرمائی۔ ابوبشر نے کہا کہ اس پر میں نے سعید سے جو اس کا راوی ہے، کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جنت کی ایک نہر ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ وہ نہر جو جنت میں آپ کو عطا ہوگی۔ وہ بھی اس خیر کثیر میں داخل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو عطا فرمائی:-

ان آیات واحادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ الکوثر یا وہ خیر کثیر جو آپ کو مرحمت فرمائی وہ دنیا میں قرآن حکیم اور آخرت میں حوض کوثر اور نہر کوثر ہے۔

مفسرین کرام نے کوثر کی تشریح نبوت، علم وحکمت، ہدایت وارشاد اور انشراح صدر وغیرہ انعاماتِ الٰہیہ سے کی ہے۔ وہ بھی جزوی طور پر درست ہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم ان سب انعامات کا جامع ہے۔ قرآن حکیم خود ہی انعامِ اکبر ہے۔

Marfat.com

ہدایت و ارشاد ہے۔ انشراحِ صدر ہے اور نور و بصیرت۔ غرض کہ آنحضرت صلعم کا فیضِ عام جس قدر بھی جاری ہوا وہ قرآنِ حکیم ہی کی برکت اور اس کے نزول کی وجہ سے ہوا۔ قرآنِ حکیم ہی آپ کا سب سے بڑا اور ہمیشہ زندہ رہنے والا معجزہ ہے۔ قرآنِ حکیم ہی آپ کی نبوت کا سب سے بڑا ثبوت۔ قرآنِ حکیم کا فیضان اس دنیا تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ بلکہ قیامت کے بعد بھی جب مومنین جنت میں چلے جائیں گے اور اس کے روحانی فیوض نہر کوثر کی صورت میں جنتیوں کو سیراب کریں گے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی "فتح الباری (جزو خامس عشر ہندیہ ص۴۵۵) میں حدیث معراج پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

تجسید المعانی جائز کما جاء ان سورة البقرة تجئ یوم القیامة کانھا ظلة والموت فی صورة کبش وکذالک وزن الاعمال	معانی کا اجسام کے ساتھ متمثل کرنا جائز ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن سورۃ البقرۃ اپنے پڑھنے والوں پر بادلوں کی طرح سایہ کیے ہوگی اور موت

کو مینڈھے کی صورت لاکر ذبح کردیا جائے گا اور اسی طرح اعمال کا تول ہوگا۔"

علم کو ہمیشہ نہر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لیے قرآنی فیوضاتِ لامتناہیہ کے لیے نہر کوثر سے زیادہ پاکیزہ تصور ممکن نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے:۔

عن انس قال اغفیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اغفاوۃً فرفع راسہٗ تبسماً فقال انہ انزل علیّ انفا سورۃ فقراء۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم	مسلم نے صحیح میں اور احمد، ابوداؤد و نسائی اور دوسرے محدثین نے حضرت انس رض سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ صلعم کو نیند کا ایک جھونکا سا آگیا اور آپ نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اٹھایا اور

Marfat.com

انا اعطینٰک الکوثر حتی ختمھا قال ھل تدرون ما الکوثر قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال ھو نھر اعطانیہ ربّی فی الجنۃ علیہ خیر کثیر ترد علیہ امتی نیقال انک لا تدری ما احدث بعدک اخرجہ احمد وابوداود والنسائی واخرجہ مسلم فی صحیحہ :۔

فرمایا کہ ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی۔ پس آپ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم انا اعطینٰک الکوثر آخر سورت تک تلاوت فرمائی اور فرمایا۔ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ الکوثر کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، کہ "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں" آپؐ نے فرمایا "وہ نہر جو اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں عنایت فرمائے گا اس میں خیر کثیر ہوگی۔ میری اُمت اس کے گرد جمع ہوگی اور اس کے ارد گرد ستاروں کی طرح کثرت سے پیالے ہونگے اسی وقت ایک آدمی کو (جو پیالے سے پینے کے لیے بڑھے گا) گھسیٹ کر علیحدہ کر دیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا" خدایا یہ میری اُمت میں سے ہے۔" حکم ہوگا کہ تمہیں کیا خبر کہ تمہارے بعد اس نے کیا کیا نئی باتیں دین میں ایجاد کیں:

اسی طرح بخاری شریف کی روایت ہے کہ :۔

عن انس بن مالکؓ قال لما عرج بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم الی السماء قال اتیت علی نھر حافتاہ قباب اللؤلؤ المجوف فقلت ما ھذا یا جبریل۔ قال ھذا الکوثر۔ رواہ البخاری ومسلم ھو لفظہ۔

بخاری اور مسلم نے صحیحین میں حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ جب رسول کریم صلعم کو آسمانوں کی طرف معراج ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ میرا گزر ایک نہر پر ہوا جس کے ارد گرد موتیوں کے قبے تھے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" جبرئیل نے کہا کہ یہ الکوثر ہے۔"

Marfat.com

دوسری حدیثوں میں اس نہر کوثر اور حوضِ کوثر کے عجیب وغریب اوصاف بیان ہوئے ہیں

آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ وہ نہر ہے جنّت میں جو مجھے خدا تعالےٰ عنایت فرمائے گا۔ جس کے ارد گرد سونے چاندی کے خیمے ہوں گے اور جس کا فرش لعل و زبرجد کا ہوگا۔ اس نہر کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہوگا۔ اس کی خوشبو مشکِ خالص کی سی ہوگی اور اس کے اِردگِرد آسمان کے ستاروں کی طرح کثیر التعداد پیالے ہوں گے جن سے میں اپنی اُمّت کے جنتی افراد کو بھر بھر کر پلاؤں گا"

(یہ اختصار ہے بہت سی احادیث کا)

حوضِ کوثر اور نہر کوثر کی حدیثیں حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں۔ اس لیے اس کا اقرار لازم ہے۔ بیہقی نے ان تمام احادیث کو اپنی کتاب البعث والنشور) میں جمع کیا ہے۔ صحابہؓ کی ایک کثیر جماعت سے یہ حدیث مختلف سلسلوں سے مروی ہے۔

بعض محدّثین کے نزدیک حوضِ کوثر نہر کوثر کا ہی ایک حصہ ہوگا جو میدان حشر میں لاکر جمع کر دیا جائے گا۔ اور جس سے حشر کے میدان میں اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کے جنّتیوں کی تشنگی رفع ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب ان احادیث کے مقابلے میں مندرجہ ذیل آیات پر بھی غور کیجئے۔

قل لو کان البحر مدادًا لکلمات	(اے پیغمبر) کہدو کہ اگر سارے کا سارا
ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات	دریا سیاہی بن جائے اور اس سے میرے پروردگار
ربی ولو جئنا بمثلہ مددا	کی مناجاتیں لکھنی شروع کر دی جائیں تو میرے
(الکہف - ع ۱۳)	پروردگار کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے

Marfat.com

یقینا دریا ختم ہو جائے گا۔ اگرچہ اتنی ہی اور سیاہی کیوں نہ لے آئیں اس کی مدد کو۔"

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ (لقمان ع ۳)

اور جتنے درخت روئے زمین پر ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں اور اس کے بعد سات اور ایسے ہی سمندر رہوں (اور وہ بھی سیاہی کا کام دیں) تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔"

ان سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نہر کوثر جو فیضانِ روحانی کا ایک لامتناہی چشمہ ہے اور جس سے اہلِ جنت سیراب ہوتے رہیں گے۔ قرآنِ حکیم ہی کے فیوضات کا اثر ہے۔ گویا جن لوگوں نے قرآنِ حکیم سے دنیا میں روحانی تزکیہ کر لیا ہے وہی آخرت میں نہرِ کوثر سے سیراب ہوں گے۔ گویا قرآنِ حکیم کے روحانی فیوضات نہرِ کوثر کی صورت میں متمثل ہو جائیں گے۔ واللہ عالم بحقیقۃ الحال:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ: اے پیغمبر چونکہ ہم نے تمھیں کوثر جیسی عظیم الشان نعمت عطا کی ہے اس لیے اس کے شکریے میں تم بھی تمام جسمانی اور مالی عبادات کو خدا کے لیے ہی مخصوص کر دو۔ نَحَر کے معنی قربانی کے ہیں۔ ابن کثیرؒ نے اس کے معانی کے بارے میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ لیکن اس نے ان کی تضعیف کی ہے اور قربانی کے معنی کو ہی ترجیح دی ہے۔ کیونکہ قربانی کی اصلی حقیقت جان قربان کرنا ہے۔ اس لیے نماز اور قربانی کو اللہ کے لیے مخصوص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ساری زندگی۔ اپنا جینا۔ اپنا مرنا۔ سب اللہ کے لیے مخصوص کر دے اور کسی اور مقصد یا خواہش کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

قل ان صلوتی ونسکی ومحیای

(اے پیغمبر) کہہ دو کہ یقیناً میری نماز اور

و مماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین ہ	میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں
(الانعام۔ع۔۳)	

سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔

ان شانئک ھوالابتر :۔

شانئک :۔ یعنی تیرا دشمن، یہ لفظ بالکل عام ہے۔ اس سے مُراد ہر وہ شخص ہے۔ جو آنحضرت صلعم کا اور آپ کی تعلیمات، آپ کی ہدایت۔ آپ کے طریقے کا مخالف یا دشمن یا معاند ہے۔ مشانی کے لفظی معنی ہیں بغض رکھنے والا۔ ابتر کے معنی ہیں مقطوع الذنب۔ یعنی دُم کٹا جانور اور محاورے میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کا کوئی نام لینے والا باقی نہ رہے۔ اور ان کا خیال تھا کہ جس شخص کے اولادِ نرینہ نہ ہو اس کا نام ونشاں باقی نہیں رہتا۔ عرب میں کسی کے ذکر خیر کے باقی رہنے اور اس کے اچھے اثرات کے باقی رہنے کو حیوان کی دُم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کیونکہ دُم بھی حیوان کے پیچھے ہوتی ہے اور اس کے حسن وخوبصورتی کا لازمہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ذکرِ خیر بھی انسان کے متعاقب ہوتا ہے۔ اور اس کے کمال کا لازمی نتیجہ۔ ناکامی اور نامُرادی کو قطع ذنب سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لیے ابتر اس شخص کو کہتے ہیں جو ایسا نامراد ناکام اور حرماں نصیب ہو کہ اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے اور اگر وہ یاد کیا بھی جائے تو برائی اور لعنت سے۔ ابنِ ہشام کہتے ہیں :۔

الابتر الذی لا عقب لہ یتبعہ	ابتر وہ ہے جس کا کوئی نام لیوا نہ رہے

جو اس کی پیروی کرے یا اس کے پیچھے آئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں :۔

نیکواں رفتند وسنتہا بماند ۔۔۔ وز بداں جُز جور وہ تماند

تشریح مطالب :-

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ قرآن حکیم کمالِ اعجاز ہے کہ ایک ضمنی اعتراض کے جواب میں عظیم الشان صداقتوں اور قوموں کے عروج و زوال کے حقائق پر روشنی ڈال دیتا ہے۔ اب اس سورت میں اصل مقصود بظاہر تو کفارِ قریش کے اعتراض کا جواب دینا تھا۔ لیکن دیدۂ حقیقت بیں فوراً تاڑ جاتی ہے کہ یہاں اصل مقصود بالکل ہی اور ہے اور اعتراض کا جواب محض ضمناً آ گیا ہے۔ یہاں مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت کے بعد یہ اٹل قانون بنا دیا گیا کہ آپ کے سچے اتباع کے سوا حقیقی ترقی کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں اور بنی نوعِ انسان کو ایک مکمل ضابطہ یعنی قرآن حکیم، ایک مکمل نسخۂ فصلِ لربک وانحر اور ایک کامل و مکمل ہادی و رہنما یعنی محمد الرسول اللہ صلعم دے دیے گئے ہیں۔ اب اس کے بعد ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہو سکتا جو اس دائرے سے خارج ہو۔

قرآن حکیم نہ صرف ایک مذہبی (اصطلاحی معنوں میں) اور روحانی رہنمائی کی کتاب ہے بلکہ وہ انسان کی ہر معاشی، اقتصادی اور معاشرتی، سیاسی اور بین الاقوامی ضرورت کے لیے مکمل قانون پیش کرتا ہے۔ اس لیے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس قوم یا جماعت کے پاس ایسا مکمل ضابطہ ہو وہ دنیا میں خاسر و ناکام ہو۔ اب اتنی بڑی نعمت کا شکر بھی تو ویسا ہی ہونا چاہیئے۔ شکر کا طریقہ بھی خود اللہ تعالےٰ نے سکھلا دیا۔ گویا یہ دوسرا انعام ہوا۔ اور پھر کمال یہ کہ شکر کا طریقہ بیان کرنے کے ضمن میں جماعتوں کی موت و حیات کا راز بھی آشکارا کر دیا اور امتِ مسلمہ اور امتِ کافرہ میں ما بہ الامتیاز بتلا دیا۔ اور اسلامی روح کی موجودگی کی ایک بے خطا کسوٹی بیان فرما دی اور اس بیماری کا حکمی علاج جس کا ذکر پچھلی سورت میں گزر چکا ہے، تجویز فرما دیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ خدا کے

بہترین احسان کا بدلہ یہ ہے کہ ہماری عبادت اور ہماری قربانی صرف اسی مولا کریم کے لیے ہو جائے۔ ہمارا مرنا اور جینا سب اسی کے لیے ہو جائے جس نے ہمیں حیات کی نعمت سے مالا مال کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ہدایت اور ہماری روحانی حیات کے سامان بھی مہیا فرمائے۔ گویا اس آیت نے مسلم اور کافر کے درمیان حدِ فاصل قائم کر دی۔ مسلمان کی عبادت صرف اللہ کے لیے مخصوص ہوتی ہے اور اعدائے رسول صلعم یعنی کفار کی گردنیں ہمیشہ غیر اللہ کی طاعت میں خم رہتی ہیں۔ مسلمان کی عبادت میں شرک یا توسل کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اگر جھکتا ہے تو اسی کے سامنے۔ وہ اگر دستِ سوال پھیلاتا ہے تو اسی کے آگے۔ وہ عاجزی و زاری کرتا ہے تو اسی کے حضور میں اس کا خشوع و خضوع اپنے مولا کے لیے ہوتا ہے لیکن غیر مسلم کا سر ہر آستانہ پر جھکتا ہے۔ وہ غیر اللہ کو اپنا ملجا و ماوٰی خیال کرتا ہے اور اپنی حاجتوں میں انہی کی طرف دوڑتا ہے۔ عبادت ہی کی طرح مسلمانوں کا مال و دولت اور تمام دنیاوی ساز و سامان اللہ کی رضامندی کے لیے وقف ہو جاتے ہیں اور غیر مسلم کی تمام خیرات اور قربانی غیر اللہ کے لیے اور محض نام و نمود کے لیے ہوتی ہے گویا جب کسی قوم میں سے یہ دونوں باتیں (یعنی عبادت اور قربانی صرف اللہ کے لیے ہے) اٹھ جائیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام ان میں سے رخصت ہو گیا۔ پھر بھی اگر وہ اپنے آپ کو مسلم کہتے ہیں تو ان کا اسلام محض رسمی ہے جو انھیں کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اس آیتِ کریمہ نے کمالِ اختصار سے خدا اور اس کے رسول صلعم کے دوست اور دشمن میں بھی مابہ الامتیاز بتلا دیا۔ یعنی خدا اور اس کے رسول کے دوست وہ ہیں جن کی تمام عبادات اور قربانیاں اور صدقات خالصتہً لوجہ اللہ ہوتی ہیں۔ اور برخلاف اس کے خدا اور رسول صلعم کے دشمنوں کی عبادات اور خیرات غیر اللہ کے لیے ہوتی ہیں۔ اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ایک مسلم کی تمام زندگی کا مقصدِ

Marfat.com

وحید اللہ کی رضا کا حصول ہے اور اس کی بہترین ٹریننگ یہ ہے کہ اس کی عبادت اور قربانی اللہ کے لیے مخصوص ہو جائے۔ اس سے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے، کیونکہ ان کی عبادات اور قربانیاں اللہ کے بجائے غیر اللہ کے لیے وقف ہیں:۔

عبادت کے دو جُز ہیں :-

پَرستش : یعنی بندگی اور اطاعت۔

اب مسلمانوں کی اطاعت تو تقریباً تمام کی تمام ایک کافرانہ نظام کے لیے وقف ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ نام نہاد اسلامی سلطنتیں بھی کافرانہ نظام کو اپنے یہاں رواج دے رہی ہیں اور اس کی غلامی کو تہذیب و تمدّن کا معراج قرار دیتی ہیں کافرانہ رُسوم و شعائر کی اندھا دھند تقلید تہذیب و ثقافت کی نشانی قرار پا چکی ہے حکومت پرستی ان کا طغرۂ امتیاز ہے۔ اسی طرح عامۃ المسلمین کی بندگی غیر اللہ کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ قبروں پر سجدہ کرنا اور اسے سجدۂ تعظیمی کا لقب دینا۔ ان پر خشوع و خضوع سے مراقبہ کرنا۔ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اپنی حاجتیں ان کے پاس لے جانا اور پیروں کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھنا ان کے ہر حکم کی (خواہ وہ کتاب و سُنّت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو) اطاعت کرنا، یہ سب غیر اللہ کی پرستش ہے۔

اسی طرح قربانی میں مالی جانی اور علمی سب قسم کی قربانیاں شامل ہیں۔ اور مسلم کی تو یہ نشانی ہی ہے۔ مگر افسوس کہ فی زمانہ خدا کے لیے ہر قسم کی قربانی دینا تو مسلمانوں میں سے قریباً مفقود ہو چکا ہے۔ البتہ بعض جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں "قوم" اور "وطن" کے نام پر قربانی کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ وہ غیر الٰہی نظام کے قیام و بقا کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں مگر خدا کے لیے ان کے ہاں کچھ نہیں۔ رہا وہ طبقہ

جو قبروں پر نذریں نیازیں دیتا ہے۔ چڑھاوا چڑھاتا ہے اور میلے منعقد کرتا ہے اور فاطمہ بی بی کی صحنک شیخ سدو کا بکرا۔ مدار کا مرغا وغیرہ قربان کرتا ہے اور جو مجالس قوالی وغیرہ کی ثواب کی نیت سے منعقد کرتے ہیں۔ گویا ان کی تو تمام تر خیرات و قربانی غیر اللہ کے لیے وقف ہے۔

اس کے برعکس قرآن حکیم نے اس امر کی تصریح فرمادی ہے کہ مومن و کافر میں مابہ الامتیاز ہی یہی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :۔

ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین	اللہ تعالیٰ نے بالیقین مسلمانوں سے ان کی
انفسھم و اموالھم بان لھم	جانیں اور ان کے مال خرید کر لیے ہیں، اس
الجنۃ ط یقاتلون فی سبیل	قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ
اللہ فیقتلون و یقتلون وعدًا	کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر مارتے ہیں یا مرتے
علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل	ہیں۔ تورات اور انجیل اور قرآن میں اللہ کے
القرآن فمن اوفیٰ بعھدہٖ	ذمہ یہ سچا وعدہ ہو چکا ہے کہ۔ پس کون ہے
فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم	اللہ سے زیادہ اس قول کو پورا کرنے والا
بہٖ (التوبہ۔ع ۱۴)	سو اس سودے پر جو تم نے کیا خوشیاں مناؤ۔

گویا اسلام اپنی تمام زندگی از اول تا آخر، اپنا مرنا، اپنا جینا، اپنی تجارت اور مال و دولت، اپنی اولاد، اپنا گھربار، اور اپنا وطن سب کچھ خدا کی راہ میں وقف کر دینے کا نام ہے۔

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز
اے رُوسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

Marfat.com

خواجہ حافظ رحمۃ اللہ نے بھی اس خیال کو پیش کیا ہے:

ترکِ مال و ترکِ جان و ترکِ سر
در طریقِ عشق اوّل منزل است

مرزا غالب نے اس سے بھی زیادہ لطیف پیرائے میں اس کا اظہار کیا ہے۔

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہم سورۃ العصر کی تفسیر کی ضمن میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ جماعتوں کے قیام و بقا کے لیے جن عناصر کی ضرورت ہے ان میں سب سے اول وحدتِ خیال ہے۔ جب تک کسی جماعت کا عقیدہ اور آئیڈیل ایک نہیں ہوتا۔ اس میں حرکت کی قوت پیدا ہو ہی نہیں سکتی یہی مقصود نماز اور قربانی کے لیے مخصوص کر دینے کا ہے۔ اس سے ایک جماعت میں وحدتِ مقصد اور اس کے حصول کے لیے ایسے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہو جاتی ہے اور اس کا ہر قدم ترقی کی ہی طرف اٹھتا ہے۔ ادبار اور رجعت اس کے پاس بھی نہیں آنے پاتی۔

یہاں ہم چند غیر مسلم اربابِ فکر کی آرا نقل کرتے ہیں:۔

مشہور فرانسیسی فلاسفر مونٹیس قیو لکھتا ہے۔

"کسی مذہب نے بھی نماز سے بہتر طریق عبادت یا خدا کے حضور میں اپنے کامل انقیاد کے اظہار کا طریق تجویز نہیں کیا۔ ہمارے ذہن میں کسی ایسی رسم کا تصور بھی نہیں آ سکتا جو اس قدر تکرار سے کی جائے اور پھر بھی اس کا اثر اور اس کی جدت ویسی کی ویسی رہے" (لطیفے ۱۲۸)

Marfat.com

مسٹر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ اپنی مشہور کتاب "دی پریچنگس آف اسلام میں لکھتا لکھتا ہے۔ ۔

"نماز کی وجہ سے مسلمان کا مذہب ہمیشہ اس کے سامنے اور پیش نظر رہتا ہے اور نماز میں مذہبی روح کا اظہار ہمیشہ ایسے طریق پر ہوتا ہے کہ نمازی تو نمازی، ناظرین بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"[۲]

موسیو ینان مشہور فرانسیسی فلاسفر، مورخ اور سائنسداں لکھتا ہے:۔

"آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں کسی مسجد میں جا کر نماز باجماعت دیکھوں اور میری مذہبی روح تازہ نہ ہو جائے اور مجھے یہ افسوس نہ نہ ہوا ہو کہ میں مسلمان کیوں نہیں ہوں۔"[۳]

موسیو جی۔ لے لیفرائے لکھتا ہے:۔

"کوئی انسان بھی نماز کی روحانیت اور حیات آفرین اجتماعی کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسلامی ممالک میں مجھے اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ جونہی نماز کا وقت ہوا تو مسلمان سرکاری دفتر میں، ریلوے اسٹیشن پر، ریل گاڑی میں۔ کلب میں یا کھیل کے گراؤنڈ کے کنارے یا پارک میں سیر کرتے ہوئے فی الفور ایک طرف ہو کر نماز کے لیے خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہونے کے

---

[۱] "روح قانون" Montesque
Del Esprit des Lors

[۲] T.W. Arnold: The preaching of Islam

[۳] Revan: L'Islamism et la science

سے پیے حاضر ہو جاتا ہے۔

مجھے جامع مسجد دہلی کا وہ نظارہ کبھی نہیں بھولتا جب جمعۃ الوداع کے دن جمعہ کی نماز میں ہزاروں مسلمان ایک خدا کے حضور میں نہایت خشوع وخضوع سے جھکے ہوئے تھے اور ان کی ہر حرکت سے کمال عجز و الحاح ٹپکتا تھا۔"

مسلمانوں جیسی مختلف الخیال جماعت (جس کے اجزائے ترکیبی میں مختلف قومیں مختلف زبانیں بولنے والے گروہ اور مختلف نسلیں جو مختلف روایات کی حامل ہیں، شامل ہیں) میں جماعتی اتحاد اور یگانگت پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ تمام مورخوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اسلام کی حیرت انگیز کامیابی کی تہ میں یہی جماعتی اتحاد و یک جہتی کارفرما تھی، لیکن وہ اس محیر العقول معجزے کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکے اس میں کلام نہیں کہ اس اتفاق اور یک جہتی کا سب سے بڑا ذریعہ نماز باجماعت تھی۔ روزانہ پانچ وقت تمام مومنین خواہ وہ صحرا کی پہنائیوں میں یک و تنہا پھر رہے ہوں یا شہروں میں کاروبار میں مصروف ہوں یا پرلطف صحبتوں میں داد نشاط دے رہے ہوں۔ اذان کی آواز سن کر یا نماز کے وقت پر جب وہ اکیلے ہوں مکہ کی طرف ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک اللہ کی مدح و ستائش میں ایک ہی لفظ میں زمزمہ سنج ہوتے ہیں اور نبی اکرم صلعم کی اطاعت کا اقرار کرتے ہیں۔ اس نظارہ کا اثر دیکھنے والوں پر حیرت انگیز ہوتا ہے۔ تو بھلا نمازیوں پر کیا کچھ اثر نہ ہوتا ہوگا؟ نمازیوں کے دلوں پر اس کا ایسا عظیم الشان نفسیاتی اثر ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ وہ اتحاد اور یگانگت ہے جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ بنی نوع انسان کے تمام رہنماؤں میں محمد صلعم پہلے رہنما تھے جنھوں نے نماز باجماعت کے حیرت انگیز جماعتی

Marfat.com

اثرات کا اندازہ لگایا۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تعمیر میں نماز با جماعت کے اٹل حکم نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔[1]

تاریخ میں ایسے سینکڑوں بلکہ ہزاروں واقعات موجود ہیں کہ بہت سے غیر مسلم صرف نماز با جماعت کو دیکھ کر ہی مسلمان ہو گئے۔

چنانچہ راجا داہر کی فوج کا واقعہ مشہور ہے کہ سردار محمد بن قاسم نے راجا داہر کے دارالسلطنت کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور دونوں طرف سے بہادر دادِ شجاعت دے رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ مسلمانوں کی فوج فی الفور خدا کے حضور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ ہندو لشکر اس نظارے کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو گیا اور اکثر سپاہیوں کے قلوب پر یہ اثر ہوا کہ وہ سوچنے لگے کہ یہ انسان نہیں فرشتے ہیں۔ چنانچہ راجا داہر کی دونوں بیٹیاں اور کئی ہزار لشکر فی الفور مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح جب سومناتھ کے مندر کے سامنے عین گھمسان کی لڑائی کے دوران میں جب سلطان محمود غزنوی اور اس کی فوج خدا کے حضور سربسجدہ ہو گیا تو کفار پر ایسا رعب پڑا کہ ان کے چھکے چھوٹ گئے اور انھوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ اقبال نے انہی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

---

[1] Emotion as the Basis of civilisation

ایک دفعہ راقم الحروف کے ہاں بہت سے افراد جمع تھے۔ انہی میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے۔ وہ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ "مولوی صاحب! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ جس قوم کے پاس نماز اور زکوٰۃ جیسے دو عدیم المثال ادارے (Institutions) ہوں۔ وہ قوم کیوں ذلیل و خوار رہے؟"

راقم الحروف نے عرض کیا ۔ "لالہ صاحب :۔

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی

وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہوگئیں"

اور میرا ذہن اس آیت کی طرف منتقل ہوا :۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

نماز اور زکوٰۃ بے شک بے مثل ادارے ہیں۔ بشرطیکہ وہ خدا کے لیے ہوں اور نفاق و ریا سے پاک ہوں۔ ورنہ ان کی مثال جگنو کی سی ہے کہ اس میں چمک تو ہوتی ہے مگر گرمی نہیں ہوتی جو سردی میں کام دے سکے۔

قصہ مختصر صلوٰۃ کے تین حصے ہیں :۔

اول : قرآن حکیم کی تلاوت۔ یعنی احکامِ الٰہی کو پڑھنا، سمجھنا اور ان پر غور کرنا۔ اس لیے اکثر آئمہ مجتہدین اس طرف گئے ہیں کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ نماز میں وہ جو کچھ پڑھتا ہے اس کا مفہوم پوری طرح سے سمجھے۔ اسی لیے امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے ہے کہ جو شخص عربی نہیں جانتا وہ فارسی میں (کیونکہ اس وقت عجمی مسلمانوں کی زبان فارسی ہی تھی) نماز پڑھ سکتا ہے، گویا وہ اپنی مادری زبان میں نماز ادا کر سکتا ہے۔ اور امام شافعیؒ کی یہ رائے ہے کہ ہر مسلمان پر اتنی عربی پڑھنا فرض ہے کہ جس سے وہ نماز اور قرآن کو سمجھ سکے۔

دوئم :۔ اظہارِ عبودیت۔ یعنی اے الٰہ العالمین ہم نے تیرا حکم سنا اسے سمجھا

اور اس کی اطاعت کا حتمی وعدہ کرتے ہیں۔ اس لیے نماز کے لیے خلوصِ نیت شرط ہے۔ یعنی یہ کہ اطاعتِ الٰہی کا عزم صمیم اپنے قلب میں پیدا کر کے خدا کے دربار میں حاضر ہونا۔

نفسیات کے ماہرین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اس سے ایک طرف تو توکل علی اللہ کی وجہ سے جماعت میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ناقابلِ تسخیر عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری جماعت فدائیت و فدویت کی اِس منزل پر پہنچ جاتی ہے۔ کہ وہ خدا کا ہاتھ بن جاتی ہے۔ اور مشیتِ ایزدی اس سے وہ کام لے سکتی ہے جو اسے حق پرست جماعت سے لینا منظور ہوتا ہے۔

سوئم: ۔قیامِ جماعت و اطاعتِ امام یا امیر۔ اس کے دور رس نتائج کا اعتراف دوست و دشمن دونوں نے کیا ہے۔ اور ہم اوپر کئی مثالیں بھی پیش کر آئے ہیں:

اِس لیے حدیث شریف میں صلوٰۃ کی عبارت کو روح سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ پھر اسے غایت الغایات فرمایا یا پھر فرمایا کہ

"قرۃ العینی فی الصّلوٰۃ" میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

قرآن حکیم نے بھی فرمایا:۔

واستعینوا بالصّبر والصّلوٰۃ : "اور ہر مشکل میں صبر اور صلوٰۃ سے
(البقرۃ) حق تعالیٰ کی مدد طلب کرو۔"

نماز با جماعت مسلمانوں کی زندگی کا پورا خاکہ پیش کرتی ہے۔ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی تشکیل کرتی ہے۔ اس کے لیے بہترین تربیت گاہ ہے۔ اتحاد و یگانگت اخوت و مساوات، جماعتی روح اور یک جہتی پیدا کرنے کے لیے یہ ایک عدیم المثال حربہ ہے:۔

Marfat.com

جماعت کی تشکیل ہو چکی۔ اب اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کی راہیں کھل گئیں اور وہ جماعتِ حقّہ تمام جماعتی اوصاف سے متصف ہو کر میدانِ عمل میں نکل آئی۔ اس کے لیے آمدنی کے ایک ایسے ذریعے کی ضرورت ہے جو نماز کی طرح تمام جماعتی فوائد پیدا کرے اور جماعت کی مالی ضروریات کا بھی کفیل ہو۔ اسے جماعتی اصطلاح میں "بیت المال" کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے زکوٰۃ اور مالی عبادات میں افضل ترین عبادت قربانی ہے۔ کیونکہ قربانی سے درحقیقت وہ روح پیدا ہوتی ہے۔ جو ہر قسم کے مالی ایثار اور زکوٰۃ کی محرک ہوتی ہے۔ کیونکہ قربانی اس بیعت کی تجدید و توثیق ہے جس کا ذکر ہم اوپر سورۃ توبہ والی آیت اِنَّ اللّٰہ اشتریٰ۔ الآیۃ کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ قربانی انسان کو حیاتِ اجتماعی کا وہ گُر سکھلاتی ہے۔ کہ اسلام کی ابتدا تو صلوٰۃ ہے۔ اور انتہا حضرت ابراہیمؑ کی چھُری اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن ہے۔ چنانچہ اسلام نے نماز کی طرح قربانی کو بھی اللہ کے لیے مخصوص کر کے اسے جماعتی رنگ دے دیا۔ جس سے نفسیاتی طور پر جماعت میں جماعتی قربانی کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا نماز اور قربانی انسانوں کو سکھلاتی ہے کہ وہ جئیں تو اللہ کے لیے اور مریں تو اللہ کے لیے۔

بالجملہ اس آیت نے اس امر کی توضیح کر دی کہ موجودہ زمانے میں بھی اسلامی جماعت کی تشکیل کن اصولوں پر ہونی چاہیئے۔ اگر مسلمان زندہ رہنا، دنیا میں سربلند و ممتاز ہونا اور اعدا پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ نماز اور قربانی کی روح کو تازہ کریں۔ اور ایک سچا اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خمِ طرۂ یارے گیرند

لیکن افسوس کہ اسلامی نظام کو قائم کرنے کی بجائے مسلمان اپنی تمام طاقتیں نظامِ باطل کی تقویت و تائید میں یا اس کی تقلید میں ویسی ہی جماعتیں بنانے میں صرف کر رہے ہیں۔ ان کی تمام جماعتیں کفار کی جماعتوں کا چربہ ہے۔ ان کا نظام کار وہی ہے جو کفار کی جماعتوں کا ہے۔ سیاسی، جماعتی اور اخلاقی نقطہ ہائے نظر بھی وہی ہیں جو ان جماعتوں کے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی مساعی بھی ویسے ہی برگ و بار لا رہی ہے جیسے ان کافرانہ جماعتوں کی مساعی۔ پھر یہ شکوہ کہ ہم مسلمان ہیں اور خدا کے برگزیدہ ہونے کے باوجود کیوں ذلیل ہو رہے ہیں۔

اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رُسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بت خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

جب مسلمان قرآن کی دعوت پر لبیک کہہ کر اپنی جماعتی زندگی کی قرآن حکیم کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق تعمیر شروع کر دیں گے اور قرآن و سنت ہی کو اپنا ہادی و رہنما تسلیم کر لینگے تو ممکن نہیں کہ وہ سربلند اور ممتاز نہ ہوں اور ان کا دشمن مغلوب ہو کر بالکل پامال نہ ہو جائے۔ اور یہی مفہوم ہے۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ "یقیناً تیرا دشمن ہی بے نام و نشان ہو جائیگا۔"

یہاں اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ شانئ سے کیا مُراد ہے؟ شانئ کے معنی جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، لغتِ عرب کے مطابق، بغض رکھنے والا۔ نفرت کرنے والا، دُشمن، بیری، عداوت رکھنے والا، کے ہیں۔ کیا اس لفظ کے تحت میں صرف کفار قریش مثلاً عقبہ بن ابی معیط۔ عاص بن وائل۔ ابو لہب، ابوجہل وغیرہم ہی شامل ہیں یا اس کا اطلاق بہت وسیع ہے۔

Marfat.com

یہ ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کی چہار گونہ طاقت کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے میں ان کفارانِ قریش کی طاقت کو تو اس آیت کا پلڑا بہت بھاری رہے گا۔ اور جیسا کہ ہم اوپر تصریح کر آئے ہیں۔ کسی آیت کا شانِ نزول خاص ہو سکتا ہے لیکن اس کا حکم عام ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ خود قرآن حکیم اس کے معنی کی تحدید نہ فرمائے۔ یہاں تحدید کا کوئی خاص قرینہ موجود نہیں۔ اس لیے اس آیت کا مفہوم بالکل عام ہے۔ اور اس کا اطلاق آپ صلعم کے تمام اعدا اور مخالفین پر ہوتا ہے۔ گویا اس سورۃ مبارکہ میں آپ کے تمام دشمنوں کی مکمل تباہی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اور یہ اعلان صرف آپ کی حیاتِ مبارکہ تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ اسی میں بطور ایک حتمی واقعہ کے یہ بتلایا گیا ہے کہ اب بقائے دوام کی صرف ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ محمد رسول اللہ صلعم کے اتباع کی راہ ہے اور تا قیامِ قیامت اللہ کا عذاب آپ کے دشمنوں کو عاص بن وائل، ابولہب، ابوجہل وغیرہم کی طرح ملیامیٹ کرتا رہے گا اور آپ کا نام نیک ایسا بلند ہوگا اور آپ کی عزت اس درجہ بڑھے گی کہ دوست دشمن سب تسلیم کریں گے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کیونکہ آپ کے ذکرِ جمیل کو جو رفعت نصیب ہوئی۔ وہ آج تک کسی پیغمبر، کسی بادشاہ، کسی مصلح، کسی فلسفی یا سپہ سالار کو نصیب نہیں ہوئی۔

دنیا میں بہت سے بانیانِ مذہب گزرے ہیں جن کے پیروؤں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ لیکن ان میں سے نہ تو کسی کی صحیح تعلیمات اور نہ ہی کسی کے صحیح حالات ہم تک پہنچے ہیں۔ برخلاف اس کے ہمارے ہادیٔ برحق صلعم کی تعلیمات بحرفہٖ من وعن موجود ہیں اور آپ کے حالات اس قدر صحت اور تفصیل

سے محفوظ ہیں۔ کہ ایک انگریز مصنف بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ:

"محمدؐ دنیا کے معروف ترین انسان ہیں"۔ (محمدؐ اینڈ محمڈ ازم۔ باسورتھ سمتھ)

پھر دیکھیے کہ لاکھوں مساجد ہیں کیونکر روزانہ پانچ وقت

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰه ؕ

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں"

کی آواز بلند ہو کر آپ کی رفعتِ شان اور آپ کے دشمنوں کی ناکامی اور تباہی کا اعلان کرتی ہے۔ آپ کا نام نامی جب لیا جاتا ہے تو ہر مسلمان اسے سنکر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتا ہے۔ آپ کی نعت ہر منبر پر، ہر مسلم واعظ کی زبان پر، ہر مسلم مصنف کے قلم پر جاری ہے۔ ہر زمانے میں بڑے بڑے جادو بیان شعراء نے آپ کی تعریف اور مدحت کیلیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔

حضرت حسان بن ثابت فرماتے ہیں:۔

وشق لہ من اسمہ لیجلہٗ　　فذو العرش محمودٌ وھذا محمدٌ

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے دو حصے کر کے اس کا نام رکھا، تاکہ اسے روشن کرے کیونکہ عرش کا مالک محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔"

یہی نہیں، بلکہ آپؐ کا ہر امتی جو نیکی بھی کرتا ہے، مثلاً نماز پڑھتا ہے۔ روزہ رکھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے۔ علم کی تحصیل کرتا ہے۔ یا تعلیم دیتا ہے۔ خیرات وصدقات دیتا ہے۔ یا مالی عبادات بجالاتا ہے۔ الغرض توکل یا خشیت و انابت یا تقوٰی یا محبت و معرفتِ الٰہی میں سرشار ہو کر وہ کسی قسم کا نیک کام کرتا ہے تو جہاں اسے ہر نیکی کا دس گنا اجر ملتا ہے۔ وہاں رسول اکرم صلعم کو بھی اس کے برابر اجر ملتا ہے اس لیے آپؐ کے لیے نہ صرف دنیا میں ہر وقت ازدیادِ عزت ہے بلکہ اخروی مدارج میں

Marfat.com

بھی ہر وقت اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب ہم اس کا فیصلہ حق و انصاف پر چھوڑتے ہیں کہ کیا اس سے زیادہ رفعتِ ذکر کسی کے وہم و گمان میں آ سکتی ہے؟۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ آپ کے خُدّام اور متبعین کو جو غیر فانی شہرت نصیب ہوئی۔ وہ بڑے سے بڑے بادشاہوں کے حصے میں نہیں آئی۔

ایک جرمن مورّخ (Dentseh) نے لکھا ہے کہ:۔

"بلال حبشی دنیا کی تاریخ میں سکندرِ اعظم سے زیادہ مشہور و معروف ہیں"

اقبال علیہ رحمۃ نے اسی واقعہ کو ایک بہت ہی خوبصورت قطعہ میں نظم کیا ہے جس کا مطلع اور مقطع نقل کرنے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے ۔۔۔ اہلِ قلم نے جس کا بہت احترام تھا
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے ۔۔۔ رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

اس امر کا ثبوت آنحضرت صلعم کی بعثت کے بعد کامیابی و کامرانی کا انحصار آپ ہی کے اتباع میں ہے۔ اور کوئی شخص بھی خواہ وہ کافر ہو، مسلم ہو، عیسائی ہو یا یہودی، دہریہ ہو یا کمیونسٹ۔ جب تک وہ دانستہ یا نادانستہ ان اصولوں کی پیروی نہیں کرے گا جو آنحضرت صلعم نے بنی نوعِ انسان کی فلاح و نجات کے لیے پیش کیے ہیں، ترقی نہیں کر سکتا۔ تاریخ کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ اسلام کے بعد جتنی اصلاحی تحریکیں مختلف مذاہب میں شروع ہوئیں ان سب کی تہ میں اسلام کا اور آنحضرت صلعم کا اثر کام کر رہا ہے۔ چنانچہ لوتھر کی پوپ کے خلاف بغاوت اور پروٹسٹنٹ مذہب کی تحریک اسلامی تعلیمات سے متاثرہ تھی۔ اسی لیے پوپ نے جب لوتھر کے خلاف اس کے ملحدانہ خیالات کی بنا پر کفر و الحاد کا فتویٰ دیا تو اسے "محمدی کتا" کا خطاب دیا گیا۔ ہندوستان میں

(   ) بھگت کبیر اور باوا گرونانک کی مصلحانہ تحریکات براہِ راست اسلام سے ماخوذ تھیں۔ باوا گورونانک صاحب کے جبّے کے ارد گرد سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص اور آیۃ الکرسی کڑھی ہوئی ہے اور گرنتھ صاحب میں جابجا لکھا ہے کہ "کلمہ محمدی کے بغیر انسان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہو سکتا۔"

راجا رام موہن رائے نے کلکتہ میں جب اپنی اصلاحی تحریک "برہمو سماج" شروع کی تو ان پر پنڈتوں نے سب سے بڑا الزام یہی لگایا کہ "یہ مسلمان ہوگیا ہے اور اسلام کی بدعات ہندو مذہب میں رائج کرتا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انگلستان میں مخلصین (   ) کی تحریک۔ امریکہ میں مارمن (mormon) اور ایران میں "بہائی تحریک اسلام ہی کی کنوڈی ہیں۔ پچھلی صدی کی میڈم بلیوٹسکی۔ (Madam Blavatsky) کی تھیاسفی کی تحریک پر اسلامی اثر اس قدر نمایاں ہے کہ اس سے کوئی صاحبِ بصیرت انکار نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ہندوستان کی آخری اصلاحی تحریک "یعنی آریہ سماج" نے اصولِ توحید وغیرہ اسلام ہی سے لیے اور انہیں ہندو مذہب کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامنے کے لیے استعمال کیا۔ چنانچہ آریہ سماج کے موجودہ زمانے کے سب سے بڑے پرچارک سوامی شردھانند نے خود راقم الحروف سے میرے ایک سوال کے جواب میں کہ انھوں نے کیوں "شدھی" کا فتنہ کھڑا کیا ہے؟ کہا کہ "کون کہتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو شدھ کرتے ہیں، مسلمان تو مجسم شدھ ہوتا ہے۔ ہم نے تو توحید خود اسلام سے سیکھی ہے۔ اس لیے ہم مسلمانوں کو کیوں کر توحید کا درس دے سکتے ہیں۔ ہم تو اُن نام نہاد مسلمانوں کو شدھ کرتے ہیں جن کا ہر گلی میں ایک خدا ہے۔"

اب سیاسی اور علمی تحریکات ہی کو لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انگلستان

میں کنگ جان (Renaissance) کا مل طور پر اسلام اور اندلسی عربوں کی تعلیمات اور اثرات کا نتیجہ تھی۔ اسلام نے ہی یورپ کے دورِ مظلمہ کا خاتمہ کیا اور بقول مورخ لیکی (Lecky) اسلام نے ہی یورپ کو شائستہ اخلاق اور شاعری سے روشناس کرایا۔ اکثر مغربی مورخین مثلاً ڈاکٹر ڈریپر (Draper) نے اپنی مشہور کتاب "یورپ کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ" (The History of Intellectual) میں موسیو لی بان نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "تمدنِ عرب" میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ "آنحضرت صلعم کی تعلیمات کے اثرات آپؐ کے بعد کی تمام مذہبی اور سیاسی اور علمی تحریکات پر نقش ہیں اور انسانی تاریخ میں کسی شخص نے بھی ایسا گہرا اور ان مٹ نقش نہیں چھوڑا جیسا کہ آنحضرت صلعم نے۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلعم کا دور تاریخ میں بمنزلہ ایک ایسے دور کے ہے جس نے انسان اور اس کی ترقی کی روش ہی کو بدل ڈالا اور انسانی تہذیب و تمدن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر آپ صلعم کا نقش ثبت نہ ہو۔ ہم نے بخوفِ طوالت ان کتابوں سے اقتباس کیا ہے۔ ورنہ ہم اپنے مقصد سے بہت دور جا پڑتے۔

غرض اللہ تعالیٰ کی اس پیشین گوئی کی صداقت کا اعتراف تاریخ کا ہر ورق کر رہا ہے کہ دنیا کی سیادت و امامت حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے لیے مخصوص ہے اور دنیا کی کوئی قوم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قیادت سے بے نیاز ہو کر ترقی نہیں کر سکتی۔ اور البتہ دنیا نادانستہ آپ ہی کے نقشِ قدم پر چل کر بڑھ سکتی ہے جس طرح دنیا کا کوئی انسان یا قوم قوانینِ طبعی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور چار و ناچار انہیں کی پیروی کرتا ہے

اسی طرح محمد الرسول اللہ صلعم کے تبلائے ہوئے مدنیت کے اصول و قوانین حقائق ابدی ہیں اور فطرت کے روحانی یا اخلاقی قوانین (SRIOAL ORMORAL LAWS) ہیں جن کی متابعت ہر قوم کے لیے چار و نا چار ضروری ہے۔ اور جو قوم ان سے اعراض کرتی ہے۔ وہ خود اپنی تباہی کے سامان پیدا کرتی ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطون

اگر موجودہ زمانہ کی تحریکات کو لیا جائے۔ تو جو تحریکیں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ ان میں گاندھی جی کی اہنسا کی تحریک ہے۔ جس میں انھوں نے موجودہ مغربی نظام کو شیطانی نظام قرار دے کر اس کے خلاف بغاوت کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "ہند سوراج" (INDIAN SWARAJ) میں انھوں نے اس امر کی صاف تصریح کی ہے۔ کہ حضرت محمدؐ کی تعلیم سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ موجودہ نظام ابلیسی نظام (SATANIC SYSTEM) ہے۔ پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو جاتے وقت آپ سے پوچھا گیا۔ کہ آپ اکیلے کیوں جا رہے ہیں تو آپ نے کہا کہ "میں قرآن، گیتا اور "سیرالنبی" مصنفہ مولانا شبلی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ محمد (صلعم) میری ہر مشکل میں رہنمائی کریں گے۔

اسی طرح ۱۹۳۵ء میں جب کانگریسی وزارتیں برسر اقتدار آئیں۔ تو انھوں ایک مکتوب مفتوح میں تمام وزرا کو نصیحت کی کہ۔

"رام اور بکرماجیت کی حکومتیں تو اب افسانہ بن چکی ہیں اسلیے میں تم سے نہیں کہتا کہ تم رام اور وکرماجیت کی پیروی کرو بلکہ میں تم سے یہ کہوں گا کہ تم ابوبکر اور عمر کو مشعل راہ بناؤ جن سے

بہتر حکومت آج تک کسی نے نہیں کی۔" (انتہیٰ الملخصاً)

اور ابوبکر و عمر کون تھے؟ — محمد الرسول اللہ کے خدام۔

ہندوستان میں ایک اور نئی تحریک چلی، جسے "مہر بابا کی تحریک" کہا جاتا تھا۔ مہر بابا کی تحریک براہِ راست مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر ہوئی۔ اور گو ان کے مرید اسے تسلیم نہ کریں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مہر بابا برسوں درود شریف کا ورد کرتے رہے اور اس کی بدولت انھیں تھوڑی روشنی حاصل ہوئی۔

اب روس ہی کو لیجئے کارل مارکس کی تعلیمات اور لینن کی تصریحات پر اسلام کا اثر بالکل صاف ہے۔ چنانچہ لینن کے بہت بڑے معتقد (RADLAY) نے کہا کہ — "ہم لینن کی سب سے بڑی تعریف یہ کر سکتے ہیں کہ اسے بیسویں صدی کا محمد کہیں۔"

پھر وہی مصنف لکھتا ہے:-

"محمد کا سب سے بڑا تعمیری دماغ (CONSTRUCTIVE BRAIN) تھا۔"

روسی نظام نے نکاح اور طلاق کے مسئلوں میں شروع شروع میں بہت سخت ٹھوکر کھائی تھی اور آزادی کے جنون میں نکاح کو معاشرت انسانی کیلئے غیر ضروری ٹھہرایا تھا، مگر بہت جلد روسی حکومت کو بھی وہی قانون نکاح و طلاق نافذ کرنا پڑا جو اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے نافذ فرمایا تھا خود عیسائی اور ہندو مجبور ہو گئے تھے کہ نکاح و طلاق کے اسلامی قوانین کو ایک حد تک اپنائیں ورنہ ان کی سوسائٹی بالکل برباد ہو جاتی۔ یورپ کی ہر دل عزیز تحریک مساوات (ڈیموکریسی) کے بنیادی اصول وہی ہیں جو اسلام نے چودہ سو سال پہلے پیش کیے تھے۔ لیکن ان سب انقلابوں کی مثال انگریزی کی اس مشہور

کہانی کی ہے جس میں لکھا ہے کہ "ہندوستان کے چھاندوں کو تحصیلِ علم کا شوق ہوا اور انھیں خیال آیا کہ چلو ہاتھی کا مطالعہ کریں۔ چنانچہ ایک نے ہاتھی کے کانوں کو دیکھا تو پکار اُٹھا کہ "ہو نہ ہو ہاتھی تو پنکھوں کی طرح ہے" دوسرے نے اس کے سر کو دیکھا تو کہا کہ "ہاتھی بڑی گیند کی طرح ہے" غرض سب نے ہاتھی کے ایک ہی حصّے کو دیکھا اور اسے کافی سمجھ کر ہاتھی کے متعلق قیاس آرائیاں شروع کیں۔ اسی طرح ان تمام تحریکات نے اسلام کے کسی نہ کسی حصّے یا پہلو کی ناقص تقلید کی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں بعض منکرین اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ ذہنی انتشار اور قومی فاخرۃ کو بھی محمد رسول اللہ صلعم ہی کی قیادت دور کر سکتی ہے۔ برنارڈ شا (BUR NORD SHAH) نے اعلانیہ اس امر کا اعتراف کیا ہے ہے کہ دنیا کی موجودہ انار کی علاج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) ہے۔

قصّہ مختصر، محمد رسول اللہ صلعم کے بعد ہر قوم یا فرد کے لئے جو ترقی چاہتا ہو محمد رسول اللہ کا اتباع کسی نہ کسی سورت میں ناگزیر ہے۔ اور جس جس حد تک کوئی قوم آپ کی پیروی کرے گی اسی اسی حد تک وہ ترقی کرتی جائے گی اور اس میں ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی، گبر و کافر کسی کی تمیز نہیں۔ یہ نہیں کہ اگر کسی شخص کے ماتھے پر مسلمان کا لیبل لگا ہے تو وہ دنیا کی سرداری کا حق دار ہو جائے گا۔ نہیں ۔ دنیا کی سرداری تو ان اصولوں کے اتباع میں مضمر ہے جو ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد صلعم نے بتائے ہیں۔
اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

عدل ہے خاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور

Marfat.com

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

یہاں ایک اور امر کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس آیت نے بنی نوع انسان کے لیے رد و قبول کا بھی ایک قطعی معیار مقرر کر دیا ہے۔ یعنی کہ جس امر کو، زندگی کے جس نظریے کو آنحضرت صلعم نے مردود قرار دیا ہے وہ قابل رد ہے اور جسے آپ نے مستحسن قرار دیا قبول فرمایا وہ قابل قبول ہے اور یہی معنی ہیں

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاٰخر وذکر اللہ کثیرا ط
(الاحزاب - ع ۳)

تم میں سے جس شخص کو خدا سے ملنے کی امید ہے اور روز آخرت پر یقین ہے اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے اس کے لیے رسول اللہ (کے اعمال و افعال) میں نیک نمونہ ہے۔

گویا دنیا میں رسول کریم صلعم کے اعمال میزان حق و اعتدال ہیں اور ان کا اتباع ہر حال میں مفید و مستحسن ہے۔ آپ کے علاوہ کسی شخص کے ذاتی تجارب (یا کردار اسی حد تک قابل قبول ہیں جس حد تک کہ وہ آپ کے اعمال و کردار کے تابع ہیں۔ مثلاً ایک عمل ہم خود کرتے ہیں اور ہمیں اس میں بہت سے فوائد معلوم دیتے ہیں۔ یا ہم دیکھتے ہیں کہ فلاں صوفی یا فلاں عالم، یا فلاں امام یا فلاں شیخ طریقت فلاں فعل کرتے ہیں اور ان کے زہد و تقدس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے ان کا وہ فعل محمود اور قابل قبول ہے۔ تو ہمیں علم ہونا چاہیے کہ اپنا تجربہ یا عمل بالکل بے حقیقت اور امام یا صوفی یا عالم یا شیخ طریقت کا فعل قابل حجت نہیں۔ جب تک وہ محمد رسول اللہ صلعم کی سنت کے مطابق نہ ہو۔ بسا اوقات وہ افعال عارضی طور پر تو مفید ہوتے ہیں لیکن انجام کار تباہی کی طرف

Marfat.com

لے جاتے ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانے کی ایک عام گمراہی کو ہی لیجئے۔ ایک شخص قبروں پر مراقبہ کرتا ہے اور اسے اس کے زعم میں روحانی فیوض حاصل ہوتے ہیں اور کتابوں میں لکھا ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں بزرگ کی قبر پر بیٹھ کر مراقبہ کیا۔ اب ہم دیکھیں گے کہ، کیا آں حضرت صلعم نے بھی کسی قبر پر مراقبہ کیا ہے؟ یا آپؐ نے کسی صحابی کی کسی قبر پر مراقبہ کرنے کی ہدایت فرمائی؟

اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ فعل مردود ہے اور کسی حالت میں بھی موجب ثواب نہیں اور بظاہر جو روحانی فیوض ان کو حاصل ہوتے ہیں ان کی خدا کے ہاں کوئی وقعت نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

فَلَا نُقِیمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَزْنًا (الکہف ع-۱۳)

ہم ان کے اعمالِ صالحہ کو قیامت کے دن وزن سے محروم کردیں گے۔

یعنے جب ان کے وہ اعمال جنھیں وہ صالح سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ تولے جائیں گے تو ان کا کچھ بھی وزن نہ ہوگا۔ اسی کو اکارت جانا یا حبط ہونا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرات شیعہ سینہ کوبی کرتے یا تعزیہ داری کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے اِن رسوم سے ان کے گناہ بخشے جائیں گے۔ انھیں بھی سوچنا چاہیئے کہ کیا نبی کریم صلعم نے بھی کبھی سینہ کوبی کی یا کسی کو سینہ کوبی کی اجازت دی یا تعزیہ یا اس قسم کے افعال کی رخصت عطا فرمائی۔ جب اس کا جواب نفی میں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ سب اعمال مردود و نامقبول ہیں۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ انشاء اللہ

گویا ہمیں نیک و بد (Good And Avil) کی ایک بے خطا کسوٹی ہاتھ آگئی ہے۔ اور وہ آنحضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ ہے۔ فھل من مدکر۔

Marfat.com

اب ذرا آنحضرت صلعم کے دشمنوں پر غور کیجئے کہ وہ کون بدبختِ ازلی ہے جو اس وعید میں داخل ہوتا ہے اور جس کے لیے تباہی و نامرادی مقدر ہو چکی ہے۔

اس امر کو سمجھنے کے لیے کہ کون شقی ازلی آپ کا دشمن ہے، سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے کہ رؤسائے قریش کو بھی آپؐ کی ذات سے دشمنی نہ تھی۔ کیونکہ نبوت کے دعوے سے پہلے آپؐ قریش میں بہت معزز و محترم خیال کیے جاتے تھے۔ آپؐ کی امانت و دیانت مُسلّم تھی۔ آپؐ کی صداقت و وعدہ وفائی مشہور تھی چنانچہ عرب آپ کو الامین اور الصادق کے معزز القاب سے یاد کرتے تھے۔ اور نبوت کے بعد بھی کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ آپ کو کسی عیب سے متہم کرے یا آپ کے اعلیٰ اخلاق سے کوئی انکار کر سکے۔

چنانچہ تمام مؤرخین و محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عین اس وقت بھی جب کفارِ قریش آپؐ کے قتل کی سازش کر رہے تھے۔ ان کی امانتیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ہی رکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہجرت کے وقت آپؐ نے حضرت علیؓ کو مامور فرمایا کہ تمام امانتیں ان کے حوالے کر کے مدینے حاضر ہوں۔

کفار کی تمام تر دشمنی آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم سے تھی۔ ان کا عناد قرآن حکیم کے مجوزہ نظامِ زندگی سے تھا، جسے قرآن حکیم رائج کرنا چاہتا تھا جس میں ان کے خودساختہ رسم و رواج کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کا بغض شریعتِ مقدسہ سے تھا۔ انھیں توحید، اخوت اور مساوات کی تعلیم سے نفرت تھی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے جابجا اس امر کی تصریح کی ہے:۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا "کیا اس (پیغمبر) نے اتنے خداؤں کی جگہ

انّ ھٰذا لشیءٌ عجاب ٥ (ص - ع - ۱) — ایک خدا کی بندگی مقرر کر دی یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔"

چنانچہ کتب سیرۃ و حدیث میں مذکور ہے کہ رؤسائے قریش کا ایک وفد ایک دفعہ ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے کہا کہ "بھائی! تم اپنے بھتیجے سے اس نئے دین کی تبلیغ سے روک دو۔ کم از کم اس سے یہی کہو کہ ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا نہ کہے اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہو تو تم اس سے اپنی امان ہی اٹھالو"

ابو طالب نے آنحضرت کو بلا کر سمجھانے کی کوشش کی تو آپؐ نے فرمایا کہ "اے چچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب رکھدیں اور کہیں کہ تم اپنے دین کی تبلیغ سے باز آجاؤ۔ تب بھی میں اپنے دین کی تبلیغ سے باز نہیں آؤنگا یہاں تک کہ اللہ کوئی دوسرا حکم نازل کر دے یا میری جان چلی جائے — آپ بے شک اپنی امان اٹھا لیجیے، مجھے خدا کی امان کافی ہے۔"

قرآن حکیم میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

بل عجبوا ان جاءھم منذرٌ منھم فقال الکافرون ھٰذا شیءٌ عجیب ٥ (ق - ع) — "بلکہ یہ (منکرین) اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ انہی میں کا ایک آدمی ان کی طرف (خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا بن کر آیا۔ امیر یہ (منکر) کہنے لگے کہ یہ تو بہت تعجب کی بات ہے۔"

اس سے صاف ثابت ہوا کہ کفارِ قریش کو آپؐ کی تعلیم سے ہی دشمنی تھی اور وہ اسی کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ پس شانئیک میں ہر وہ شخص داخل ہے جو آپ کی قولاً یا عملاً مخالفت کرے اور آپؐ کا دشمن وہی ہے جو آپؐ کی تعلیم کا دشمن ہے۔

یہاں ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت اور مخالفت کے بین بین کوئی تیسری چیز نہیں۔

یا تو انسان آپ کا مطیع و منقاد ہو سکتا ہے۔ یا آپؐ کا مخالف و معاند۔ ہر شخص جو آپ صلعم کی اطاعت سے منہ موڑتا ہے۔ آپؐ کا دشمن ہی کہلائے گا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ
مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ
غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ
مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ
مَصِيرًا ۝ (النساء۔ع ۱۷)

"اور ہدایت کے ظاہر ہو چکنے کے بعد جس نے رسول کو ایذا پہنچائی اور مومنوں کے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا تو ہم اسے جس طرف وہ پھر رہا ہے پھیر دیں گے اور اسے جہنم میں پہنچا دیں گے اور وہ تو بہت برا ٹھکانہ ہے"۔

یعنی مومنوں کے راستے سے انحراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کے مترادف ہے۔ پھر جگہ جگہ اس امر کی تصریح فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عین ایمان ہے۔ اور جس شخص نے بھی آپ کی اتباع یعنی آپ کے تجویز کردہ راستے سے انحراف کیا وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا
لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

اور ہم نے جو رسول بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔

پھر فرمایا:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا
مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا
(النساء۔ع)

تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ ایمان نہیں لا سکتے جب تک کہ اپنے تنازعات میں تمہیں حکم نہ بنائیں اور جو تمہارے فیصلے کے خلاف اپنے دل میں تنگی نہ پائیں اور تمہارے سامنے گردن جھکا دیں

یعنی آپؐ کی مخالفت کا دل میں خیال لانا بھی انسان کو ایمان کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔ آپؐ کی اطاعت ہی اصل ایمان ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(آل عمران-ع)

اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ کی محبت کا دعوٰی کرتے ہو تو میری اطاعت کرو (پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اور اللہ بہت زیادہ بخشنے والا مہربان ہے"

پھر فرمایا:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

(النساء ۱۵۷)

"اور (دیکھو) یہ میری سیدھی راہ ہے بالکل سیدھی راہ۔ پس اسی ایک سیدھی راہ پر چلو۔ اور طرح طرح کے راستوں کے پیچھے نہ پڑو۔ وہ تمہیں خدا کی سیدھی راہ ہٹا کر جدا جدا کر دیں گے"

گویا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت اور مخالفت کے بین بین کوئی راہ نہیں۔ جو شخص بھی آپ کے بتلائے ہوئے راستے سے انحراف کرتا ہے وہ ضرور تشتّت اور افتراق کا شکار ہوگا اور انجام کار تباہ و برباد ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ (النساء-ع)

اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے گا تو اللہ اسے جہنم میں داخل کریگا۔ جس میں

Marfat.com

وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔"

پھر فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَ
رَسُوْلَہٗ کُبِتُوْا کَمَا کُبِتَ الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِہِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ
بَیِّنٰتٍ ط وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ
مُّہِیْنٌ o (المجادلہ۔۵)

"یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی
مخالفت کریں گے وہ اسی طرح ذلیل و
خوار ہوں گے۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگ
ذلیل و خوار ہوئے۔ اور ہم نے تو کھلے کھلے
احکام نازل فرما دیئے ہیں۔ اور ہماری
تعلیم کے منکروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔"

ان دونوں آیتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جس جماعت یا فرد نے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے انحراف کیا وہ جلد یا بہ دیر ضرور ذلیل و خوار ہو گا۔ امن و سلامتی، اخوت و مودت کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی دنیوی اور اُخروی فلاح و بہبود مضمر ہے اور آپ کی مخالفت دونوں جہانوں میں تباہی و بربادی اور خسران کی طرف لیجانے والی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْہِ
یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا o یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ
فُلَانًا خَلِیْلًا o لَقَدْ اَضَلَّنِیْ
عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ ط وَکَانَ الشَّیْطٰنُ
لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا o وَقَالَ الرَّسُوْلُ
یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ہٰذَا الْقُرْاٰنَ

اور جس دن ظالم کف افسوس ملتا ہوا اپنی
انگلیاں کاٹے گا اور کہے گا ہائے افسوس
کاش میں رسول کے راستے کی پیروی
کرتا۔ ہائے افسوس مجھ پر کاش میں
فلاں (گمراہ آدمی) کو اپنا دوست
نہ بناتا۔ اس نے نصیحت کے آنے کے بعد مجھے

مَهۡجُوۡرًا ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيۡرًا ۝ (الفرقان-ع)

مجھے اس سے برگشتہ کر دیا اور شیطان تو واقعی انسان کو ذلیل و رسوا ہی کرتا ہے اور رسول (اللہ کی جناب میں عرض کریں گے) اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور اسی طرح ہم نے مجرم لوگوں کو نبی کا دشمن بنا دیا ہے اور تمہارا پروردگار ہی ہدایت کرنے کے لیے اور مدد کے لیے کافی ہے"۔

یہ آیت ایسی صاف اور واضح ہے کہ انسان اطاعت اور عداوت کے درمیان کوئی راہ اختیار بھی نہیں کر سکتا۔ یا تو وہ نبی کا کامل مطیع و منقاد ہو۔ ورنہ اس کا شمار دشمنانِ رسول کے زمرے میں ہوگا۔ محبت یا عداوت کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ اور کذالک جعلنا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنتِ مستمرہ ہے کہ جو لوگ اس کے انبیاء اور رسولوں کی تعلیمات سے اعراض کرتے ہیں اور اطاعت سے انحراف کرتے ہیں وہی دشمنانِ خدا و رسول قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ يُوۡحِىۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ۝ (الانعام-ع)

"اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے بہت سے شیاطین ہر نبی کے دشمن بنائے جو ایک دوسرے کے دلوں میں اپنی چکنی چپڑی باتوں سے وسوسہ ڈالتے رہتے ہیں"۔

يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ (النساء ع)

"اس دن وہ لوگ جو کافر ہیں اور انہوں نے رسول کی نافرمانی کی ہوگی۔ خواہش کریں گے کہ، اے کاش! ہم زمین میں سما جائیں"۔

جب انسانوں کی دو قسمیں ہوگئیں۔ (۱) انبیاء اور ان کی شریعت کے متبعین اور (۲) انبیاء کے مخالفین اور دشمن۔ تو اب خدائی فیصلہ صادر ہوگیا۔ ہر قسم کی کامیابی اور کامرانی۔ دنیوی اور اُخروی فلاح و سعادت غرض ہر قسم کی بھلائی متبعین و پیروانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہوگئی۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ — اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ صادر فرمادیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب ہوں گے (اور ہمارے دشمن مغلوب اور تباہ ہوں گے)۔

اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ — سُن لو! یقیناً اللہ کی جماعت ہی کامیاب و کامران ہوگی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے حصے میں ہر قسم کی نامرادی، بربادی، ضلالت و شقاوت آئی۔ اور ان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہوگئیں۔

اَلَا اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ — سن لو! یقیناً شیطان کی جماعت بالآخر تباہ و برباد ہوگی۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (النور ع ۱)

"پس چاہیے کہ جو لوگ رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں وہ ڈریں کہ اس وجہ سے وہ کسی فتنے میں نہ مبتلا ہو جائیں یا ان پر کوئی عذاب الیم نہ نازل ہو جائے۔"

اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت خواہ وہ کسی بات میں بھی ہو انسان کو ہمیشہ عذاب الیم میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس کا نتیجہ بجز خسران اور تباہی ہوتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت

Marfat.com

ہر قوم اور فرد کو ضرور بالضرور ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے:

الکفر مِلۃٌ وّاحدۃ والاسلام ملۃ واحدۃ۔

"کفر ایک ملّت ہے اور اسلام ایک ملّت ہے۔"

ان دونوں کا اجتماع محالات سے ہے۔ کوئی قوم یا فرد رسول کریم صلعم کی کامل اطاعت اور مخالفت کے درمیان کوئی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:۔

اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذِ گُل
یا سراپا نالہ بن جایا نوا پیدا نہ کر

لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ جس طرح اطاعت اور اس کے نتائج یعنی ہدایت وسعادت کے مدارج ہوتے ہیں۔ اسی طرح تعلیمِ الٰہی کی مخالفت اور معصیت کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ اور جس طرح ہدایت وسعادت کے ابتدائی منازل سے ترقی کر کے انسان سعادت وہدایت کی معراج حاصل کر سکتا ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ کے نقشِ قدم پر چل کر کمالِ انسانیت حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طرح تعلیم الٰہی کی مخالفت ومعصیت کے ابتدائی مدارج سے شقاوت وضلالت کے انتہائی مدارج کی راہ بھی کھل جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ واللّیل میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی
وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی

ترجمہ:۔ سو جس نے راہِ خدا میں خرچ کیا اور اللہ سے ڈرا اور (تعلیم الٰہی) اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس پر آسانی کی راہ (یعنی لازوال ترقی کی راہ) آسان کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروائی (تعلیم الٰہی سے) اختیار کی اور (تعلیم الٰہی) اچھی

بات کو جھٹلایا تو ہم بھی تنگی کی راہ کو اس کے لیے آسان کر دیں گے۔ یعنی وہ اپنی بدعملی کی وجہ سے زیادہ ہی زیادہ تباہ ہوتا جائے گا۔

قصہ مختصر جب انسان ایک دفعہ رسول کی مخالفت شروع کر دے تو اگر وہ توبہ و انابت سے معصیت کا دروازہ بند نہ کرے۔ اطاعت کی راہ اختیار نہ کرے تو اس کی کامل تباہی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر ایسی منزل آجاتی ہے کہ نیکی اور سعادت کی سب راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں۔ وہ زندہ رہتا ہے تو شقاوت کے لیے۔ اُس کے تمام اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ اُس کا دل سُوجھ بوجھ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں تو وا ہو جاتی ہیں، لیکن بصارت سے محروم۔ اس کے کان ہوتے ہیں، لیکن حق کی آواز سننے اور اس سے متاثر ہونے سے قاصر۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا	"ان کے دل ہیں مگر وہ سمجھتے بوجھتے نہیں
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَ	ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھ
لَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا	نہیں سکتے۔ ان کے کان ہیں مگر ان سے سن
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ	نہیں سکتے۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (الاعراف)	ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ وہ وہی غافل ہیں۔

ان کے تمام اعمال سب اکارت جائیں گے۔

الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	وہ عبادت کریں گے مگر وہ [illegible]
وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ	موجب نہ ہوگی۔ وہ لوگ دنیا میں [illegible]
صُنْعًا (الکہف)	اور اچھے طرح کیوں نہ ہوں مگر ان کا [illegible]

بالکل اکارت جائے گا۔ اور انہیں سوائے رسوائی اور خسران کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

یہ ہے سزا ان لوگوں کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے منکر یا مخالف

Marfat.com

ہیں اور آپ کی شریعت کے کسی حصے سے بغض رکھتے ہیں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اپنے مشائخ اور پیروؤں اور اماموں کے اتباع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ اس وعید میں داخل ہیں جو اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (النور)

آمدیم بر سر مطلب۔ سب سے پہلا اور انتہائی درجہ شقاوت کا تو جمود و انکار ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض کی انتہا یہ ہے آپ کی لائی ہوئی شریعت کا انکار کیا جائے قرآن کو اساطیر الاولین قرار دیا جائے۔ اسے جادوگر یا کاہن کا قول کہا جائے۔ ایسے لوگوں کی محرومی اور بدبختی زیادہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر نیکی اور سعادت کی تمام راہیں مسدود فرما کر شقاوت و محرومی کی سب راہیں کھول دیتا ہے جو انھیں کامل تباہی اور بربادی کی طرف لے جاتی ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى (اللیل)

"پس اب جس نے بخل کیا اور تکبر کیا اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کے لیے تنگی کی راہیں آسان کردیں گے اور جب وہ برباد ہونے لگے گا تو اس کا مال اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔"

وَاُتْبِعُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ (ہود ع)

"اور اس دنیا میں قیامت کے دن بھی لعنت اس کا پیچھا کرے گی۔"

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(الانعام ع ۵)

"پھر ظالموں کی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی اور اعلان کیا گیا کہ اللہ کا شکر ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔"

وَلَا يُرَدُّ بَاسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (الانعام ع)

"اور اُس کا عذاب مجرموں سے نہ ٹل سکے گا۔"

اس کے نیچے شقاوت کے کئی مدارج ہیں۔ لیکن ان کا ماحصل یہی ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے جس قدر انحراف کرتا ہے وہ اسی قدر شقی اور راندۂ درگاہ ہوتا ہے۔ الاقرب فالاقرب

مگر یہ خیال کرنا کہ شقاوت کے یہ سب مدارج صرف کفار اور غیر مسلموں تک ہی محدود ہیں، کمال نادانی اور قرآن حکیم کی تعلیمات سے کمال بے خبری کی دلیل ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم ناموں کی پرستش نہیں سکھلاتا۔ بلکہ اس کے نزدیک انسان کو پرکھنے کی کسوٹی صرف اس کا عمل ہے۔ اگر ایک شخص پورے زور شور سے کلمہ پڑھتا ہے۔ عبادات بجالاتا ہے مگر معاملات اور دوسرے اعمال میں رسول کی اطاعت سے انحراف کرتا ہے تو اس کا شمار اعدائے رسول صلعم میں ہوگا۔ گو وہ اس سے بے خبر ہو۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۔ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۔ (النساء)

"پس اس دن ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت کے لیے گواہ لائیں گے، تمہیں اس امت کے مقابلے میں گواہ کے طور پر پیش کریں گے جس دن وہ شخص جس نے تعلیم حق سے انکار کیا ہوگا اور رسول کی نافرمانی کی ہوگی۔ یہ خواہش کرے گا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے"

اور اوپر سے زمین ہموار ہو جائے۔ اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔"

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمایا:۔

اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ۔ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ — وہ تیرے اہل میں سے نہیں۔ وہ تو مجسم بدعملی ہے۔"

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا منقول فرمائی:۔

وَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ الرَّحِیْم (ابراہیم)

"اور جس نے میری پیروی کی وہی میرا ہے اور جو کوئی میری نافرمانی کرتا ہے تو اس کا معاملہ تیرے اختیار میں ہے۔ تو چاہے تو اسے بخش دے کیونکہ تو ہی بڑا بخشنے والا مہربان ہے"

پھر فرمایا:۔

اِنَّ اولی النَّاس بِابراھیم لَلَّذِیْنَ اتبعوہ "ابراہیم کے سب سے قریب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی"

ان آیات سے صاف ظاہر ہوا کہ کسی نبی کی اُمت میں پیدا ہونے سے یا کسی خاص نام سے موسوم ہو جانے سے انسان رشد و ہدایت کے مرتبے پر فائز نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز اتباعِ رسول ہے۔ اسی طرح اُمتِ محمدیہ میں شامل ہونے کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کامل اتباع ضروری ہے اور آپ کا اتباع ہی ہمارے ایمان اور اسلام کی کسوٹی ہے۔ چنانچہ منافقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

اذا جاءک المنافقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ۔ اللہ یعلم انک لرسولہ واللہ یشھد ان المنافقون لکاذبون (المنافقون)

اے پیغمبر! جب منافقین تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں

کہ تم اللہ کے رسول ہو۔ اللہ جانتا ہے۔ تم اس کے رسول ہو اور اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق اپنے اقرار میں جھوٹے ہیں "

گویا محض زبان سے اپنے تئیں مسلمان کہنا کافی نہیں۔ بلکہ آپ کی کامل اطاعت اور اتباع لازمی ہے۔

اب آپ ان مسلمانوں کی حالت پر غور کریں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن انواع واقسام کے شرک اور بدعات میں مبتلا ہیں مثلاً :۔

قبر پرستی، تعزیہ پرستی، آئمہ پرستی، پیر پرستی، حکام پرستی وغیرہ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان باتوں سے باز آجاؤ۔ تو کہتے کہیں کہ۔

"کیا ہم اپنے باپ دادا کے رسم ورواج کو چھوڑ دیں؟"

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (البقرہ)

ترجمہ: "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی تعلیم کی پیروی کرو تو کہتے ہیں نہیں، ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا"

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (الزخرف)

"اور اسی طرح تم سے پہلے ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے سرداروں اور خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر چلتے ہوئے پایا ہے اور ہم تو انہیں کے نقش قدم پر چلیں گے"

پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ (الآیت)

المنافقین یَصُدُّوْنَ عنکَ صدوداً (النساء)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی تعلیم کی طرف اور رسول کی طرف تو، اے پیغمبر! تم دیکھو گے کہ وہ تم سے دور رہیں گے۔"

وَاِذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول قالوا حسبنا ما وجدنا علیہ آباءنا (المائدہ)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اُتاری ہوئی تعلیم اور رسول کی طرف آؤ (یعنی ان کی پیروی کرو) تو کہتے ہیں ہمارے لیے تو ہمارے باپ دادا کا طریقہ ہی کافی ہے ہمیں رسول کی کیا ضرورت۔"

یہی حال ان علماء کا ہے جو تقلید اسلاف کے اس قدر خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ قرآن حکیم کی آیات کی توجیہہ کرلیں گے۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار یا اس کی توجیہہ و تاویل کرلیں گے لیکن اپنے امام اپنے پیر طریقت یا شیخ مذہب کے قول کی تاویل نہیں کریں گے۔ یہی نہیں بلکہ کتاب و سنت کو توڑ مروڑ کر انکی نہایت رکیک تاویلات کر کے انھیں خاص امام یا شیخ طریقت کے قول کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اپنے من گھڑت عقائد کی تائید کے لیے کتاب و سنت کی دور از کار تاویلات سے کبھی باز نہیں آتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (دہلوی) فرماتے ہیں:۔

"اگر خواہی کہ نمونہ یہود دراں امت بہ بینی علماء سوء ما را بہ بیں۔" کانھم ھم۔" (الفوز الکبیر) ترجمہ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہماری امت میں یہود کا نمونہ دیکھو تو ہمارے علماء سو کو دیکھ لو۔ گویا کہ وہ وہی ہیں۔"

یہ لوگ یقیناً شریعت محمدیہ کے دشمنوں میں سے ہیں۔ گو وہ خود اس سے انکار ہی کیوں نہ کریں۔

Marfat.com

اسی طرح بہت سی مسلمان جماعتوں میں کتاب وسنت کے برعکس یہ دستور ہے کہ وہ بیٹی کو ورثہ نہیں دیتے اور بیوہ کی شادی نہیں کرتے اور اسے حق وراثت سے بھی محروم کر دیتے ہیں اور بیاہ شادی اور غم کے مواقع پر بہت سی ہندوانہ رسموں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا یہ فعل کتاب وسنت کے خلاف ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو رواج کے پابند ہیں۔ یقیناً ایسے اشخاص شریعت محمدیہ کے دشمن ہیں اور اسکے منکر ہیں۔ اس لیے وہ دشمنان خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرہ میں شامل ہیں۔ اور إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ کی وعید میں داخل ہیں۔

اسی طرح ان نام نہاد صوفیوں کو لو جنہوں نے شریعت سے الگ ایک ڈھونگ طریقت کا کھڑا کر دیا ہے اور انسان کے لیے حال وقال کی منازل مقرر کر کے فرائض دین سے بالکل سبکدوش ہو جاتے ہیں اور شریعت کی قیود کے متبعین کو علماء ظاہر اور مختلف اہانت آمیز خطابات سے موسوم کرتے ہیں اور اپنے آپ پیر اور اپنے مریدوں پر سے شریعت کی تمام پابندیاں اٹھا کر قبروں پر مراقبے کرتے ہیں اور چلے کھینچتے ہیں اور عرسوں اور میلوں میں بھی لنگوروں کی سی حرکتیں کرتے ہیں اور ہو حق کے نعرے لگا کر لوگوں کو فریب دیتے اور اسے موجب ثواب اور ذریعہ نجات گردانتے ہیں وہ بھی شریعت محمدیہ کے دشمن ہونے کی وجہ سے خدا اور رسول کے دشمنوں میں شامل ہیں۔ اور اپنے متبعین کو تباہی و بربادی کی طرف لے جاتے ہیں ضلوا و اضلوا خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اسی طرح وہ لوگ بھی جنہوں نے مسلم امت کو فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی تکفیر و تضلیل میں سرگرم اور ایک دوسرے سے

برسرپیکار۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ
اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (الانعام)

"جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہو گئے۔ یقیناً تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں" ان کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ پس وہی انہیں ان کی کرتوتوں سے مطلع کرے گا۔"

اس آیت کی زبردست تہدید سے فرقہ باز مولویوں اور تخریب پسند لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ اس میں آپ کو حکم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے کامل بے زاری کا اظہار کریں۔ تو یہ لوگ جو اسلام کو مختلف فرقوں میں منقسم کرکے اپنے اپنے فرقوں کے بقائے دوام کے لیے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتے ہیں۔ وہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں سے ہیں۔ اور اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کی وعید میں شامل ہیں۔

اسی طرح موجودہ زمانے کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ایک کثیر جماعت ایسے اصحاب کی پیدا ہو رہی ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات کو یونانی یا رومی یا جدید مغربی فلسفے کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور قرآنی تعلیمات کو جدید فلسفے کے مطابق کرنے یا اس کے تابع ثابت کرنے کی کوشش میں نہایت رکیک تاویلات سے بھی باز نہیں آتے اور مغربی قوانین اخلاق و سیاست کی برتری تسلیم کرکے یا تو اسلامی قوانین و نصوص کو ناقابل عمل بتلاتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ مؤخر الذکر کو اول الذکر کا مؤید ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس قسم کی اصطلاحات مثلاً:۔

اسلامی سوشلزم، اسلامی ڈیموکریسی وغیرہ سے مسلمانوں کو فریب

Marfat.com

دینا چاہتے ہیں اور انھیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی اسلام ہے۔ مثلاً:

جب سرمایہ دارانہ نظام کا طوطی بول رہا تھا تو یہ متجددین مختلف طریقوں سے سرمایہ دارانہ نظام کے جواز کی دلیلیں قرآن سے لاتے تھے۔

مثلاً: مغربی سرمایہ داری نظام تمام تر سود پر قائم تھا اور ہے تو یہ لوگ سود کے جواز کی مختلف صورتیں پیدا کرنے کی سعی لاحاصل میں مصروف رہے اور آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ کی نہایت لوچ اور رکیک تاویلات گھڑتے رہے۔ یہاں تک کہ جو روایات ان کے مزعومات سے متصادم ہوتی تھیں، ان سے انکار کرتے رہے۔ مثلاً آیت توریث کی [illegible] کیا گیا تاکہ سرمایہ دارانہ نظام قائم رہ سکے۔ اسی طرح مغرب [illegible] کا پابند ہے تو وہ اسلامی قانون تعددِ ازدواج میں نقص نکال کر [illegible] کی کوشش کرتے رہے کہ دراصل اسلام بھی وحدتِ ازدواج ہی کا پابند [illegible] سنتِ رسولؐ اور تعاملِ صحابہؓ و تابعین اور ائمہ دین کے علی الرغم تعددِ ازدواج کو عین فطرتِ انسانی کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے [illegible]

اب چونکہ کمیونزم اور سوشلزم مغرب کے تعلیم یافتہ طبقے [illegible] تو یہ متجددین بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ [illegible] یا سوشلزم کے ساتھ خدا کے عقیدے کو شامل کر لینے کا نام [illegible] سرمایہ دارانہ نظام میں طلاق [illegible] لایعنی پابندیاں ہیں۔ ترکوں نے [illegible] عائد کر دیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کی [illegible] کی [illegible]۔ غرض ان لوگوں [illegible] اس کے رسول کی تعلیم کے [illegible]

رسول کے دشمنوں کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

اسی طرح وہ اسلامی جماعتیں، جو نام تو اسلامی رکھ لیتی ہیں، مگر ان کے جلسوں میں اسلامی شعائر کی علانیہ مخالفت ہوتی ہے اور ان کی پارٹیوں میں شراب خوری اور حسن فروشی کی داد دی جاتی ہے۔ نماز اور دیگر واجبات کی پابندی کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ اور ان کے ترک کو داخل فیشن اور معیار تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ چندہ جمع کرنے کے لیے ان کے ہاں رقص و سرود کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں، کلبوں میں علانیہ قمار بازی کی جاتی ہے۔ یقیناً ایسی جماعتیں خدا اور رسول کی دشمن ہیں۔ اور اس وعید کی مستحق ہیں جو ان دشمنان دین کے لیے مقرر ہے۔

اسی طرح وہ تمام کلب یا سوسائٹیاں جن میں تفریح کے طور پر جوا کھیلا جاتا ہے اور شراب پی جاتی ہے اور مخلوط سوسائٹی کی ترویج و تشویق ان کا دل پسند مشغلہ ہے۔ جہاں عورتیں نیم عریاں لباس میں ہر قسم کے بناؤ سنگھار سے آراستہ ہو کر محفل کی رونق بڑھاتی اور مردوں کا دل لبھاتی ہیں اس وعید میں داخل ہیں اور یقیناً بنی نوع انسان کو تباہی کے گڑھے میں گرانے والی ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس وہ جماعتیں یا لوگ جو قوالیوں کو عبادت سمجھتے ہیں اور ان میں بندروں کی طرح ناچتے کودتے اور اچھلتے ہیں اور اسے وجد و حال سے تعبیر کرتے ہیں سب کے سب خدا اور رسول کے دشمن ہیں اور اس وعید میں شامل ہیں۔

اسی طرح جدید الخیال لوگوں کا وہ فرقہ یا جماعت جو حدیث کی منکر ہے اور قرآن کو صرف قرآن سے سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حدیث سے اس درجہ گریز کرتے ہیں کہ اقبال اور رومی کے اشعار کو حجت تسلیم کر لیتے ہیں مگر حدیث صحیح کو حجت تسلیم نہیں کرتے بلکہ دیدہ و دانستہ صحیح احادیث سے اعراض کرتے اور ان کی

Marfat.com

ہنسی اُڑاتے ہیں، یقیناً نصوصِ صریحہ کے منکر اور خدا اور رسول کے معاندین میں سے ہیں۔ ان کے اعمال مردود اور ان کی مساعی نامقبول اور غیر مشکور ہیں۔

اسی طرح وہ جماعت جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہم میں جو شخص چاہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (نعوذ باللہ) بڑھ سکتا ہے اور نبی کے مرتبے پر فائز ہو سکتا ہے۔ اسی وعید میں داخل ہے اور یقیناً تباہ و برباد ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ دشمنانِ عقل و دانش بھی نصوصِ قطعیہ کے منکر ہیں اور موہبت اور اکتساب میں فرق نہیں کرتے۔ نبوت وہبی (یعنی خاص عطیۂ خداوندی) ہے اکتسابی نہیں کہ ہر شخص جب چاہے نبی کے اتباع سے ریاضت و مراقبے سے حامل وحی اور نبی بن جائے یا اس سے بھی بڑھ جائے۔ قرآن حکیم میں کفار کی اس خواہش کا ذکر ہے۔ پھر اس کی تردید بھی فرمائی کہ ایسا ناممکن ہے کہ ہر شخص پر وحی نازل ہو جائے۔ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً كَلَّا

ترجمہ: بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے اوراق دیئے جائیں یعنی اس پر وحی نازل ہو جائے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

یہ جماعت یقیناً خدا اور رسول کی دشمن ہے اور اسی وعید کی مستحق ہے۔

غرض مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کی کمزوریاں کہاں تک بیان کی جائیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن میرے سامنے ایسے لوگ پیش کیے جائیں گے جن کی شکل و شباہت بالکل مسلمانوں کی سی ہوگی اور آپ انہیں دیکھ کر بارگاہ ربّ العزت میں عرض کریں گے "یا رب! امّتی امّتی" تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا "نہیں، یہ تیری امت میں سے نہیں ہیں۔ کیونکہ تجھے معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے تمہارے پیچھے کیسی کیسی بدعات اور خرافات ایجاد کیں اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے:

Marfat.com

اِنَّ اُناساً من اصحابی یُوخذ بِھِمْ ذات الشِّمال فاقُولُ اَصْحابی اِ اصحابی اِفَیقُول اِنَّھُمْ لَنْ یَزالُو مُرتَدِّیْنَ علٰے اَعْقَابِھِمْ قَدْ فَارَقْھُمْ فَاَقُولُ مَاقَالَ العَبْدُ الصَّالِح۔

وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِی کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ.... الاٰیۃ۔

"تحقیق بعض لوگ میرے متبعین میں سے بائیں طرف (یعنی دوزخ کی جانب) دھکیلے جائیں گے۔ پس میں اللہ کی جناب میں عرض کروں گا کہ یہ میرے آدمی ہیں۔ یہ میرے آدمی ہیں۔"

اللہ تعالےٰ فرمائے گا کہ "نہیں۔ تمہارے بعد یہ لوگ اپنے دین سے پھر گئے اور اسی ارتداد پر قائم رہے۔ پس میں اس وقت وہی عرض کروں گا جو اللہ کے ایک نیک بندے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا۔

"اور میں تو ان کے اعمال سے صرف اس وقت تک واقف تھا۔ جب تک ان میں تھا۔ جب تونے مجھے اٹھالیا تو تُو ان کے اعمال کا نگران تھا۔..... آلایۃ

قرآن حکیم میں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ آپ بارگاہ رب العزت میں عرض کریں گے

یَارَبِّ اِنَّ قَومِی اتَّخَذُوا ھٰذَا القرآن مھجوراً (الفرقان)

اے میرے پروردگار! میری اس قوم نے اس قرآن کو بالکل پیچھے ڈال دیا"

ایک اور حدیث شریف میں ارشاد ہوتا ہے:۔

لَیَرِدَنَّ عَلَیَّ اَقْوَامٌ اَعْرِفُھُمْ وَیَعْرِفُوْنَنِی ثُمَّ یُحَالُ بَینِی وَ بَینَھُمْ واقول اِنَّھُمْ مِنِّی فَیقال اِنَّکَ مَا تَدْرِیْ مَا اَحَدَثُوا بعد ذَالِکَ فَاَقُولُ سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَیَّرَ بَعْدِی۔ متفق علیہ

"میرے سامنے ایسی جماعتیں آئیں گی جنھیں میں پہچانتا ہوں گا اور جو مجھے پہچانتے

ہوں گے۔ پھر میرے اور ان کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا۔ میں عرض کروں گا۔ اے اللہ! یہ لوگ تو میری جماعت سے ہیں جواب ملے گا کہ تمہیں کیا معلوم ان لوگوں نے تمہارے بعد تمہارے دین میں کیا کیا بدعتیں ایجاد کیں! میں عرض کروں گا "تباہی ہے تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جس نے میرے بعد دین میں تبدیلیاں کیں۔"

ان آیات و احادیث پر غور کرنے سے مسلمانوں کی حالت آئینے کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا صرف زبان سے یہ کہنا کہ "ہم مسلمان ہیں" اور اسلام کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں" انہیں محشر میں ان سے نجات نہیں دلا سکتا۔ ہم باوجود اپنے بلند بانگ دعاوی کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں اور اس دشمنی کے بادافش سے نہیں بچ سکتے۔ انا للہ وانا الیہ [illegible]

اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ کہیں ان کا شمار بھی ان فرقوں میں تو نہیں ہے جن کا ذکر اوپر تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اسلام منافقت اور مداہنت اور نیم دلی کو پسند نہیں کرتا [illegible] ارشاد یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان "اے ایمان والو تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو۔"

اسلام کو فقط ایک مخصوص سسٹم یا نظام زندگی کے قبول کرنے کا نام [illegible] ہے۔ اسکے ایک حصہ کا اقرار اور دوسرے کا انکار

ایں سو راندہ وآں سو درماندہ

کا مصداق ہے۔

اس لیے اس کے بعد مسلمانوں کو اپنے تنزل اور انحطاط کے اسباب کی تلاش

میں سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہماری تباہی کی اصل وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت ہے ہم لوگ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کی عملی تکذیب کر رہے ہیں اور آپ کی تعلیم کے سب سے بڑے مخالف و معاند ہیں۔ اور اب بھی مسلمانوں کی نجات اور تمام بنی نوعِ انسان کی نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت و اتباع اور محبت ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

کتاب و سنت سے تمسک ہی وہ مضبوط رسی ہے جو ٹوٹ نہیں سکتی اور جسے پکڑے بغیر بنی نوعِ انسان کا یقینی تباہی سے چھٹکارا ناممکن ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ختم شد

Marfat.com

اِرشادِ نبوی
صلی اللہ علیہ وسلم

بُرائیوں کے خِلاف جہاد
ایمان کا لازمی تقاضہ ہے

تم میں سے جس شخص نے اپنے معاشرے میں کوئی بُرائی
دیکھی اور اسے ہاتھ (یعنی طاقت) سے مٹا دیا، وہ اپنے
فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ اور جس نے طاقت نہ رکھنے کی
وجہ سے زبان سے اس برائی کے خلاف آواز اٹھائی
وہ بھی سبکدوش ہُوا۔ اور جو شخص زبان سے بھی
احتجاج نہ کر سکا لیکن کم از کم دل میں
اس برائی سے نفرت کرتا رہا تو وہ بھی
بَری ہُوا۔ لیکن یہ ایمان کا
کمزور ترین درجہ ہے

(ترغیب وترھیب بحوالہ نسائی)

Marfat.com

قابلِ قدر دینی مطبوعات

فتویٰ آمین بالجہر	احکام داڑھی
رفع الیدین	حقیقۃ الفقہ کامل
مناظرہ آٹھ تراویح	مسائلِ زکوٰۃ
فاتحہ خلف الامام	حقوقِ والدین
گلشنِ رحمانی (منظوم)	معراجِ نبوی
مسنون حج وعمرہ	احکامِ شب برات
الحزب المقبول (دعائیں وظائف)	خرابیِ سینما
رکوع کی رکعت	درسِ توحید
رسالہ بے نماز	تحریکِ وہابیت
میلاد النبی ﷺ	خالص توحید

مفصل فہرستِ کتب مفت منگوائیے

ناشران

مکتبہ ایوبیہ، حدیث محل کراچی ۲۰۰…۳۴

Marfat.com

گلشنِ اقبال میں گلشنِ محمدی

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یونیورسٹی روڈ کراچی میں پندرہ ہزار مربع میٹر کے عظیم پلاٹ پر علوم اسلامیہ کی درسگاہ الجامعۃ الستاریۃ الاسلامیۃ کا تعمیری کام جاری ہے۔ طلبہ کی رہائش کے لیے سولہ کمروں پر مشتمل ایک بلڈنگ جدید ضروریات سے آراستہ مکمل ہو کر زیر استعمال ہے۔ تقریباً دس ہزار مربع فٹ پر دار التدریس (کلیات الجامعۃ) میں پندرہ کمرے اور ایک بڑا لائبریری ہال (المکتبۃ الرحمانیۃ) بفضلہ تیار ہو چکے ہیں ۱۰۰ ، ۲۰۰ طلباء ان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

عظیم الشان مرکزی جامع مسجد امام ابن تیمیہ جس میں اندرونی دالان اور وسیع و عریض صحن مکمل ہو گیا ہے۔ تقریباً ایک سو فٹ طویل مینار کی تعمیر کا کام شروع ہے۔

جامع مسجد کا تعمیری رقبہ تقریباً ایک ایکڑ ہے۔ اس عظیم منصوبے کا سنگ بنیاد فضیلۃ الشیخ محمد بن عبد اللہ بن سبیل امام وخطیب بیت اللہ شریف نے نصب کیا تھا۔

طلباء کی رہائش کے لیے مزید ۲۴ کمرے، فری ڈسپنسری، مدرسۃ البنات کی تعمیر بہت جلد شروع کی جا رہی ہے۔ ان شاء اللہ اس عظیم منصوبے کی تکمیل و ترقی کے لیے انفرادی اور اجتماعی کوشش کی سخت ضرورت ہے۔ آپ خود اس کار خیر میں حصہ لیں اور اپنے دوست احباب کو بھی توجہ دلائیں۔ یہ وہ کام ہے جس کا ثواب آپ کے دنیا سے جانے کے بعد بھی آپ کو ملتا رہے گا۔ اس سلسلے میں نقد رقم، سیمنٹ، لوہا، بجری، لکڑی وغیرہ جو بھی آپ مہیا کر سکیں ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ترسیلِ زر کا پتہ:۔ مولانا حافظ عبد الرحمن سلفی محمدی مسجد، شارع محمد بن قاسم کراچی ۲۰۰ ۔۔ فون ۲۱۲۰۹۸۰ - ۲۱۲۰۱۲ - ۲۲۶۹۰۰۰

ففروا الی اللہ
تو تم اللہ کی طرف بھاگ چلو

ان الحکم الا للہ
حکم کسی کا نہیں مگر اللہ کا

ھردم اللہ

- کوئی کام شروع کریں تو کہیں — بسم اللہ
- کلمہ پڑھیں تو کہیں — لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
- گواہی دیں تو کہیں — اشھد ان لا الٰہ الا اللہ
- وعدہ کریں تو کہیں — ان شاء اللہ
- کوئی احسان کرے تو کہیں — جزاک اللہ
- گناہ کا سامان دیکھیں تو کہیں — استغفر اللہ
- سلام کا جواب دیں تو کہیں — وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ
- اچھائی اور حسن دیکھیں تو کہیں — ماشاء اللہ
- کوئی ڈر ہو تو کہیں — حسبی اللہ
- چھینک آئے تو کہیں — الحمد للہ
- جواب میں کہیں — یرحمک اللہ
- شیطان سے بچنے کے لیے کہیں — اعوذ باللہ
- اچھی بات سنیں تو کہیں — سبحان اللہ
- خیریت پوچھنے پر کہیں — الحمد للہ
- دعا کرنے پر کہیں — بارک اللہ
- جھوٹے پر کہیں — لعنۃ اللہ
- متاعِ اہلِ نظر — لا الٰہ الا اللہ

Marfat.com

اسلامی حکومت!

دراصل اسلامی حکومت وہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "الٰہ" اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی "مُطاع" نہ مانا جاتا ہو۔ جس میں اسلامی قانون نافذ ہوتا ہو۔ جس میں لوگوں کے تمام کام قرآن وحدیث کے مطابق سرانجام پاتے ہوں۔

کرم

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے

کتابِ ہٰذا کے مُصنّف رحمۃ اللہ کی مساعی
کو، کتابِ ہٰذا کے شائع کرنے والوں کی
کوششوں کو، مصنف مرحوم کی اولاد وبنات
کے اعمالِ صالحہ کو، کتاب ہٰذا کی
طباعت وتصحیح وغیرہ
کا اِنتظام کرنے والے اِدارے کی
محنت کو۔

آمین یارب العٰلمین

یہ کتاب
بغرضِ اشاعت تفسیرِ کلام اللہ مُفت دی جارہی ہے

★

Marfat.com

قرآنی دعوت انقلاب

مؤلف

مولینا محمد علی۔ ایم۔ اے (کینٹب)

Marfat.com